

101
1426
کتابخانه
8 FEB 1939
13 MAY 1940
22 MAY 1940

891.43905-Rare

Call No. ~~16453~~ Acc. No. 34062

ADAR

الطيف ادبي



یدہری برکت علی مرحوم

اے ہم نفساں منزل ما
رفیقہ دے نہ از دل ما

مرکتبہ اردو لاہور

ارشاد



دھری برکت علی مرحوم

اے ہم نقیانِ محسن
رفیقِ دے نہ از دل ما

مرکتبہ اردو لاہور

مرحوم چودھری برکت علی

چند واقعات

پیدائش ۱۹۰۲

تعلیم اسلامیہ ہائی سکول، ہائی گیت، لاہور
گوپرنمنٹ کالج، لاہور

اس زمانے میں فٹ بال کے کھلاڑی کی حیثیت سے خاص
شہرت حاصل کی۔

ایم اے (تاریخ) کے امتحان میں شریک ہونے کی تیار
کر رہے تھے کہ تحریک عدم تعاون کی وجہ سے تعلیمی
سلسلہ منقطع کر دیا

۱۹۲۹ء میں پنجاب بکڈپو کی بنیاد ڈالی اور بہایت
کامیاب درسی کتابیں شائع کیں۔

۱۹۳۵ء میں ماہنامہ ادب لطیف کا اجراء

۱۹۳۶ء میں مکبہ اردو کا قیام

انہی دنوں انجمن احرار اسلام سے وابستہ ہو گئے اور
دی دی ہدیسی سرمایہ داروں کا حم ٹھونک کر مقابلاً کیا۔
ادب لطیف پر کئی بار مقدمہ چلا۔ ہر بار بخندہ پیشانی
ضمانت دی۔

کچھ سال پیشتر تین ہائی سکولوں کا تمام نظم و نسق سنبھالا
پبلشر یونائیٹڈ کی بنیاد انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

وفات - ۸ اگست ۱۹۵۲ء شام کے سوا آٹھ بجے

Accession number

34062

Date 17.4.76

8402

احد لطیف لاہور

ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۶ء

جلد ۳۴ ————— شماره ۶۱۵

ایڈیٹر

بینگ ایڈیٹر

چودھری افتخار علی ○ میرزا احیاء

پاکستان میں

زور سالانہ :- آٹھ روپے ————— موجودہ شماره :- ایک روپیہ

غیر ممالک میں زور سالانہ :- بارہ روپے

مستقل خسریہ ادوں سے سالانہ
اور افسانہ نمبر کی الگ قیمت نہیں لی جاتی

مکتبہ انکشاف ○ لاہور

تہذیب

Rare
891.43905
165.73
A722

نظم	پیرایہ آغاز	ایڈیٹر	م
	کہ نیم ہلال کہ غم و دواں	قتیل شطانی	۷
	نہ خالی کائنات سے	خور علیگ	۸
	تین بیٹی نظیں	ابینا شاہ	۹
	جان محفل	جلیل کریم	۱۱
	اے مری جان وفا	قمر اجالوی	۱۲
	سرخ گسترانہ	احمد ظفر	۱۳
	جسازہ	خزائن ہوشیار پوری	۱۵
رباعیات			

مقالہ	احمد فراز	۱۶
	پروپی میرو غالب کا قضیہ	۱۷
	ادب کی دوا می تدبیریں	۲۸
یاد اختر شیرانی		
	چناروں کی پھاؤں میں	۳۶
	غزل	۳۷
افسانہ		

میرے دو دوست	۳۸
چود	۴۱
نیل، پیارے نیل،	۴۹
اک نگارِ آتشیں رخ	۶۵
ڈراما	
لہو اور قالین	۷۲
میرزا ادیب	۷۳

غزل

۸۲	حفیظ ہوشیار پوری
۸۳	آغا صادق
۸۴	عارف عبد المتین
۸۵	عبد المجید بھٹی
۸۶	سید فیضی جالندھری
۸۷	سلیم واحد سلیم
۸۸	جمیل ملک

خوش و خوشید و شعلہ مستعمل بود

چودھری مرحوم کی یاد میں

۸۹	حفیظ ہوشیار پوری	قطعہ تاریخ
۹۱	احمد زیم قاسمی	ایک ادب دوست ناشر
۹۲	فکر تونسوی	آخری ملاقات
۹۷	محمد جالندھری	میرادوست، میرا رفیق
۹۹	سلام بھٹی شہری	ایک با خلوص انسان
۱۰۳	منیر سراج رہبر	چودھری برکت علی
۱۰۵	ابن انشاء	ترقی پسند پیشتر
۱۰۶	ہندو نائقہ	چودھری مرحوم
	برغیم کے مختلف گوشوں سے	تذریقی پیغامات
۱۰۷	ادیبوں کا شعلہ و شعلہ ساکن	
	وجہ اند کے پیغامات	

پیرایہ آغاز

ہر اگست کو شام کے قریباً آٹھ بجے میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس پر اب تک یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔
 یہی وہ وقت تھا جب میں نے ایک بھر پور اور طویل قہقہے کو فضاؤں میں بکھر بکھر کر گم ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس
 میں نے زندگی کے ایک ہم گیر دوسلے کو موت کے سلسلے میں دم تھڑکنے پہلے پایا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے ایک عیاں
 ظہر پہ تائب کو اندھیرے کے دامن میں سسک سسک کر ختم ہوتے ہوئے دیکھا۔
 میں نے چودھری برکت علی کو ہمیشہ ایک فطرتاً ہی ایک امگ اور ایک دوسلے کی صورت میں دیکھا تھا۔ اور کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا
 تھا کہ زندگی سے اتنی شدید محبت رکھنے والا، ہمہ حرکت، ہمہ جذبہ انسان کبھی زندگی سے منہ بھی موڑ سکتا ہے۔ کبھی نے جس طرح حرکت بھی کر سکتا ہے
 — مگر ایسا ہو کر مل — اور میں نے یہ الم ناک منظر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا۔
 زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات بھی ہوتا جاتے ہیں جنہیں ہم اپنے سلسلے دیکھتے ہیں لیکن ان پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ چودھری
 برکت علی کا انتقال بھی ایک ایسا ہی ناقابل یقین واقعہ ہے۔

آج سے قریباً ساڑھے چار ماہ پیشتر میں حسب معمول دفتر میں پہنچا تو معلوم ہوا چودھری صاحب کی طبیعت رات سے کچھ خراب ہے، شاید
 دکان پر نہ آسکیں۔ بالکل معمولی بات تھی۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ چودھری صاحب دو تین روز تک دکان پر نہیں آتے تھے اور جیسے
 ہی طبیعت ذرا سنبھلتی تھی آمدورفت شروع ہو جاتی تھی۔ معمولی بخار کو تودہ خاطر میں لاتے ہی نہیں تھے۔ کہا کرتے تھے مجھے خدا نے اس لئے
 پیدا نہیں کیا کہ بیماری کے نخرے دیکھتا رہوں۔ تو اس روز بھی مجھے اہم میرے ساتھیوں کو اس بات کا پورا پورا یقین تھا کہ چودھری صاحب کی
 طبیعت کچھ نیا وہ خراب ہو گئی ہے جو وہ آج آنے سے قاصر ہیں۔ خیر دو تین روز تک آجائیں گے۔
 دو تین روز گزر گئے اور چودھری صاحب کی شکل نظر نہ آئی۔ مگر پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ دنیا میں کون شخص بیمار نہیں ہوتا اور چند روز
 تک اپنے فرائض ادا کرنے سے معذور نہیں رہتا!

چاہے پانچ روز اور گزر گئے اور چودھری صاحب ہم میں موجود نہیں تھے۔
 مجھے اشاعتی پروگرام کے متعلق ان سے کچھ استفسار کرنا تھا اس لئے گھر پہنچا۔ پچھلے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے گفتگو کے دوران
 میں پتہ لگا کہ پہلا روزہ انظار کرنے کے بعد ہیٹ میں دو ہوا تھا اور اب بخار بھی آ رہا ہے۔
 میں لوٹ آیا اس تفریح کے ساتھ کہ باقی گفتگو اس وقت کہ دل کا جب وہ کچھ دھن کے بعد دفتر تشریف لے آئیں گے۔
 دن گزرتے رہے اور ہم ہر روز ان کا انتظار کرتے رہے۔

پھر میں ایک روز پہنچا تو دیکھا کہ کافی نڈھال اور کمزور ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کی آنکھوں کی چمک اور گفتگو کے "تمتہ پر مدائنا" میں قلعہ گئی

کون سا تھیں ہوتی تھی۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے وہ باتیں کر کے نہ جنتے رہے۔
چند روز کے بعد شہر کے لڑکے انہیں ملاقاتیوں سے زیادہ گفتگو کرنے سے روک دیا ہے۔ یہ پلا رتی تھا کہ مجھ کو خوش ہوتی
انہیں ہنس ہنس کر ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ہسپتال میں جب میں نے انہیں دیکھا تو میرے سامنے چودھری برکت علی کے قریب تھا اور وہ
مجھ کی بجائے ایک نہایت کمزور اور اندوز رنگ انسانی پیکر پڑا تھا۔ وہ صرف دو تین باتیں کر سکے۔ حرارت کی شدت سے اس کا جسم
پھٹا جاتا تھا۔

بلیرا کر ہی سننے آسکتا ہے کہا ”دیکھا چودھری صاحب کو؟“

مختار دھر بھلائے نہ جاسکے کیا سمجھا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر بڑبڑا کر کہا ”چودھری صاحب کے کھد باگیا ہوگا؟“
یہ الفاظ سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سانپ ایک بوجھ سا آگرا ہے۔ جیسے کسی سپنے میں کوئی حد سے آتی ہوئی آواز سن رہا ہوں۔
میں نے اسے غراب ہی سمجھا تھا کیونکہ میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ بات نہیں مان سکتا تھا کہ زندگی کی یہ تب و تاب جس کا دوسرا نام چودھری
برکت علی بھی ہے کسی وقت موت کے سامنے ہتھیار بھی ڈال سکتی ہے کسی وقت وہ شمع خاموش ہو جی ہو سکتی ہے جس کی تپیلوں کے سیلاب سے
زندگی کے در و دیوار روشن ہیں۔ کسی وقت وہ نیربھیات ختم بھی ہو سکتا ہے جیسے مٹی کو زندگی سے بے حرمت ہو جاتی ہے۔
زندگی گزرتی جا رہی تھی اور وہ مخموس گھڑی ٹپکتی ہوئی میرے ہسپتال کے اس کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں ایک کمزور و نحیف و ناتواں جسم موت
سے آخری کشمکش میں مصروف تھا۔

چودھری برکت علی کی توانائی کا آخری اثاثہ بھی ختم ہو رہا تھا مگر اس کی جدوجہد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی موت سے شکست تسلیم
کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اسے زندگی سے بے پناہ محبت تھی اسے اپنے اصولوں سے بے پناہ محبت تھی۔ موت چودھری طرح اس کے
گرد اپنے بازو پھیلا چکی تھی تاہم وہ کوشش کر رہا تھا کہ ان بازوؤں سے اپنے آپ کو چھڑائے، موت کو پیچھے دھکیل دے مگر پھیلے ہوئے
بازو پیچھے نہ ہٹ سکے۔ موت اگر کبھی ناکام واپس بھی گئی ہے؟

میں نے کئی سال تک مسلسل چودھری مرحوم کے ساتھ کام کیا ہے میں نے انہیں ہمیشہ ایک ہمدرد، صاف گو اور صاف دل انسان پایا ہے
ان کے ہونٹوں پر وہی کچھ مہرنا تھا جو ان کے دل میں ہوتا تھا۔ سخت سے سخت اور کڑوی سے کڑوی بات بھی وہ ہونٹوں پر لے آتے تھے۔ کوئی
پہنچل میں چھپاتے نہیں تھے۔ منافقت سے انہیں دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ اہل قلم کا ان کے دل میں بڑا احترام تھا اور میں جانتا ہوں کہ بعض
ادیبوں کی شکستہ سی میں انہوں نے کس طرح مالی مدد کی اور پھر ان کے احترام کو بھی برقرار رکھا۔ مجھے ان کے اس رویے نے بے حد متاثر
کیا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی اپنے کسی ساتھی کی تہنیتی کا حال بتایا ہو اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح اس کا ساتھ دیا ہو میری
گزارش پر انہوں نے کئی ایسے مسودات خرید لئے تھے جو مکمل تھے اور ناکمل ہی رہیں گے۔ مگر یہ خریدنے سے محض اس لئے لگے تھے کہ ان
مسودات کے لکھنے والوں کی مکتبہ آبرو سے کچھ ترقات وابستہ تھیں اور ان ترقات کو پورا کرنا چودھری مرحوم نے اپنا فرض سمجھا تھا۔

خیالات کے لحاظ سے چودھری صاحب ترقی پسند تھے۔ ان رجحانات کے ہمراہ تھے جو انسانیت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ادب
کی ترقی پسند تحریک سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ انہیں ترقی پسند مصنفین کا دوسرا سالانہ اجلاس کراچی میں ہونے والا تھا اس زمانے
میں مرحوم کی حالت بڑی نازک تھی۔ نفاہٹ اس درجہ بڑھ چکی تھی کہ گفتگو بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے مرحوم کے صاحبزادے کے

ہدست ان کی طرف ایک قدم بڑھا جس میں عرف یہ افلاک کھٹے تھے۔۔۔ ترقی پسند مغربیوں کا ادب اس کی طرف سے
کاش آپ طویل دھڑکتے ہوئے کچھ کر سکتے تھے۔ اس کے جواب میں انہوں نے دوسرے دن مجھے بلا لیا۔ دیکھا کہ
نہاں میں اپنے بیان کے بارے میں چنداں شامات کئے اور ہانگی ہوئی رقم انجن کے لئے پیش کر دی۔
اس قسم کے کئی واقعات گندہ چکے ہیں، صاحب انہوں نے مجھے بگڑ کر کہا کہ غلام ادیب آج کل بیکار ہے، اس سے کچھ اور علم کچھ
ہم اس کے لئے کس حد تک تعاون کر سکتے ہیں؟ اور واقعی انہوں نے بیشتر ادب جمل سے پرستے غلام کے ساتھ تعاون کیا۔
آج چودھری صاحب زندہ نہیں ہیں مگر ان کی سالہا سال کی جدوجہد کا حاصل ہمارے سامنے موجود ہے۔ سید میری یاد میں ہے کہ
کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ مرحوم کے کارنامے زندہ رہیں۔ اور میں امید ہے کہ اپنے ہمدردوں کی مدد سے ہم انہیں پیش قدمی دیں گے۔

میدان ادیب



پچھلے دنوں ایک اور اہم خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔ یہ خبر اردو کی مشہور مناد افانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں کے انتقال کے بارے میں
تھی۔۔۔
ڈاکٹر صاحب کا ادب کی ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ پہلی خاتون تھیں جس نے سادہ کے شرمناک واقعات کے
جیسا کہ اظہار میں جرأت پسند کا ثبوت دیا تھا۔ حرمہ ایک طرف اعلیٰ درجے کی افانہ نگار تھیں تو دوسری طرف ایک حارہ و اود قابل ڈاکٹر بھی تھیں۔
ان کا انتقال اردو ادب کے لئے ایک دردناک حادثہ ہے۔



ادب لطیف کا موجودہ شمارہ ستمبر اور اکتوبر کا مشترکہ نمبر ہے۔ آئندہ ہر چوبیس روزہ سابق باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہے گا۔ توقع ہے،
اگلے شمارے میں ہم سالانہ کی تاریخ اشاعت کا اعلان بھی کر سکیں گے۔



منظمن پنجاب بک ڈپو مکتبہ اردو، ادب لطیف، ان تمام ہمدردوں کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں جن کے
مضامین یا تعزیتی بیانات ادب لطیف میں شائع ہو رہے ہیں یا دفتر میں پہنچے ہیں اور عدم گنجائش کی وجہ سے
ادب لطیف کے موجودہ نمبر میں شائع نہیں ہو سکے۔ ہم اپنے ہی خواہموں کو یقین دلاتے ہیں کہ انہوں نے
جو توقعات ہم سے وابستہ کی ہیں، انہیں حتی الامکان پورا کریں گے!

کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں

غدہ چہرے پر کھرتی ہوئی سوکھی سرسوں
روپ سے رنگ جلا، رنگتے خوشبو سے تھی
ایک پتیل کی ٹڈلی جس میں نہیں کوئی گداز
پھر بھی بیٹھی ہے بازار میں کیسریں کر
جل رہی ہے گر اک طبع معطر ہے
یکسہ ہی ہے نہ ناباب کی ہسرتیں کر

اُٹ یہ مچلا ٹوا موسم، یہ بسنتی پسیر
ہائے یہ جسم کی منزل کہ جہاں سبتا کر
جن میں چلتے رہے مٹا کی شبکے سودے
جس کے جادو سے کئی پرو جواں گزرے ہیں
قلعے عرص کے بے نام و نشان گزرے ہیں
آج پھر دل پہ وہ لمحات گراں گزرے ہیں

جب مکتب ہے کوئی سرود ہوا کا جھونکا
یوں قصہ پہ برستی ہیں پرانی یادیں،
دیر تک دل کے سلگنے کا گماں ہوتا ہے
جیسے برسات میں ریم مجھ کا سماں ہوتا ہے

دُور اس شہر کے گوشے سے بہت دور کہیں
جس کے جلووں میں جھلکی ہوئی دھندلی حثیت
دیکھ کہ جس کو گل اندام جوانی کی حبیب
آرزوؤں کے گلستاں میں ہمارا آئی تھی
اپنے چہرے کو فریبوں سے نکھارا آئی تھی
یک بیک جائزہ تقدیس اتارا آئی تھی

طاہر حسن میں جذبات کے ندس رخسے
مرکز شوق کی حسرتوں میں پریشاں گیسو
دھم دھم پیادے کے گلزار بھی ہلکے، لیکن
دست گلچیں کی مروت سے چلتے ہی رہے
بوسے آوارہ کی مانند جھلکتے ہی رہے
دل میں کانٹے غم دوراں کے کھٹکتے ہی رہے

خلاق کائنات سے

مسموں کے کفن رات کے پڑھول اندھیرے
فصلیں بھی دھواں صابرین خرمین بھی دھواں صابر
طوفان کے تراشیدہ کناروں پہ سینے
زخموں کے بھی نیلام، سناٹوں کے بھی بانار
طوفان ہی طوفان سفینوں سے ہم آغوش
اٹھتے ہوئے ہوج پہ یہ محسوس پورنگا ہیں
مرحم کی بھی توہین ہے، زخموں کی بھی توہین
چھایا ہے اندھیرا ترا سودج ہے جہاں تک
سونے کے درخشندہ جنازے ہیں سلاطین
ماحقوں سے ٹپکتی ہے خمیروں کی سیاہی
شبنم کی خاک لڑے بھی جل جلتے ہیں گلشن
کروں سے بھی آتی ہے اجالوں پہ تباہی
بے طوق و سلاسل بھی سہم انسان گرفتار
اے وہ کہ چمکتا ہے تیرے حکم سے خورشید
شعلوں میں بھی انگارے شبنم میں بھی انگار
اٹھتے ہوئے طوفان سے کہہ دے کہ ٹھہر جائے!
وہقان کے جلتے ہوئے انکوں کو بچھا دے

یہ کرب میں ڈوبے ہوئے شہروں کے سویرے
بھتی ہوئی دوکانیں، شلگتے ہوئے بازار
ٹھٹھتے ہوئے لب زہرا ٹھٹھتے ہوئے سینے
چمکیز ہی چمکیز، قیامشس و کلہ دار
کعبہ بھی سیاہ پوش، کلیسا بھی سیاہ پوش
سجدوں کی یہ ذلت یہ طسبیفوں کی کراہیں
یہ بند و سلاسل میں مناجات کی تسکین
یہ کلفت احساں شبنم سے فغاں تک
ہوج اسیری توہین یکساں عجم و چین
ہیروں سے چمکتی نہیں میری "موکہ کرشاہی"
دیتے ہیں دھواں لالہ و گل سے بھی نشیمن
اے انجم و مہتاب کے بھٹکے ہوئے راہی
آدم ہو جہاں فکر و فطنت کا بھی گنہگار
اے خالق مہر و مستر و انجم و ناہید
غم بھی مرا محسوس، مرا صبر بھی لاچار
مسموں پہ ہواؤں سے قیامت نہ گزر جائے
خرم سے ہجوم شر و برق شاو سے

کھیتی بھی کہیں خوشہ گندم سے جلی سے
کیا تو مطلق ترا انصاف یہی ہے؟

تین چینی نظمیں

۱۔ جگنو ہے!

بارش میں ترایہ دیپ جلے
کبھی ٹھکڑے سکے
جھکڑو چلے
تری جوت دبے نہیں اور بڑھے

او جگنو جا!
اور نیلے گلن کو جا کے بنا تو اپنا وطن
او جگنو جا!
اور چاند کے پاس پہنچ کے چمکتا تارا بن

لی پو (۶۲ - ۶۵-۶۷)

۲۔ جوانی

دریا کے کنارے
گھاس اُگی ہے ————— ہری ہری
اور باغ کے اندر
بید کبھی بڑھیں ————— گھنے گھنے
اک ناری اُدھر

جب کہ نشے میں مست لگی
ینار کی کھڑکی میں ہے کھڑی — غمگیں غمگیں
دیکھو تو سہی

گدرا یا ہوا ذرا اس کا ہنسی — گدرا گدرا
فازے سے ہے بس کا چہرہ عجب — غلوں غلوں
ادھماکہ تو دیکھو

زرد زرد — کوئل کوئل

یہ رقصہ تھی ناچ کیا کرتی تھی کبھی
اب بڑی ہے اک آوارہ سیلانی کی
اور سیلانی کہیں چلا گیا ہے — جانے کہاں
یہ چڑا پلنگ اور تنہائی — جی مانے کہاں

(حی شینگ۔ ... اتم)

۳۔ تنہائی

شام کا وقت ہے — دیکھو تو سنہرا سورج
گھاؤں کی گلیوں پہ کس طرح چمکتا ہے ابھی

میری تنہائی کا عالم — مرے غمناک خیال
اور یہ ویران سڑک — جس پہ مسافر بھی نہیں
صرف پت جھڑکی ہوائے غمگیں
کیتوں میں سے مری سمت بڑھی آتی ہے

(نام معلوم)

جان محفل

جان محفل! ترے ہلکے ہوئے ہونٹوں کا فروغ
 رنگ دیتا ہے مری زلیبت کے افسانوں کو
 غم کے صحراؤں میں جھلسا ہوا احساسِ وقت
 ڈھونڈتا ہے لب و رخسار کے پسیماؤں کو
 جرأت آموز ترا حین پذیرائی ہے
 پل نکلتا ہوں محبت کے صنمِ سناؤں کو
 کون سمجھائے مگر شیشہ گری کے آداب
 شمع کی لُو پہ بجھرتے ہوئے پروانوں کو

بتہ زلفت نہیں عشق کی شہیدہ سہری
 کون اب روک سکے گا ترے دیوانوں کو
 کون گرتی ہوئی دیوار کو اب ہمتاے گام
 کون موڑے گا پھرتے ہوئے طوفانوں کو

اے مری جانِ دشت!

تو اگر چاہے تو میں چھوڑ کے مزدور کے گیت
اپنے ارباب ریاست کی تشفی کے لئے
حسن و الفت کی حکایات قلم بند کروں

شہرِ سندھ دوس کی حوروں کے فسانے لکھوں
چند بلور سے جسموں کے ترانے لکھوں
جن میں ہر شعر ہو مانسہ دے مئے ناب رواں

چاند کی وادی پر نور پہ طعنار کریں،
قصرِ نابید پہ شعروں کی گمبیں بھینکوں،
رقص کرتے ہوئے تاروں کو گرفتار کروں

میں بھی دھراؤں وہی کاکل و زخار کے گیت
جن سے جل اُٹھتی ہے ہر بزمِ سینانِ جہاں
میں بھی بن سکتا ہوں اوہام و طلسمات کے جال
میرے شعلوں کو بھی مل سکتی ہے پھولوں کی زباں،

تو اگر چاہے تو الفناظ کے جادو کے طغیل
کشتِ دہقاں بھی خیاباں میں بدل سکتی ہے
بھوک بھی لزقِ دل و حباں میں بدل سکتی ہے
اور مردور کی کٹیا میں سسکتی ہوئی شمع
یک بیک شمعِ شبستاں میں بدل سکتی ہے
پس مرے حلقہٴ خمیسل میں مضمون کتنے
جن سے کھل سکتے ہیں اشعار کے افسوں کتنے

میں بھی ایوانِ حکومت میں بلا یا جاؤں
ہو میرے حال پہ بھی لطف و عنایت کی نظر
ایک آوارہ و درماندہ پہ شفقت کی نظر

میرے ہر شعر پہ سنگامہ و سنہریاد اٹھے
اور سرِ بزمِ ملے مجھ کو بھی تحسینِ منزل
میرے اشعار کی تشریح کا ساں ہو جائے
میں بھی لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بن جاؤں
یعنی کچھ اور بھی شاعر کے سوا بن جاؤں

تو نہ چاہے گی مگر میرا تماشا ہونا
تو نہ چاہے گی شبِ تاریکِ اسلامی کا فروغ

تجھ سے روشن ہے میرے دل میں وفا کی قندیل،
جانِ اشعار ہے تو، شعلہٴ ایشا رہے تو
تو بھی اوروں کی مصیبت پہ تڑپ اُٹھتی ہے
عرصہٴ دہریں میں عبس و دل افکار ہے تو
میرے ہاں عقل میں چھنکتی ہے جو زنجیرِ بلا
اسی زنجیر کے حلقے میں گرفتار ہے تو

پر شبِ تاریکِ اسلامی کی سحر و دور نہیں
اک نہ آگ روزیہ زنجیرِ بلا ٹوٹے گی
حلقہٴ کاملِ ظلمت سے کرن بھوٹے گی

اور کچھ دیر غمِ گردشِ ایام سہی
اور کچھ روز بھی تانہیِ آلام سہی

سخن گسترانہ

تم کہتے رہو ہمارا کیا ہے
یہ حسن یہ لالہ زار کیا ہے
ہم نے وہ چمن بھادئیے ہیں۔
گلابیں نہ جنھیں مٹا سکیں گے

تم کہتے رہو کہ شب کا عالم
مغل میں یونہی رہے گا کم کم،
ہم نے بھی دیئے جلا دیئے ہیں
طوفاں نہ جنھیں ٹھبھا سکیں گے

تم کہتے رہو کہ فصلِ انساں
رہتی ہے تمام عمر گریاں
ہم لوگ کہ مسکرا دیئے ہیں
صدے نہ ہمیں رُلا سکیں گے

آنسو بھی بشر بھی ہم چنیں گے
جو کچھ کہو گے تم، سنیں گے

جنارہ

کیسی ٹی کے مزدور اطفال و خیراں
لئے جارہے ہیں خزاں کا جنارہ
خزاں جس کی ہے چارگی کے بعد پر
کسی ٹال کی شفقت کے لیے نہیں ہیں
خزاں جس کی آنکھوں کے سوکھے کوڑے
تو ہیں کسی باپ کے آنسوؤں سے
خزاں جس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے
خزاں جس کا دنیا میں کوئی نہیں ہوتا
کرائے کے بے روح مزدور مل کر
خزاں کا جنارہ لئے جارہے ہیں
مگر یہ خزاں کا جنارہ نہیں ہے
خزاں ایک شاعر ترائوں کا رسیا
سیرپوش فلقے گلے سے لگائے
کلیجے میں دنیا کے گما و پھپھائے
بہت دیر پہلے سے ہی مرچکا ہے

خزاں جیسے بے دست و پا غم رسیدہ
خزاں کا جنارہ لئے جارہے ہیں
مگر یہ خزاں کا جنارہ نہیں ہے
جنارہ ہے یہ اس حسین غزل کی کا
جنیں اس رو پہلے تھکن کے وارث
جلا تے ہیں فک کے آتش کدے میں
جنارہ ہے یہ اس تختیل کا جس کو
کچل ڈالا سرٹے کے قہقروں سے

انہیں قہقروں کی ہے وہ گونج جس نے
خزاں کا جنارہ اٹھایا ہوا ہے
انہیں قہقروں کی ہے وہ گونج جس میں
ہزاروں خزاں اب بھی دم توڑتے ہیں

یہ دو برسے وہم چلچلیا نہ چلے
نہ شے بھی چلچلے نہ چلچلیا نہ چلچلے
ہم پر غریبات سے یوں بڑا نہ چلچلے
مافی واصل نام چلچلیا نہ چلچلے

آلام جہاں خواب نظر آتے ہیں
ظلمت کے سے قناب نظر آتے ہیں
اک زبر غریبات سے بھی سب میں
خیار بھی احباب نظر آتے ہیں

بہ عیست

لفظوں میں غلٹنے دھوٹتے ہیں ہم کو
کھول میں زمانے دھوٹتے ہیں ہم کو
توز ہری دسے شراب کو ہم کو
غنیجے کے پانے دھوٹتے ہیں ہم کو

حالات کی دوپہر کڑی ہے ساقی
نقدیہ بزم کھڑی ہے ساقی
سچو دیکھ جہاں بے آؤ نہیں کیں
بہنے کو زندگی پھیلا جہاں

احمد فاضل

پھر وہی میر و غالب کا قضیہ!

ادب و لطیف لاہور ہاؤس میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا مضمون "میر و غالب کی ہم طرح غریب میری نظر سے گزرتی ہے" غائب
موجود کے بعض اہلکاروں کے نتائج سے اختلاف ہے۔ اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب "میر و غالب کے یہ اشارے۔"

میرؔ کیا طرح ہے آشنا کا ہے، گچھ نا آشنا یا تو یگانے ہی رہے، ہو جئے یا آشنا

غالبؔ خود پرستی سے رہے یا ہمہ گیر نا آشنا بے کسی میری شریک! آئینہ ترا آشنا

نقل کر کے فرماتے ہیں کہ۔۔

"میر کا انداز حسب معمولی نیم جزد ہاؤس اور طرز گفتگو میں عافیت پیدا ہوئی ہے۔ غالب کے شعر میں احساس انا اور خود نگری

پائی جاتی ہے جو عشق میں ہی خود راہ و بالا دست رہنے کے عزم سے پیدا ہوئی ہے۔ میر کے شعر میں بھی معمولی شکایتی اور

انتہائی تنگ پایا جاتا ہے۔ یہاں کی شاعری کا مستقل رنگ ہے۔ یا تو یگانے ہی رہے ہو جئے یا آشنا۔"

میر یا ادب و عرفی کر دے گا کہ ڈاکٹر صاحب کو میر کے مطلع کی صحیح معنویت کا دورک نہیں ہوا اس کے انداز میں تکیہ چاہی ہے۔ مگر یہی نہیں بلکہ دل کی

بات نکال رہا ہے۔ معشوق کے تعلق کا کلمہ۔ اور یہ اشارہ ہے کہ میں تیرا بیگانہ ہوں۔ میرا دل تیرا دل ہے۔ میرا دل تیرا دل ہے۔ میرا دل تیرا دل ہے۔

آشنا ہے کبھی نا آشنا۔ شعر میں اپنے صدق، خلوص و خود داری و پاس و غم کا اظہار ہی نہیں بلکہ معشوق سے بھی اس کے متوقع ہیں۔ یہیں سے میر اور

غالب کے نظریہ عشق کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ عربی انسل میر محبت میں مساوات کا متوقع ہے۔ ایرانی شاعری کا پیر غالبؔ

دے دے جس قدر وقت ہم غم میں نالین گے باہر آشنا نکلا ان کا باہاں اپنا

کہتا ہے۔ غیر میر کے شعر میں سپردگی کی چھاؤں بھی نہیں (یہ اور بات ہے کہ معشوق پر فیصلہ چھوڑنے کو "سپردگی" سے تعبیر کیا جائے)۔ شعر کے جو

تہذیب میں وہ "میرؔ سیدہ و مرغ" کے سوا کسی کے جو بھی نہیں کہتے۔ یہ نیم جزد بیت نہیں عزت نفس ہے۔ خیال میں اس قدر آفاقیت ہے کہ مطلع عزت نفس

ہو گیا ہے۔

غالبؔ بکھر میں کہ مجھے بے کسی نے رخوت زدی کہ مت سماجت کر کے تجھے اپنی طرف منتقل کرنا اور تجھے اُٹھنے کے سامنے آرائش و

زیبا کش سے غرضت نہ ہونی کہ نابل پر سسٹن جوتا۔ غالب کی خود پرستی "صحت بی بی از بے چادری" کی مصداق ہے۔ بے کسی میں احساس انا ہونا،

خود نگری کا پایا جانا، خود راہ و بالا دست رہنے کا عزم دور از کلہ باتیں میں اور بے کسی خود پرستی کہتا غالب کی خود فریبی ہے۔ خود پرستی کا شکر انکال

دیکھتے تو شعر میں ایک گونہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً "ایسے عالم میں نہ کیوں رہتے ہم نا آشنا" نیز تب کسی میری شریک "ست" میری سوس بے کسی

بہتر ہوتا۔ جو نفس اور آشتا میں جڑتا ہے شریک اور آشتا میں ہرگز نہیں۔ تعجب ہے کہ ایسے ناقص مطلع کو سراہا جائے۔ غالباً ایسی ہی کمزوریوں

کے باعث و قیود میں نگاہوں نے اس کو انتخاب سے خارج کر دیا تھا۔ اب فطرت عمید یہ ہے اس کے وجود کا علم ہوا۔ یہ وجہ بھی ممکن ہے کہ اس کا

میں نے یہاں بہتر بل شامل انتخاب ہے۔

وہاں وہ غزوہ خرونا نازاں ہے گاہا پاس دوح
ماویں ہم میں کہاں، خرم میں وہ بھانے کیوں

غائب

میت

فلک کتابت کے انکا غیر سے انوں میت
مخل کرتی ہے کہ وہ سبہ ہر کس کا آہستہ

کیا کروں کس سے کہوں شاہی چھوٹا لڑا
ما سے ظلم میں نہیں ہاتے کس کو آہستہ
جن سے کس کی فحش حالت میں نے یہ جو ہے کہا
ہم تہ کہتے گریباں ہم سے وہ ہوتا آہستہ

ان اتحاد کے قاتل میں اور شاہو مجاہد ہے کہ جرات غائب نے ایک شرم نہایت بیخ انداز میں بیان کر دی تیر کے وہ شوق کر
لیں وہ بات پیدا نہیں کر کے۔

غائب کے شوق غریب تیسیم مگر سوال یہ ہے کہ کیا دونوں شاعروں نے ایک ہی بات کہی ہے، تیر نے مشرق کی عام بیگانی کا ذکر
کیا ہے۔ غائب نے غیر سے اخلاص برتنے پر اظہار و رشک و تانت کے بعد اپنے دل کو یوں بھجایا ہے کہ وہ بے ہر ہے کہیں کا آہستہ نہیں ہو سکتا۔
تیر کے مطبوعہ کلیات میں پہلا مصرع اسی طرح وضع ہے جس طرح ڈاکٹر صاحب نے نقل کیا لیکن میر سے پاس جو غلی فحش ہے اس میں یہ صورت ہے
کیا کروں کس سے کہوں شاہی چھوٹا لڑا۔ ایسی حالت میں کس کی عاشقی کا سیار بندہ تھا، اس کا جواب ہوتا
مشرق کو بیگانی اور بلا دہر بیگاد پاکر دوبارہ اتفاق و اتحاد کا یہاں تک آئندہ ہے کہ اسے آشتی پر مال کر دینے کی ایک سبک سے ناکام آجاتا
کہتا ہے یا اس کا جو مشرق کو غیر سے مختلط دیکھ کر آتش رشک میں جتا پھر اپنے دل کو سمجھاتا ہے کہ وہ بے ہر ہے۔ کسی کا آہستہ نہیں ہو سکتا۔
تیر کے دونوں اخبار میں جو وصیت منی یاد کے عالم نا آہستہ ہونے سے پیدا ہوئی ہے اور خیال کو مجاز سے حقیقت کی طرف منجر کرتی ہے اس
کی طرف بھی توجہ کیجئے۔ اشارہ کافی ہے، تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

میر سے بلیں پانیں میں کہتی تھیں جوتا کاشش کے ایک غزوہ نگ فرادی اس میں کا آہستہ
کامل دلا کہیں سنبل سنن ہم نستر ناک سے کیساں ہوئے میں ہائے کیا کی آہستہ

ڈاکٹر صاحب نے ایک شہرہ نگ فرادی کی بالکل ترکیب کے متقابل اختیار کیا اور فرمایا کہ غائب کی اس غزل میں ان اشعار کے معنی واضح ہو جاتے ہیں
نہیں مگر ایک اور غزل میں یہ معنی پایا جاتا ہے۔

سب کہاں کہ لا دل میں نہایاں ہو گئیں خاک میں کیا صد تیں ہیں گی کہ نہاں ہو گئیں

کوئی شک نہیں کہ غائب کا یہ مطلع اس کے بہترین اشعار میں ہے۔ اس میں سب کہاں کا لٹل نہایت پیچھے ہے، مگر غیب مواند ہم طرح غزلوں سے
آگے بڑھنے لگا تو مجھے بھی تیر کے دوسرے اشعار پیش کرنے کا حق ہے۔ یہی صورت کے ساتھ کہیں موت بھی ایک چیز ہے۔ آواز میں بھی جاہل ہوتا ہے
تیر نے اپنے ایک شرم میں وہ فوں کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔

گل یاد کا، غیرہ خوباں ہے بے خبر مرغا میں نشان ہے کسو خوش بیان کا

جہاں آگے تاجیب کسی نے نام لیا دل ستم زدہ کو پہنے تمام قدام لیا

ہم فقیروں سے بے ادائیگی آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

عالم عالم مشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے میں دریا دریا وقتا ہوں، محرا محرا دشت ہے

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر مسیّر کتاب جو دیکھوں اسے میں بہت پیارا لے

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرا ناتا نادان پر وہ جی سے بھلیا نہ جائے گا

ہجران یا راکب محبت ہے ہم شیش مرنے کے حال سے کوئی کتب حیا کیے

ہمیشہ چشم بے ناک ہاتھ دل پر ہے خدا کو نہ ہم سا بھی مدد مند کرے

مدتے پیرتے ہیں مدلی مدلی دت اب پیچہ روزگار ہے اپنا

خوش نہ آئی تہا دی چال میں یوں نہ کرنا تھا پائمال بس میں

اب کہتے ہیں کہتے یہ کہتے جو وہ آتا یہ کہنے کی باتیں میں کچھ بھی نہ کہتا

استخوان کا پ کا پ جلتے ہیں عشق نے آگ یہ لگائی ہے

اورد معلوم کئے ایسے ایسے جہاں ہر ایک اس کے کلام میں کجورے ہوئے ہیں کیا یہ معنوں آفرین ہے، خیال گل بوٹے بننا ہے جو رنگ بو
سے خالی ہیں۔ یہ حقیقت نگاری ہے یا غالب کی طرح زینت آسمان کے قلابے طاب ہے۔

تیر بیشک حسنِ فطرت کا دلدادہ تھا، بلکہ عظیم غلطی عطرِ عجب عجب کا، مگر فطرت کا دلدادہ معنوں قیاس نے کے لئے اس کی جیب
ٹوٹے گا۔ فطرت کے عام جواہ کو سامنے رکھ کر اس سے معنوں پیدا کر لگا۔ یا نظارۂ جمال میں ایسا کھو جائے گا کہ ناظرۂ فطرت اپنا اور اشتا اس
پاکراس سے ہم کلام ہوگی اپنے اسرار کے خوانے اس پر کھول دے گی اور زبانِ شرف و غم میں اپنے روز و حقانیت بیان کرنے کی صلاحیت عطا کرے گی۔
کیا مندرجہ ذیل اشعار اور سیاق و سباق میں فطرت کی ترجمانی نہیں بلکہ محض تعالیٰ یا معنوں آفرین ہے ؟
کہا میں نے کتاب ہے گل کا شات گل نے یہ سن کر تعجب کیا

چلتے بر تو میں کو چلتے کہتے ہیں کہ ہساروں ہے بات برسے میں بھول کچھ میں کم کم باہر باروں ہے

مردوں میں چلی نہ بھولتی ہے سرسوں ہوا ہے عشق ہی گل نہ دیکھا ہے آج

بہارانی شکر نے گل کے نکلے میں گلابی سے ہنایاں سبز ہوئے ہیں گلستاں میں شرابی سے

اگے قدم تیل دھاباں گل ہم صبح میں نورِ یوم احباب تھا
 کھنکھن کم گل نے سیکھا ہے تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے
 کہ سر جذبِ الفت تجھ سے کل چمن میں توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدا تے میل
 یکرنگیوں کی دہریں کر کے مر گیا ہے گل میں رنگیں ہیں یہ ہیں نقشِ پائے میل
 پیدا ہے رندِ شرق تو کی نود سے نکلے ہے کوئے یار سے نکلا کرا قلاب
 نورت کا ہر تناس شاو غزل کی مشاطگی سے اس کے ماضی کو آماستہ دھیرا کر کے ایک ندی بہا قلاب کے پس پردہ پیش کر کے
 کجھت ملتا ہے نہ سنے کی دعوت دیتا ہے۔ بقدرِ غزل سیراب ہوتا دقِ نظارہ دیدہ نظام کی پرستار ہے۔
 تیر کی غزل کا ایک دوسرا قطعہ ہے۔

یوں سا ہوتا ہے کرتا ہے سفر کا عزم جزم ساتھ اب بیگا نہ وضوں کے ہوا آشنا
 غم صائب کا مناسب ہے ہماری اور سے مانعے اس کے پٹھے گریہ کوئی ہوا آشنا
 تا بجاں ماہرِ بیم و تابستندل دیگیاں زہی ہا شد جہاں ما از آشنا تا آشنا
 بقول شاعر صاحبِ غائب کی اس غزل میں تیر کے ماضی اشارہ موجود نہیں۔ گم ایک اور غزل میں یہ ضمنی اشارہ ہوا ہے:
 قیامت ہے کہ ہودے مدعی کا ہم سفر غائب وہ کافر جو خدا کو بھی نہ مانتا جلے ہے مجھ سے
 اداس کی قرینت میں یوں رطبِ لسان ہوئے ہیں،

غائب کے ایک شعر میں جو ایسا بھاریا اہواز ہے تیر کے پورے قطعے میں مصائب کے شر کے باوجود وہ اشریہ انداز ہو گا
 غائب کے شعر میں بیادیت، جوشِ رنگ، اضطراب و اضطراب اور کامل تغزل موجود ہیں۔ تیر کے یہاں معاملہ، کہانی،
 اور وہی نیم بند بادِ لول کلام پایا جاتا ہے جو غزل کی غزل کا خاصہ ہے۔
 ڈاکٹر صاحب نے یہ غزل نہیں فرمایا کہ تیر کا مقصد مصائب کے شر کو تعین کرنا تھا۔ لہذا اس کے مفہوم سے لپٹا رہنا لازم تھا۔ تاہم
 عزت نفس کا تا کاٹا نہ کہ غمِ عشق کے پاس نہیں جاتا بلکہ یہ عاجزِ خاطر کرتا ہے کہ میری جانب سے کوئی اس کو مصائب کا یہ شر نہ کہیں
 کی غزل میں کوئی شک نہیں اور منہ ہوا اشارہ کو اسی روشنی میں پرکھنا چاہئے۔
 اب میں تیر کا ایک دوسرا شعر پیش کرتا ہوں:

عشق ان کہ ہے جو یاد کو اپنے دمِ دقن کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی ولے
 یہ ہے جذبِ رنگ و غیرت کی جھجھکی۔ نہیں کہ عشق کو غیرت لگائے لے جاتا ہے یہاں عشق غیر کے ساتھ جھاگتا ہے۔ غائب
 کھڑے دیکھتے اور اقلیل کے کہتے ہیں: قیامت ہے انج
 یہ عرض کہ دل کہ عشق ان کو ہے کے سنی میں ان کو آفریں ہے۔

ہنر شہزادہ غالب کا ہندوؤں کے انفرادی رنگ اور تخیل کی نادرہ کاری کا شاہی ماہر نمونہ ہے۔ اس کی جس قدر عظمت کی جائے کم ہے۔

دورہ دورہ ساغرے خاندان سب رنگ ہے گردش مجنوں چٹکھائے لیل آشتا
دنیا کو باعتبار تغیرات و متاآبادگی میناڈ نیرنگ اور دندوں کو جو متروقات کی نشانیاں ہیں ساغرے خاندان نیرنگ کہنا پھر اس علم آبادی و
ویرانی و آباد ویرانی کو گردش مجنوں سے تعبیر کرنا اور چٹکھائے لیل و اشارہ شیت، کارانہاں کہہ کر گردش و تخیل و میناڈ آبادی، بکھارنا
اور لفظ چٹکھاکر مال سم پیدا کر دینا حسن تخیل و بولانی فکر کا حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ مشرق و حکمت و فلسفہ و تصوف کا وہ بدیع استخراج ہے کہ باید و
شاید اور اختلاف مذاق و پختہ کو ڈاکٹر صاحب نے اس شعر کی تعریف میں ایک خط بھی سپرد قلم نہیں کیا۔
دندوں استخوانوں کی غزلوں کے جو اشارے میرے انتخاب میں آئے ہیں پہلو پہلو سے کرتا ہوں۔

غالب

دکھ کر کہتا ہے کہ اس کا غیر صفا صفت
صلی کہتی ہے کہ وہ بے ہر گس کا آشتا
شوق ہے سلاطین طراز نازشیں ارباب غز
دورہ دورہ مستگاہ و قطرہ دریا آشتا
میں اور کائنات کا کٹا و پھل و مٹی کہ ہے
عافیت کاوشن اور آوارگی کا آشتا
دورہ دورہ ساغرے خاندان سب رنگ ہے
گردش مجنوں چٹکھائے لیل آشتا

میسر

کیا طرح ہے آشتا کہ ہے گے نا آشتا
یا تو بیگانے ہی رہے، جو بچے یا آشتا
پانچالی صد خانا حق نہ ہوا سے عندلیب
سبز بگاد بھی تھا اس میں کا آشتا
کن سے یہ پھر غریبی کی پریشیاں نہت ہے
آتی بھاگھوں میں میرے سوج دریا آشتا
داغ ہے تاہاں علیا لوجہ کا پھاتی میسر
برنجات اس کو بچا رہا ہم سے بھی تھا آشتا

باقی ماندہ موازنہ اس تمبیہ سے شروع ہوتا ہے۔ تیر و غالب کی دو اور ہم طرح غزلیں ایسی ہیں جو میں غالب بعض گاہری خصوصیات
کی بنا پر تیر سے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ذیل کی غزل میں سلاست اور صفائی بیان زیادہ ہے۔ اس نے تیر کے عام رنگ
سے مماثلت بھی زیادہ ہے۔

غالب

کیوں جل گیا نہ تاب دینے یا دیکھ کر
جلتا جل اپنی طاقت صیاد و دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں بچے
سرگرم ناہائے شہر بار دیکھ کر
کیا آبد سے عشق جہاں عام جو حنا
رنگا ہوں تم کو بے سبب آلودہ دیکھ کر

میسر

رہتے ہیں تیری زخموں میں بیاہ دیکھ کر
جاتے ہیں جی سے کس قدر آلودہ دیکھ کر
انوس ہے کہ خطر اک عمر تک رہے
پھر مر گئے تیرے تئیں اک بار دیکھ کر
ناخواندہ خط شوق لگے چاک کرنے تو
قاصد تو کہیوں تک کہ ستمگار دیکھ کر

میت

کوئی مردم ہوتا ہے تو انھوں میں میری عیب
 کرونگی ایک وعدہ دیدار دیکھ کر
 دیکھیں میری عیب و ثقب پہلا پیش چشم ہے
 میری وہ گئے ہیں اسرار دیکھ کر
 جاتا ہے آسمان سے کوچے سے یا کے
 لگا ہے جی بھرا درد دیدار دیکھ کر
 تیرے خلم ناز پر جاتے ہیں جی سیلے
 نکلیں قدم زمیں پر ستار دیکھ کر
 کھنچ کر چشم پوشی یہاں تک کی ہم لہیں
 چپتا ہے کہ کو دور سے اب یار دیکھ کر
 جی میں تھا اس سے ملنے تو کیا کیا نہ کہنے تیر
 پر جب ملے تو وہ ملے تا چار دیکھ کر

غالب

آتا ہے میرے قتل کو پہ جو شخص دیکھ سے
 رتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر
 ثابت ہوتا ہے کہ وہی میت ہے خون خشت
 لہزے ہے موج سے تری رقا دیکھ کر
 دامن تاکہ یا نے کھینچا ستم سے ہاتھ
 ہم کو سر بھی لذت آزاد دیکھ کر
 بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ہاتھ
 لیکن عیار طبع خس دیدار دیکھ کر
 زار باغہ ہونہ صد دانہ توڑ ڈال
 برو چنے میں راہ کو ہوار دیکھ کر
 کیا ہر گاہ ہے مجھ سے کہ آئینے میں سے
 عوہ کا عکس مجھ سے زنگار دیکھ کر
 گرئی تھی ہم پر برقی بجلی نہ طور پر
 دیتے ہیں باد و طوفان قدح خوار دیکھ کر
 سرچھوڑا وہ غالب شوریدہ حمل کا
 یا نا گیا مجھے تری دیدار دیکھ کر

ڈاکٹر صاحب کا فیصلہ ہے کہ مرزا غالب کی یہ غزل ان کی بہترین غزلیات میں سے ہے۔ اس کا ہر شعر تیر کے اشعار پر بھاری ہے
 ماسوائے اس شعر کے ۔

جاتا ہے آسمان سے کوچے سے یار کے آتا ہے جی بھرا درد دیدار دیکھ کر

تیر کے کسی شعر میں وہ گری اور تاثیر نہیں جو غالب کے ہر شعر میں پائی جاتی ہے۔ غالب کا ماحول بیان انداز اسلوب، شاعرانہ خیالات تیر
 کی غزل میں نظر نہیں آتا۔ تیر کے کلام میں دیدار سے متعلق تصویات موناوت ہوتے ہیں۔ مگر غالب نے اس غزل میں دو مرتبہ دیدار کے معنوں
 میں وہ غلی اور تاثیر پیدا کی ہے کہ اس خاص موضوع میں مجاہد تیر سے کسی طرح کم نہیں۔

ڈاکٹر صاحب دو مرتبہ نہ معلوم کس بنا پر غزلیہ لکھے۔ دیدار کا تانیہ صرف غالب کے متعلق ہے۔

ہوا نے کی دو صد تین ہیں دا، کن تانیہ کس نے اچھا کیا۔ (۱) ایک غزل کا دوسری غزل سے من حیث المجموع تقابل،

پہلے ہم تانیہ اشاریے ۔

میتھر

مرتے ہیں تیری زگس چار دیکھ کر
جلتے ہیں جی سے کس قدر دیکھ کر

غالب

کیا ابروئے عشق جہاں حسام ہو جا
تو کتا ہوں تم کو بے سبب آند دیکھ کر
راہنما کہ یا رہنے کھینچ ستم سے ہاتھ
ہم کو حسد میں لذت آند دیکھ کر

تیرے کہتے ہیں کہ ایک تو عشق ہی آندا ہے۔ دوسرے زگس چار لیٹھ عشق کے عشق کا آند ہلائے آند ہے۔ ہذا بچے دیکھ
مہر کہ مر رہے ہیں۔ خیال میں ایک گونہ ناز کی کے بار صفت جاؤ بیت نہیں۔

غالب کے چاہے شرکاء مطلب ہے کہ عشق کی بنا خاص مقام پر کیاں بلا طریق ہے۔ ہذا میں کھینچتا ہوں کہ اگر عشق کی شان میں بڑ
لگنے کا وہ ہے۔ مشرقیوں کا گھر مذہب اور میں۔ اگر عشق کے عزم راہ ہوتے تو ایسی حالت میں عشق کو یہی مطلب کہتے۔

کچھ ہو رہے گا عشق و جوس میں بھی امتیاز کیا ہے اب مزاج تر عاشقان پر تیر
غالب کا دوسرا شعر خوب ہے۔ عشق کی شوقی دستم غریبی کی عمدہ مثال ہے۔ جہاں تک آند کے قافے کا تعلق ہے۔ یہاں غالب کے ہاتھ پر

میتھر

کوئی جو دم رہا ہے سوا نگہوں میں ہے پھراب
کہ یونگ ایک دوسرے دیدار دیکھ کر

غالب

کیوں مسل گیا نہ تاب دیدار دیکھ کر
جلا ہوں اپنی طاقیت دیدار دیکھ کر

تیرے شعر میں رویت کے لطف کے سوا کوئی کشش کوئی غری نہیں غالب کے مطلع کے الفاظ شان دار ہیں، بند شجیت ہے گر حال
کے لحاظ سے مصرع اس کی ساری جمع ہوتا لفظ جملے کے دہرے معنی میں، ایک تو جلا دوسرے جلا مجازاً یعنی ٹنگ۔ عشق کی تابش رخسار دیکھی
نگزلی کے خاکستری ہوئے اب اپنی طاقیت دیدار پر ٹنگ آ رہا ہے، یہی تک بندی ابلی نعر کو مرعوب نہیں کر سکتی۔ جہاں تک قافے کا تعلق ہے نہ میں نہ
شکست و ادما ظفر۔

اس مفہوم کے واضح کرنے کو محض الفاظ کے پیر پیروں سے ہی نہیں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ تیرے اس شعر کا
کوئی جو دم رہا ہے سوا نگہوں میں ہے پھراب کہ یونگ ایک دوسرے دیدار دیکھ کر
خود تیری کے دوسرے شعر سے موازد کیجئے
آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں مرزا ہوں میں تو۔ ہائے عہ صرفہ نگاہ کا
جس میں خیال معور ہو کر تائیر کا قلم بن گیا ہے

میتھر

جاتا ہے آسمان لے کر چپے سے بار کے
آتا ہے جی بھرا درد دیدار دیکھ کر

غالب

میر صحت نامہ غالب شہریدہ محال کا
یاد آگیا کچھ تری دیدار دیکھ کر

تیر کا شعلہ نثر ہے جوں میں پیرتا جلا جاتا ہے۔ خود اس کی ہے کسی درد دیدار سے ٹپکتی ہے۔ اور ان کو اس کا جھنڈو جھنڈا ہوا پتی

ماخذہ غلط شوق کے چاک کرسنے تو
قاصد کہ کبیر ملک کہ مستشار دیکھ کر

تیرے خستہ نام ناز پر جیتے ہیں یہی چلے
طرح سے جو ہم روشنی بیان تک کی ہم نشین

رک ٹک قدم زمیں پہ استغلا رو کی کہ
پھینکا ہے مجھ کو درد سے اب یاد کی کہ

۱۔ افسوس ہے کہ خضر اک مرتبک رہے
۲۔ دیکھیں جبر و رشک پری خوش چشم ہے
۳۔ جتنا ہے آسمان لئے کوچے سے یار کے
۴۔ جی میں تھا اس سے لئے تو کیا نہ کہنے

پھر مر گئے تو سے تیسری بار دیکھ کر
جراں رہ گئے ہیں اسرار دیکھ کر
آتا ہے جی ہزار ہر وہ دیکھ کر
پر جیسے تو رہ گئے تپا دیکھ کر

۱۔ منہ نہیں کھولتے ہی کھولنے انگلیں غائب
۲۔ منہ گھبرا کھولتے ہی کھولنے انگلیں بے ہرے

آتشِ پست کہتے ہیں اپنی جہاں مجھے
سرگرمِ نابالائے مشرور بار و نیلہ کو

آپ نے میرے قتل کو ریوشت و شک سے نرتا ہوں اس کے باعث میں تلوار و کچھ

جانا سہ یا ریخ بخت غیر کی طرف

طاعت خواہ گروں میں رہنا بخیر و خیریت
 رہے۔ یہ سچ ہے تو یہی وقار و کھبر

دوسرا مصرعہ بجائے خود ایک میں شریک ہے اور اس قدر طبع کہ مصرعہ دیکھ کے ایک شاعر خوانہ باد و خوارق پیدا ہے۔

بک جلتے میں ہم پہ پہ تنہا تنہا کے ساتھ
حقیت سے ہم کنار اور شاعر کی نفسیات کا آئینہ دار ہے۔

وفا رہا نہ سب و ہمدردانہ توڑ ڈال
پرو چلے ہے راہ کو بہرہ دیکھ کر

کھلی ہائی کفر کی تقبی اور اس سے بے خبر اس طرح بدشوں کے بجائے پتھر ستونہ ہوں گے۔

کیا بدگماں ہے جو سچے آئینے میں سرے
طرح کاٹکس لگے ہے دنگار دیکھ کر

اسی کو ہے پہکا لانا کہتے ہیں

گرنی قہی ہم پر برقی تجسلی نہ طور پر
دیتے ہیں باد و غربت تدرع غار دیکھ کر

جن قدر تربیت کی جائے کم ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے مصرعوں سے غالب کا ایک شعر (بظاہر چون نظر انداز ہو گیا جو نہایت لطیف دہیچے ہے۔

ان آجوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوشی ہوا ہے راہ کو پر غار دیکھ کر

تیر کے منتخب اشعار میں دیکھ کر چاہوں غالب کے منتخب اشعار یہ ہیں۔

(ثابت ہوا ہے گردن مینا پر خوشی حق)
لڑے ہے سوچے دی رفتار دیکھ کر

بک جلتے میں ہم پہ پہ تنہا تنہا کے ساتھ
لیکن عیاں طرح غم سہیا دیکھ کر

وا حسرتا کہ یاد نے کھینچا تم سے باقہ
ہم کو حویں لذت آزاد دیکھ کر

گرنی قہی ہم پر برقی تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں باد و غربت تدرع غار دیکھ کر

ان آجوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوشی ہوا ہے راہ کو پر غم سہیا دیکھ کر

اب پانچ ڈاکٹر صاحب غالب کے ان اشعار میں من و مکاشفہ جی کی ہیں نے مذمت کی ہے ورنہ ان کا یہ دعویٰ بہت بے بنیاد ہے۔

کہ غالب کی اس غزل کا ہر ہر شعر تیر کے اشعار پر بھاری ہے (ایک استثنا) اور تیر کے اشعار میں وہ گئی اور شاعر جو تیر کے اشعار کے

ہر شعر میں پائی جاتی ہے اس شعر کے علاوہ جسے ڈاکٹر صاحب نے مستثنیٰ کر دیا ہے اگر مستثنیٰ ذیل اشعار میں تاثر نہیں تو ہر شعر میں تاثر ہے۔

انوسن سے کہ مشترک غم تک وہ ہے
پھر مر گئے ترے عشق اک بار دیکھ کر

جی میں تاس سے ملے تو کیا کہنے کہے تیر
پوچھ بے زورہ گئے ناچار دیکھ کر

مندرجہ ذیل غزل کے شعر ارشاد ہوئے ہیں کہ اس میں بھی کلام غالب کی جودہ انگیزیاں تیر کے اشعار میں کما حقہ دیکھی ہیں۔

غالب

دھکی میں سرگیا عید باب شہر دھکا

عشق نبرد ہمیشہ طلب کار مرد دھکا

میر

دل عشق کا ہمیشہ حسد لین بسد دھکا

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے دھکا

[illegible]

کتابخانه عمومی حضرت امام خمینی

یہ غلط فہمی ہے کہ وہ اس کے مختلف شعبوں کی اہمیت کا شعور ہی ہے جو ملتی ہیں۔ اور جب معاشرہ تبدیل ہوتا ہے، تو یہ قدرتی طور پر تبدیل ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں تبدیلی اس قدر آہستہ ہوتی ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کرتے۔ اس کی وجہ اس کے ساتھ تعلق، ماحول اور معاشرہ کی ایک خاص قسم کے ساتھ رابطہ ہے۔

اب ایک بات دینی رہی ہے اور وہ یہ کہ ادنیٰ اور ابدی قدروں کا فلسفہ پیدا کیجئے گا۔ ہم نے یہ بتایا ہے کہ تغیر کا فلسفہ زندگی کے ارتقاء کے فلسفہ سے زیادہ اچھا ہے۔ ایک ترقی پسند اور صحت مند فلسفہ ہے۔ ایسا فلسفہ جو زندگی کو اس کے بڑھانے میں مدد دیتا ہے، اچھا ہے۔ لازمی طور پر اس فلسفہ کی خدمت بہت پسند فلسفہ ہوگا۔ یہ فلسفہ زندگی کو جامداد و مساکت بتائے گا اور ارتقاء کی نئی کریمیاں دے گا۔ اس فلسفہ کے ذریعہ مستقبل کی خدمت پسند فلسفہ جو اجماع کا فلسفہ ہوگا۔ یہاں طبعی کا فلسفہ ہوتا ہے جس کا مفاد مستقبل کے نئے معاشرے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور صحت پسند فلسفہ اس طبعی کا فلسفہ ہوتا ہے جس نے معاشرے کے خالق پر اور اس کا مفاد موجودہ معاشرے ہی سے وابستہ ہو۔ چنانچہ تمام مادی فلسفوں کو ہر طبقہ کے مسائل کے حلان طبعی نے ہذاں پر عیاں۔ مستقبل قدروں کا فلسفہ بھی اسی حلان طبعی کا فلسفہ ہے جو اپنی فکر کو تمام رکھ دیتا ہے۔ وہ ہر چیز کا ادنیٰ اور ابدی تبارک و تعالیٰ کو بطوری استعمال کو لازمی اور اپنے اقتدار کو ابدی بنائیں کوشش کریگا۔

عجب انسانی فطرت ہے دیوارہ حرقہ شکی قحی۔ جب زندگی کے بہت سے اسرار منکشف نہ ہوئے تھے۔ اس وقت اس فلسفے کا بہت زیادہ راز تھا۔ لیکن جب زندگی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ذہنی ترقی بھی ہوئی۔ اور یہ شعور پیدا ہوا کہ زندگی متحرک ہے، حالات دائمی اور آبادی میں کہنے سے بدلتی رہتی ہیں۔ انسانی شعور اگرچہ خارجی زندگی ہی کا پتہ تو ہوتا ہے، لیکن رد عمل کے طور پر وہ زندگی پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ اس کی حرکت و ترقی میں عین جہالت ہے تو ایک ایسا فلسفہ پیدا ہوا جس کی بنیاد اُمید اور یہ جاہلی تھی جو مستقبل سے یوں نہ تھا۔ وہیم پرستی جبر و قدر اور تقدیر کے نام سے کہلاتی تھی۔ جس نے انسان کو قید و بند کر دیا۔ اسی وقت سے ہر سراپا خدا جیسے شعور سی طور پر سنی فلسفہ کو بھی فروغ دیا۔ شعور کو اس نے اپنے لیے ایک طرف تو غیر کارائی پر دیکھنا شروع کر دیا۔ اور ان مطلق اور آبادی کا فلسفہ بھی پختہ ہوا۔

سائنس کے تمام شعبوں کی طرح ادب اور آرٹ میں بھی تغیر اور ثبات کے ان فلسفوں نے اپنا اظہار کیا ہے۔ چنانچہ جہاں ہمیں ایسا ادب ملتا ہے جہاں میں
عقائد و فلسفہ کی تبدیلی کا ذکر ہوتا ہے۔ وہیں ہمیں ایسا ادب بھی ملتا ہے جس میں حسن و محبت کا بہ لہذا ہر تصور پر مشکیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی قسم کے ادب میں
عقائد و فلسفہ کے ساتھ ساتھ ہی سیکڑوں برس پیشتر کے ادب اور موجودہ ادب میں کوئی بنیادی فرق نہیں پائیں گے۔ مثلاً جس محبت کو عام طور پر اخلاقی محبت
کہا جاتا ہے وہ عقلی محبت ہے۔ ادب میں کی افکار و جامعہ متاثر ہوتی ہیں۔ اس کا ہر پلکانے والے ادیب ہمیشہ ایک ہی قسم کی باتیں کہتے رہیں گے۔ چاہے وہ
اظہار میں کتنا ہی بدلتی رہے۔ لیکن یہی وجہ ہے کہ ادب میں عقلی و فلسفی کے اصول و قیوں کا ہر جگہ مختصر کمال کا۔ لیکن اس کے برعکس وہ ادیب
محبت اور عقلی کے اپنے مخصوص مزاج کے پس منظر میں دیکھا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی بات نہیں کہہ سکتا، کیونکہ مزاج ہمیشہ ایک نہیں رہی ہمارے مزاج کے ساتھ
سائنس و فلسفہ کے تصور و افکار میں تبدیلی ہوتے رہے ہیں۔

میں اور ہمارا قدار کے ٹکڑے تھے۔ میں چند مخصوص مہکات پر دھنیں کے ہیں۔ مثلاً یہ کہ قدرت قہر ہے اور انسان مجبور اور بے بس ہے،
کھسکے کھسکے لڑکے کا اقدار مستقل اور ابدی قرار پائیں گی۔ (ایک مخصوص معاشرہ میں صورتیں بھی موجود ہے، اس کی تبدیلی کا بھی کوئی گمانش نہ ہو سکتا۔
اور جب انسان اور اس کا مشورہ معاشرہ کے سامنے ہے پس اور لاچار ہو کر رہ جاتے گا، اسی طرح ایک اور دو گان جب نہ اذیت پسندی کا ہے۔

جب تک حکم، غلام کریم اور محکوم و مظلوم کی دنیا ہو تو یہ سب ہے کہ بناوٹ کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ حالات کو دیکھ کر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مظلومیت کے خاتمے کی خواہش یہاں نہیں چڑھ سکتی۔ اور اسی لئے ادبی برصغیر نے کاغذ پر اور ذہن پر ہندی کا لہجہ پیدا کر کے اس میں فلسفے اور اس سے پیدا ہونے والے خیالات پر یقین رکھ کر اور ان کا بھروسہ کر کے ہر فرد جب ایسے لوہے اور فلسفی معاشرے کو دیکھتا ہے تو اسے بھی کچھ غصہ و نفرت کہہ کر یہی کوشش کرتے ہیں کہ انسان اور انسانی شعور کو کتنا اور بے بس ثابت کیا جائے۔

اس وقت تک کہ ہم نے پوچھ کی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے، کہ جو کتاب زندگی سے قطع کر دیتا ہے، معاشرے کا جذبہ، اسی طرح زندگی کے ارتقاء کے ساتھ اور معاشرے کی ترقی کے طبعی ادب اور ادبی انداز کی تبدیلی کی انتہائی ضروری ہے۔ البتہ ادبی انداز میں تبدیلی کی رفتار نسبتاً سست ہوتی ہے۔ کہ اس پیمانی کی تمام روایات، مذہبی اور دیگر فلسفیانہ رجحانات کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ پھر کہ تغیر کا جذبہ ترقی پسند فلسفہ ہے۔ کیونکہ زندگی کے ارتقاء میں محض ثابت ہوتا ہے۔ یہ انسان اور شعور کی ترقی کا قائل ہے۔ اور اس کے برعکس ادبی انداز کی تبدیلی کا فلسفیانہ رجحان پسند فلسفہ ہے۔ کیونکہ یہ ترقی کو رد کرتا ہے۔ اسے بی لاپرواہی و قدر پرستی اور افریقہ پسندی ایسے زندگی کش رجحانات کہ وہ ان کو کچھ سے بہت زیادہ قریب رکھتے ہیں اہم ترین بحث ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر قدیم فلسفی میں تو ادب کیسے زندہ رہتا ہے۔ پھر کہ کیا واقعی ادب زندہ بھی رہتا ہے کہ نہیں؟

ادب ہر حال زندہ رہتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر دور کا تمام ادب زندہ نہیں رہتا۔ کچھ ادب اپنے زمانے میں ختم ہو جاتا ہے۔ کچھ ایک مخصوص نظام کی زندگی کے ساتھ زندہ رہتا ہے لیکن یقیناً ایسا ادب بھی موجود ہے جو مختلف سماجی تہذیبوں کے باوجود بھی زندہ رہتا ہے مثلاً یونانی ادب کا بہت بڑا اثر ختم ہو گیا، لیکن ایسا بہت سا ادب اب بھی موجود ہے جو یونانی معاشرے کے خاتمے اور حتیٰ کہ اس زبان کے خاتمے کے بعد کہ میں جس سماج میں کی گئی ہوئی تھی ابھی زندہ ہے۔ اس سے زیادہ بہتر مثال ہمیں شکسپیئر کے ادب سے حاصل ہو سکتی ہے۔ نہ صرف سرمایہ دارانہ سماج بلکہ سویت روس میں بھی شکسپیئر کی حیثیت ایک عظیم فنکار کے زندہ ہے۔ یہاں تک اندازہ لگایا جائے کہ سویت میں اس عظیم ڈراما نگار کے ہفتے وکھے میں جوئے، وہ تمام ادب کی مجموعی پیشکش سے کہیں زیادہ ہیں۔ ظاہر ہے شکسپیئر کے زمانے کا معاشرہ اور روس کا معاشرہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک طبقاتی سماج تھا۔ دوسرا غیر طبقاتی ہے۔ پھر ایسی کوئی قدر ہے جو شکسپیئر کے ادب کو آج بھی زندہ رکھتی ہے۔ اور پھر بقول سویت فنکار کے مستقبل میں اس کی حیثیت اور بڑی زیادہ اہم ہو جائے گی اور اسے آج سے بھی زیادہ مقبولیت ہو جائیگی۔

یہاں جو ایک بات لکھنا چاہتا ہوں کہ جیسے وہ شاید ہمارے اس مسئلے کا حل زیادہ آسانی سے ہو سکے گا آج سے کچھ دیر پہلے بہت سے ادیبوں اور شعراء کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ لیکن اب انہیں دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں نظیر اکبر آبادی کا قریب قریب فراموش کر دیا گیا تھا۔ لیکن انہیں زندہ کر دیا ہے۔ نظیر کو فراموش کیوں کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ صاف ہے اور وہ یہ کہ نظیر عوام کا شاعر تھا۔ اسے زندگی کے وہ موضوعات پسند تھے جو اس وقت کے ہر معاشرے اور طبقے کے موضوعات تھے۔ عوام کے شاعر کی حیثیت سے نظیر کو عوام کی زبان کو استعمال کرنی پڑی۔ عوام کی زبان کو کتنا اور رذیل سمجھا جاتا تھا۔ اور اب نظیر کو جو زندہ کیا گیا ہے، تو یہ اس کے شعور کی ہدف ہے، جو عوام کی جدوجہد اور نئے معاشرے کے تصور سے پیدا کیا ہے۔ یہاں ایک بات سے جو بات ہے کہ جیسے جیسے تاریخی کا شعور اور تہذیبی ترقی کے شعور بڑھتے جاتے جاتے ہیں بہت سے ادب پائے زندہ ہو جائیں گے۔ جنہوں نے ترقی پسند علامات کا حاملہ کیا۔ اور وہ ختم ہو جائیں گے جنہوں نے رجعت پسندی کی پالیسی۔ یہ درست ہے کہ ہر دور کی ترقی پسند روایات ہی کے حاملہ ہوتے ہیں۔

ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخیلِ اختر میں

اردو شاعری کی روحانی تحریک مرحوم اختر شیرانی سے کچھ اس طرح وابستہ ہو کر رہ گئی ہے کہ دونوں کی ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اختر نے اردو شاعری کو وہی کچھ دیا ہے جو اٹھارہویں صدی کے روحانی انگریز شاعر کیشنگر پری شاعری کو دے سکا ہے۔ وہی خلوص و مصیبت، وہی واقعیت و جذباتی شدت امدادی اور فکری و خود پسندی جس سے وہانی کے بعد اختر دوسرے شاعر ہیں جن کے یہاں شری انکاس کے پس منظر میں طوائف کی بجائے ایک حقیقی جتنی جاگتی عورت کے خدو خال نظر آتے ہیں۔ بلکہ عاشقانہ جذبات کی نوعیت و اظہار میں وہ حسرت سے بھی کچھ لگاک ہی نظر آتے ہیں۔ حسرت کی محبوبہ عام طور پر ایک پابند رسوم، قیود عورت ہے۔ اور کہیں کہیں تو وہ شہزی زمر عشق کی بیرون بھی بن جاتی ہے۔ مگر اختر کا شور عشق عربی اور ہندی شاعری سے متاثر ہے۔ یہاں عربی شاعری کی "بنت عم" کا رنگ ہمیں شاداب فضائل میں پہنچ کر لکھا۔ شہزی زمر عربی شاعری کا اختیار کر لیا ہے۔ جو اختر سے پہلے ہمیں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ اختر کے ہاں عربی شاعری کی دہکاء جزاات اور دہانہ اظہار کے ساتھ ساتھ ایک ایسی مستقل طور پر سگنے والی کیفیت بھی پائی جاتی ہے جو ہندی شاعری میں عام ہے۔ اختر کی یہ خصوصیت ایک ایسا موڑ ہے جہاں اگر اردو شاعری ایک نئی راہ اختیار کرتی ہے۔

جس زمانے میں اختر نے شاعری شروع کی اس زمانے میں شعروں کی تمام فضائیں اقبال کے نعروں سے گونج رہی تھیں اردو کے اکثر شاعر کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی رنگ میں اقبال سے متاثر تھے۔ اس دور میں میں صرف دو تین شاعر ہی ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی شاعرانہ انفرادیت کو قائم رکھا۔ اور اس ہمہ گیر سیلابِ نور کے درمیان بھی اپنے شعری انکاس کے چراغوں کو تیرے رونق ہونے نہیں دیا۔ اختر اپنے دوڑ کا بہت بڑا شاعر تھا اور ہر دور میں اس کی تاریخی اہمیت واضح رہے گی۔

اس جواں مرگ شاعر نے آج سے چار سال پیشتر ۲۹ ستمبر کو انتقال کیا تھا۔ ان چار برسوں میں قمر تنکین صاحب کی مخلصانہ کوششوں سے دو مرتبہ یومِ اختر منایا گیا اور دونوں مرتبہ ان کی یادگار قائم کرنے کی قراردادیں بھی منظور کی گئیں۔ مگر کوئی یادگار قائم نہ ہو سکی۔ پچھلے دنوں حکیم نیر داس علی صاحب نے اختر کے مقامی احباب کو اپنے ہاں بلایا تھا کہ اختر کی یادوں کے دئے سے محفل کو کچھ دیو کے لئے روشن کیا جائے۔ حکیم صاحب اختر کے نہایت عزیز دوست تھے۔ اور انہی کی توجہ سے اختر کا کچھرا ہوا کلام شائع ہو کر محفوظ ہوا ہے۔ ہمیں تو قہ ہے حکیم صاحب ظہیر کا شہیری صاحب کی اس اہم تجویز کو ضرور عملی صورت دیں گے۔ اختر کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مٹھوس مقالات فراہم کر کے انہیں کتابی صورت میں چھاپا جائے۔

(ایڈیٹر)



اختصاصی

چاروں کی چھاؤں میں

مردم اختر شیرانی نے اپنی زندگی میں کئی ایسی نظمیں لکھی ہیں جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ذیل کی نظم میں گو وہ روحانی شدت موجود نہیں جو ان کی شاعری کا خاص رنگ ہے مگر اسے اس لحاظ سے ضرور اہمیت حاصل ہے کہ یہ شاعر نے اپنی موت سے صرف چند روز پیشتر لکھی تھی اور اس میں اس تنا کا انکار کیا گیا ہے جو اس وقت ان کے سینے میں موجزن تھی۔ (ایڈیٹر)

کشمیر کی حسین بہاروں کی چھاؤں میں
شمشاد و سرو گل کی قطاروں کی چھاؤں میں
شاخ و جھر کے نغمہ سازوں کی چھاؤں میں

بلی سے جھانکتے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں
آمر ہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

امید و صل ایک فروغِ خیال ہے
یہ دلکشینِ خلش و غلش بے مال ہے
اس زندگی میں ساتھ رہیں ہم محال ہے

سناک تھینہ ساز ستاروں کی چھاؤں میں
آمر ہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

چھایا ہوا ہے ابرا ہما خوش گوار ہے
موسم ہے بخودی ہے چمن ہے بہار ہے
اس آخری خوشی کا فقط انتظار ہے

سرو گل و سمن کے قطاروں کی چھاؤں میں
آمر ہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

اچھے بڑے زمانے کا اب انتظار کیا
ہم غمزدوں کے حق میں خزاں کیا، بہار کیا
ہاں اعتبارِ ہستی بے اعتبار کیا

امیدِ خس ہے غم کے شراروں کی چھاؤں میں
آمر ہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

کہتے ہیں ترسکوں سے بہت محفلِ عدم
آزادی کشائشِ غم حاصلِ عدم
آہلِ پریش جہاں سے سوئے منزلِ عدم

اس نکشاں کے ماہ گزاروں کی چھاؤں میں
آمر ہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

آجا کہ بعدِ مرگ تو آرام مل سکے
تسکینِ دردِ حنا طرنا کام مل سکے
درمانِ جو رہ گزشتہ ایتام مل سکے

اُس رات بھرے افق کے کناروں کی چھاؤں میں
آمر ہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

اس خاکداں سے دوڑے ہاک خاکِ مانی نیا
دنیا نئی، زمین نئی، آسمان نیا
چھوڑ اس جہاں کو چل کے بسائیں جہاں نیا

پروین و شتری کے دیاروں کی چھاؤں میں
آمر ہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

زہر آہِ سدا کا پینا نہیں مستبول
تیرے بغیر بادہ و مینا نہیں مستبول
دوری کے صدمے چھیل کے جینا نہیں قبول

مناستبول ہم کو بہاروں کی چھاؤں میں
آمر ہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

غزل

یوں تو کس پھول سے رنگت نہ گئی، بو نہ گئی
 اے محبت! مرے پہلو سے مگر تو نہ گئی
 مٹ چلے مری امیدوں کی طرح حرفِ مگر
 آج تک تیرے خلوں سے تری خوشبو نہ گئی
 فصلِ گل ختم ہوئی، رنگِ سخن خواب ہوا
 میری آنکھوں سے مگر میری سخنِ رُو نہ گئی
 کب بہاروں پہ ترے رنگ کا سایہ نہ پڑا
 کب ترے گیسوؤں کو بادِ سحر چھو نہ گئی
 تیرے گیسوئے معنبر کو کبھی چھیڑا تھا
 میرے ہاتھوں سے ابھی تک تری خوشبو نہ گئی

میرے دوست

قاصد جلالہ نگار صاحب نے لکھا ہے۔

دو گروے ہوئے دوستوں کی یہ باتیں وصیت کی طرح چند پندوں پر لکھ رکھی تھیں۔
 لاف کے یہ پند نہ پٹائی مدی میں گھل مل گئے تھے۔ لیکن اب جو ادب لطیف کے
 تقاضوں کی پٹائی سر سے گزرنے لگا تو میں نے اپنی پندوں کو اپنی کوتاہی کا تاجان بنالیا۔
 قاصد صاحب نے ایک طویل حرفے کے بعد اپنے خاص رنگ کی ایک چیز دکھی ہے اور یہ غسر
 ادب لطیف کو حاصل ہے کہ وہ اس چیز کو اپنے صفحات کے ذریعے مستطیع عام پر لا رہا ہے۔
 ہم سمجھتے ہیں اور ادب کی یہ بھی ایک بد قسمتی ہے کہ اردو کے بعض ادبے درجے کے مصنف دو تین
 کتابیں یا چند صفحہ میں اردو ادب کو دے کر اپنی زندگی کی دوسری صد فیصد کی تذکرہ دیتے ہیں۔ ہمارے
 ادب کو اب ان کا کام آتا۔ بخاری پطرس اور قاصد جلالہ نگار سے اگر شکایت ہے تو اسے بجا شکایت نہیں سمجھنا چاہیے۔
 ہم محترم قاصد صاحب کا ولی شکر یہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے تقاضوں کو قابل اعتنا سمجھا۔ مگر
 ادب اردو جوان سے مسلسل اہرا کر رہا ہے اس کی طرف سے اس میں توجہ دینی چاہئے۔
 قاصد صاحب کہہ سکتے ہیں کہ میں ہندوستان میں اردو کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ سب
 اہم کام ہے۔ یقیناً اس کام کی اہمیت سے میرا انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قاصد صاحب کی
 تخیل اور بصیرت اسلوب کے ان جوان ہر پاروں سے بھی ادب کے نرسانے میں اضافہ کرتے رہیں۔
 ان کی زندہ جاوید تصنیف "پیلے کے خطوط" کا دامن بھر رہا ہے۔

ایڈیٹر

(۱)

کچھ لوگ دنیا میں تھا آتے ہیں، وہ جب ماں باپ کی گود میں ہوتے ہیں تب بھی تہا ہوتے ہیں۔ جب در سے ہم سب کے ساتھ ہوتا
 میں تب بھی تہا ہوتے ہیں، جب جوانی کا گرم خون ان کی رگوں میں دوڑتا ہے تب بھی تہا ہوتے ہیں اور جب ان کی زندگی ختم ہوتی ہے
 تب بھی وہ تہا اپنے لیے سفر کی تیاری کرتے ہیں۔ ان کی زندگی اہل خیال کے ساتھ بھی تہا گنتی ہے۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ ہر لمحہ
 طرح بسر ہوتی ہے۔ وہ سرتوں کے چھلکے اور غلوں کے جھوم میں تہا ہوتے ہیں۔ جب زندگی ہنستی ہے تو وہ بھی کبھی ایک نئی شکل میں ہنستی ہے
 میں جس کا مطلب کچھ نہیں ہوتا۔ اور جب دنیا روتی ہے تو ان کی سچ میں کچھ نہیں، تاکہ کیوں روتی ہے۔

(۲)

میرا دل سنت تھا۔ اس کا دست تھا۔ اس کے پاس میں تیر تیریں نہیں وہ تھا اور گئی کہتے ہیں بروہی دھیر کر کے اس کی تہائی اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہاں پہے گاؤں میں کچھوں کے کناہے ایک کے مکان میں بنا کر تھا۔ اس سے نارغ ہو کر یہاں اس گاؤں میں آیا تھا۔ اور پھر کچھ گاؤں کے باہر نہیں گیا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے سنا کہ اس نے شادی کر لی۔ اور پھر یہی سنا کہ وہ ایک بچے کا باپ بن چکا ہے۔ دوسری جگہ کے ہنگامے کے بندوبست و ماسکوں نصیب ہوا تو وہ مجھے یاد آیا اور وہ ہے اختیار می چاہا کہ پھر ایک دفعہ میں اسے اس کی گھر پر زندگی میں دیکھوں۔ وہ مجھے گاؤں کی جھل کے کناہے بیٹھا ہوا تھا۔ قریب ہی اس کی پوری بچہ کو لے جیتی تھی۔ پہلی نظر میں میں نے دیکھ لیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے جتنے قریب تھے اتنے ہی دور تھے۔ میں کئی دن ان کے پاس بٹھرا اور دیکھا کہ وہ شادی سے پہلے میں قدر تھا تھا اس قدر اب بھی تھا ہے۔ میں نے وہاں پھر پڑا تو کہنے لگا۔ میں اپنی بروہی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ بہت کم بات کرتی ہے۔ لیکن میں اس سے محبت نہ کر سکتا یہ ایک انسانی کردار ہے جس سے میری فطرت بیگانہ ہے۔ یا پھر میرا اندھیرا ایسا ہے کہ اسے اس صورت کی محبت کا اجالا بھی کم نہ کر سکا۔ وہ جو دنیا کے اور میرے درمیان ایک اونچی دیوار کھڑی ہے اس میں کوئی ایک دریچہ بھی کھل چکا نہ ہو سکا۔ یہ میرا تصور ہے تو اسے میرا ہی تصور سمجھا پھر میری شادی کے بعد اتنا دھڑلہ مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل و دماغ کی آزادی مجھ سے چھین گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی میرے دل کے خیمے کے خیمے میں ہر وقت بھاگتا رہتا ہو۔ تم ہی بتاؤ۔ اس نے کہا۔ اب میرے پاس کیا باقی رہا ہے۔ اس کے لہجے میں تلخی باطل تھی۔ صرف ایک ناقابل بیان احساس اور تسکین تھی۔ وہ کہنے لگا۔ زندگی تو ایک طویل فریب ہے۔ پھانسی بازی ہے ایک ہلاک ہے۔ میں نے اپنے فکروں کو دھوکہ دینے میں مصروف رہتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ یہ بھی کوئی زندگی ہے!

(۳)

وہ سال بعد میں نے اس کے بچے کے مرنے کی خبر سنی۔ اس ایک ہی جیسے بعد میں اس کی پوری کے جنازے میں شریک تھا۔ موت کی پرچائیں مرنے والے کے گھر سے چلی جاتی تھیں۔ مگر میرا دوست خدا اپنے غم کے سکون میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ابھی کسی باہر گراں کو اپنے کندھے سے اتار کر سہارا دے رہا ہے! اس کی گھڑی جوتی تہائی واپس آگئی تھی۔ کہنے لگا۔ سنئے ہو، سنا ہی اچھا جب آپ بگل کچھ صحنوں کو توڑ کر سکون کا حال ہو چکا ہے۔ اس کی انسان ایک ہی قدم اٹھا کر یہ سر پہاڑ کے لئے اور اس درمیان اس طرح ڈوبے کہ پہلے آپ پر ایک بھی لہر نہ بن پائے!۔ سنئے ہو! میں نے کہا۔ ہاں۔ ماضی اور خون تھا اسے جسم میں تھا مگر تم اپنے ساتھ زندگی نہیں لائے تھے۔ موت کو تم گود میں لئے پھرتے رہے۔ اور کسی دن موت آپ پر گری ہو گی۔ آخر آئے کیوں تھے، جیسے کیوں گئے تھے اور اپنے سر کو ایک جھٹکا دے کر خاموش ہو رہا۔

341062

(۴)

وہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ مجھے میں نے کوئی گزرتی ہوئی پرچائیں دیکھی تھی اور نہ اپنے سے محبت کر سکتا تھا نہ دوسروں سے۔ اس سلسلہ کی تسکین میں فتنوں کے خاندان کا برقرار اس ایک خاندان سے بندھا ہوا ہے۔ وہ بندھا رہنا چاہئے یا نہ چاہئے۔ لیکن جب وہ ایسا نہ چاہے تو اس کی توجہ کو کس طرف دیا جاتا ہے جو میرے دوست کا تھا۔ ایسے لوگ خود دوسروں سے کچھ لے سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو کچھ دے سکتے ہیں ایک غیر آزاد اور غیر آزاد کی طرح وہ زندگی کے سمندر میں نامعلوم ڈھلے رہتے ہیں۔ تا آنکہ کسی دن طوفان کی کوفی موج انہیں غرق کر دیتی ہے اور سمندر

انہیں نکل جاتا ہے۔ سمند کے مساوا درملاح اس کے وجود سے بے خبر گزر جاتے ہیں۔ اپنی خبر نہیں ہوتی کہ کتنے ایسے جزیرے سمند میں ڈوب جاتے رہا کرتے ہیں۔ اور کتنے ہی ایسے جزیرے سمند کے اندر سے ابھرتے بھی رہتے ہیں۔ وہ ابھری تب اور غرق ہو جائیں تب انسانی زندگی کی قدروں میں ان کا شمار نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایسی ماکائی ہوتے ہیں جو کسی دہائی کے قریب نہیں پہنچتی!

(۵)

ایک دفعہ بیٹی کے نواح میں سمند کے کنارے میں ایک بستی میں اپنے کسی فلا سفردوست کے پاس مقیم تھا۔ وہ ہر روز میرے ساتھ تفریح لاکوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کیا کرتے تھے۔ ایک دن طے ہوا کہ ہم کشتی میں سمندر کی سیر کریں گے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد تیز ہوا چلنے لگی اور سمندر میں توج شروع ہو گیا۔ میں نے کہا اب تو یہ میرے لطف ہوگی اور مادہ ترک کر دیا۔ بہت ہی تعجب کے ساتھ میرے دوست نے کہا کہ کیا اب نہ چلو گے؟ تم کہتے ہو کہ توج بے لطف کر گیا۔ درہن کہتا ہوں کہ اب تو سمندر کی تفریح کا دقت آیا ہے۔ کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ کہنے لگے کہ اگر کوئی کام کرنے کے قابل ہے تو پھر پوری طرح کرنے کے قابل ہے۔ سکون ہے تو بہر حال توج بہتر چیز ہے۔ کوئی کام کرنے کا ہے یا نہ کرنے کا ہے اس کا فیصلہ تو ہی شخص کر سکتا ہے جو کام کرنے والا ہو۔ جن لوگوں کی زندگی مستقل دھند لکا ہو، دہاں چراغ جلائیں تو تاریکی چراغ کو کھا جاتی ہے۔ اس پیمانے کو معلوم ہی نہیں کہ کوئی کام کہاں ہے جس کے متعلق یہ وہ فیصلہ کرے کہ اسے کرنا چاہئے یا نہیں، وہاں تو ایک خلا ہے بیٹا ہے جس کے پھیلاؤ میں تنہائی اور بے عملی کے سکون کا ایک ایسا فلسفہ پھیلا ہوا ہے جو موجود سے حرکت کی طرف جانے ہی نہیں دیتا۔ پھر کہنے لگے، کیا تم اپنی سی بات نہ سمجھ گئے کہ سمندر کی میر زیادہ ضروری تو اسی دقت ہو جاتی ہے جب سمندر طوفانی ہو جائے! یہی تو زندگی کی وہ بے چین قوت ہے جو سمندر کے طوفانوں میں سامانِ نشت و تلاش کرتی ہے، انسانوں کی قیمت مقرر کرتی ہے، اور غیر آباد جزیروں کو آباد کرنے کا ارادہ کرتی ہے کتنے ہی چراغ گل ہوتے رہیں وہ ہر چراغ کے بعد دو سرا چراغ دشمن کرنے پر آمرا کرتی ہے۔ اس کی کشتی کے تختے کتنے ہی ٹرے اور کمزور ہوں، لیکن اگر وہ ایک لمحہ بھی کسی موج کا راستہ دوک سکیں تو زندگی کا یہ ایک لمحہ بھی کیا کچھ کم ہے!

رنگینی نخیل اور حسن نگار ش

اپنی پوری بلندی پر

تین پیسے کی چھو کری

قاضی عبدالغفار کے معرکہ آرا افسانوں کا مجموعہ

قیمت: ایک روپیہ آٹھ آنے

مکتبہ اردو بک ایلو

اس وقت اس کی بھوپھی مٹی اور اس کے پاس گر بڑے پیار سے مٹی کی تارو بٹیا۔ کہاں رکھیں؟
 کیا؟ "رحمان نے حیرت سے پوچھا۔

اور بھوپھا گر جا۔ تیری ماں کے ختم۔

"دو پے میرے بچے، دو پے۔ اس کی بھوپھی فضا بولتی۔ "تو بتا دو تو میرا میں ان میں سے ایک دو پیر دسے دوں گی۔ کہاں رکھیں؟
 میں؟ بھوپھی کی کوٹری میں تو نہیں کہیں؟"

رحمان کچھ کہنے کے لئے اپنے جیسے بوجے ٹھٹھک ہونٹ ابھی کھول ہی رہا تھا کہ اس کا بھوپھا چارہاٹی پر سے اٹھا اور مٹی کو ہاتھ کے پتے سے پیچھڑھکیل دیا۔ تیس گھن گھن ٹانے سے کام نہیں چلے گا۔ سن بے رحم سے تو نے میری واسکٹ کی آغوش میں سے زیادہ دیکھ کر ہنسنے لگا۔
 نکالے ہی۔ وہ سیدھی طرح ماں میرے ہاتھ پر لکھو سے درد میں بیٹھ کر تفریق بنانا لگا۔ بتا۔ اس نے رحمان کو چڑھانے کے لئے ایک ہاتھ تان لیا۔

رحمان بگڑے میں جھنسا پڑا کاغذ کا پرزہ جو رہا تھا۔ پلکیں بند بھپا۔ رہا تھا۔ جیسے آنکھوں میں مٹی ٹپکس گئی ہے۔ ہونٹ کھینچتے دیکھتے دیکھتے
 نکلائی نگ میں سے غلاب غائب ہو گیا تھا۔ صرف میل باقی رہ گیا تھا جس اتنا کہ سکا۔ "کون سی واسکٹ؟" اور بھوپھا ایک دم اس کی اجڑی ہوئی آنکھوں
 میں آنسو پھیل گئے۔ اس کا نیچے والا ہونٹ ذرا سا ٹپک گیا۔ ٹھوڑی میں چہرے شکنیں پیدا ہوئیں، ہتھکے پھوٹکے اور وہ تار تار روہنے لگا۔
 "کون سی واسکٹ؟" بھوپھیوں آگے بڑھا۔ جیسے اسے روہکر نکل چلے گا۔ "ابے وہی سیپ کے بیٹوں والی اور کون ہی؟"

اور رحمان نے بھوپھی کی طرف دیکھ کر روتے ہوئے بہت اور کئی آوازیں فریاد کی۔ "مجھے خدا کی قسم، مجھے بی بی کی قسم، مجھے بی بی کی قسم
 بھوپھی۔ میں نے واسکٹ کو چھڑا ہی بدترینے ہاتھ۔"

گر بھوپھی پک کئی آواز اپنے شہر سے ملتی۔ سیپ کے بیٹوں، واسکٹ کہاں رکھی ہے؟ میں نے تو وہاں صحت والی واسکٹ دیکھی تھی۔
 پھر رحمان کو تھا چھڑک کر دونوں اندر جھانکے۔ ذرا سا دیر کے بعد اپنے تو بھوپھی کو دیکھتی تھی۔ خواہ مخواہ میرے پیچھے ہٹ گئے تھے نہیں شرم
 نہیں آئی؟ اپنے دوپے ایک ہار چھڑکی۔ ہمارے خاندان نے قتل کئے ہیں پر چوری کبھی نہیں کیا۔ ایک دو پیر اور لاوا۔ میرے
 بچے کا انعام ہے، خواہ مخواہ رلا دیا ہے چائے کو۔ لے کے کھانا حوام کو ڈالا۔ اور صر واد و پیہ۔

رحمان ایک دم خاموش ہو گیا۔ آنسو اس کے گالوں پر نہہ جا رہے تھے کراس کی سسکیاں اسے پکیاں تھم گئی تھیں۔

بھوپھی نے شہر سے ایک مدد یہ چھپی لیا اور رحمان کی طرف بڑھی۔ بھوپھا رلا۔ "کج نہیں تو کل چلے گا۔ مذہب تو ہے ہی ختم ہو گا تو نہ یہ
 ہوتا ہی ہے اچاہے کسی ملک کے لاش صاحب کا رہا ہو۔"

بھوپھی نے رحمان کے پاس آکر اسے اکٹھے بہت۔ سے پیار کر ڈالیے۔ پھر اس کی سٹی کھول کر اس میں دو پیر رکھا اور اس کی انگلیوں کو ہاتھ کے
 اس کی پلاٹ میں۔ وہ سرے ہاتھ کی انگلی پکڑ کر اسے کیٹھڑی سے آئی، جو راکھ کے کھانا کھایا۔ اور جب وہ دوسری روٹی میں سے ایک تھالہ توڑنے
 لگی تو رحمان پہلی بار بولا "نہیں بھوپھی۔ بس۔"

"کیوں؟" بھوپھی نے پیار بھرے غصے سے پوچھا۔
 "ہاتھ بگڑ جائے گا" رحمان بولا۔

میں نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔ اور میں نے اس کی طرف سے کوئی بھی چیز نہیں دیکھی تھی۔

میں نے اس کی ہر بات کو یاد کیا۔ وہ رات کی باتوں سے نکلا اور کہیں لڑائی بات کو ایک کھیت کی بیڑ پر جا کر فدا سا سنتا یا اور
 یہی سوچا۔ یہی کہ اس کا لڑکپنوں پر یہ صوب چمک رہی تھی اور قریب ہی ایک سخت کے شیشہ پر ایک کڑا سینہ چڑھ رہا تھا۔ رملی پٹے تو اس باختم
 پہنچے ہوئے سر پر ایک سیاہ چھوٹے گلابی رنگ کے دھڑکے، اماں، اماں پکارنے لگا۔ کافر پر تک رونے کے بعد اس نے غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔
 "اماں، اماں! وہ اٹھا۔ اس پر ہر گز ایسے کہ اس کی ہاتھ پاؤں کا ہتہ ہوتا ہوا شام سے پہلے گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوا تو ریلوں پر اختیارات لٹنے
 لگے۔ اس کے کسی نے گل نہ دی ہے، لوگوں نے اسے بچان نہ تھا۔ وہ اسے داسا سیتا، شیشے کے گڑبگڑ، ہکرائے گل جلتے ہاں کے گرد بہت سے
 رنگ کے گلے پر گئے جو اسے ہڈی ہڈی سے دھچکے اور میرا اس میں سر گڑبگڑاں کرتے۔ "یہ چارے کی مالہ مڑنی ہے نا پچھلے سال!۔" ہاں تو میری
 ہڈی گڑبگڑ رہی تو ریلوں میں بدلتا تھا۔ "خدا کا تو باپ ہے تاہم اس کا تو باپ ہی نہیں۔" ہاں ہاں! اس نے چارے کا تو
 باپ ہی نہیں تھا۔ اور میری ہڈی سے رملی سے رملی کو دھچکے لگتے جو اب زور نہ دے چکیاں تھیں لگا تھا اور اس کو نہ چھتے پوچھتے اس کے گاؤں کی جلد چھل
 گئی تھی۔ شام گاس کے ہاں راجہ اٹھ لڑا لڑا سا بیٹا، اور ہڈے پر اسے بنایا سکھا اور اللہ فرما دے اسے لپٹے پاس بلایا ہے۔

پہلے تو اللہ تعالیٰ کا خاصا کھانا پینا بڑے سنگ تھا۔ زمینیں میں خاصی تھیں، طبع میں بھی کچھ درجہ حاصل تھا۔ اور سخت علاج کرنے کی وجہ سے وہ
 مریض ہو گیا تھا۔ خداوند شہیدہ اور محمد علی اور روبرو وہاں کو دو۔ کرنے کے لئے اس کے پاس تیرہ ہفت قہیزہ اور دم تھے، پھر وہ بولا بختہ گزارتھا اور
 سلطان حسین خاں پر بھی میں تو وہ بیکار تھے۔ روزگار سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اصل میں دو گھوڑے میروں سے موجود تھے بکھر کے تھے مودا صفت خود
 فریاد تھا۔ لیکن ان گھوڑوں سے اسے اتنی محبت تھی کہ ان کے لئے کم دلم دو خدا سنگار تو ہمیشہ موجود رہا۔ ارشاد ہے جب نابہ اللہ نواز کے پاس آیا تو
 اس وقت غازی شاہ کی مثال پڑا کہ اس کی میٹھک میں جمع ہو گئے تھے۔ سب کے سامنے اس نے رحمان کے سر پہ ہاتھ بھیرا اور بولا: دیکھو بیٹا۔ تم
 جیسے یہ یوں پھوٹ پھوٹ کر ہو ڈکے تو ڈکے ڈسے کہ خداوند غنی ہے اس گاؤں کو غرق ہی نہ کر دے، تمہارا باپ مرا تو اس میں غلوں والوں کا کوئی قصور
 نہیں تھا۔ تمہاری ماں بھی یہی تھی اس کا قسمت کا ایک تھا یہ سب کام خداوند قائل ہے میں جو پڑ پڑ یا ز اور بے پرواہ ہے اس لئے خدا کے لئے امانہ ہو
 کہ خدا میرا اس بے قصور گاؤں پر ڈکے۔ میں مارے گاؤں کی طرف سے تمہارے سے منسوب پچھنے کو تیار ہو، یوں کہ وہ کہیں میرے اصل میں رہو،
 تمہاری نوکری سے کہ گھوڑوں کے لئے ان حفاظ رہیں، اور وہ گھوڑے بید کیوں تو بدحرم بھاؤ ڈکے سے اصل کو آئینہ بنا دو، اس نوکری کے
 ہاتھ میں ہر شے کا کھانا نام میرے گھر سے کھانا آئے؟ اور یہ سے سال میں ایک۔ ہزار تھیں میرے بچوں کی اتنی بھی ملتی رہتی، سو میں
 حسین شاہ تھا تھا بھی نہیں دیکھتا تھا۔ باقی راج کا کھانا ترس کا انتظام بھی یوں ہو جا۔ بگا کہ میرے خاندان کے جتنے بھی گھر ہیں، ان کے
 ہاں کھانا لگا کر ابھر گھوڑے پر بھی لگا کر واداس۔ سب پہ لیشیں پیاں ہیں۔ ناٹن میراٹھ گئے تو کورٹا فٹے، غازی دھڑ سے یہ فائدہ ہو گا۔
 کہ گویا میں نے نہیں، اتنا سا کام ہے، تم اس گاؤں کے بیٹے پر اور تمہارے سر پہ ہاتھ رکھتے میرا فریق سے کیوں بھی، کیا غلط کہا میں نے؟
 غازی نے اس تمام وہاں میں راجہ اللہ خان کی سخاوت سے اتنے سا ڈھیر کئے تھے کہ بعض بقیہ القرب لوگوں پر رقت تک چھا گئی ایک

لے ماجرہ لٹھا تو دیکھا کہ لٹھا لٹھا کر ڈھلا۔ رحمان کو ایک شخص ایک طرف لے گیا۔ وہ مجھ اسٹیشن کے کمرے کے کھانا کھا رہا تھا جس میں وہ لٹھا لٹھا کر رہا تھا۔ رحمان کا منہ بھی بڑی روپیہ تازہ ماس ہے۔ آٹا مٹا کر دھیریں کا مٹھا یا کھانا اور پھر شیشک میں جا کر ماجرہ لٹھا لٹھا کر لے گا۔ جی جی سے دھیریں لے گا۔

”راجہ اللہ نواز مولا بہ بہت عجیب تھا۔“

رحمان نے جڑی معصومیت سے کہا: ”جی میری نوکری ابھی سے تنگ نہیں کہہ سچ گئی؟“

راجہ اللہ نواز اور دوسرے مقامی شخصہ گے۔ راجہ دہلا : "ابھی سے کہ گئی ہیں :"

اور رحمان نے اسی امتداد میں کہا: "تو ہی پھر جانے کہ چھوڑا کمان رکھا ہے۔"

منازی دوندہ دوندے بہنے لگے مگر راجہ کشن دھار خجیہ ہو گیا۔ پھر اس نے کندھے پر سدا سائیلہ دو مال اٹا کر اچھڑا کر چکر مارا۔

میں نے اپنے والد کو دیکھ کر ہلکا سا ہنسیں دیتے ہوئے کہا: "میں نے فائدہ کما لیا۔ تمہاری ڈگری میں مل گئی۔"

مگر وہ علین کی منطق کا سلسلہ جاری تھا۔ نواز بولا: پیر کھانا تو مجھے ابھی سے ملے گا ہے جی۔

راجہ لٹل ناتھ کے ہرٹ اس کی داڑھی اور موٹھن میں سے نکالے گئے درودہ زار فارم دے گا۔ اسے بجاؤ۔ اس نے خود سے ہرٹ کیا۔

آپ نے کہا کہ ہمارے ساتھ رہنا۔ اور نہ مجھے ٹھہرنا کہ ابھی مجھ کو پتہ نہیں ہے کہ وہاں کیا ہے اور یہ تمام باتیں بھی مجھے جانتی ہیں۔

جادو، جادو، کلمہ پڑھ کر دلم سے سو جادو، بڑوں سے بہت دلیل بازی نہیں کرتے، خداوند تعالیٰ احقابو جاتا ہے۔“

۱۔ ایمان نے سہاگہ فطرت تعالیٰ اس سے خوش رہی کب تھا اب تھا ہوگا۔ اور جانے خداوند تعالیٰ کی بات کی بات پر یحییٰ کی

طرح کہوں خواہر جانا ہے، آخر رحمان نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ اس نے تو کبھی کسی کو گالی تک نہیں دی۔ اس نے تو زندگی میں صرف ایک بار یہودی کاٹا۔

اور وہ بھی ایک آنے کی پینسل کی۔ پھر جب استاد نے اس کی پہنچ انگلیوں کے درمیان چار پینسلیں رکھ کر ان انگلیوں کو دایا ہفتا تو اس نے ہنسی کو روک دیا۔

ہوں دیا تھا: ”میری بیٹی مظلوم حسین کی ہے؟“ پھر اس نے زوال تک کو ساری بات شروع بتا دی تھی، اور ماں نے کہا تھا کہ اگر رحمان نے پھر کبھی

جوری کی قومہ اسے تیس دھاریں نہیں بچھے گی اور جس بچے کو اس کی ہال تیس دھاریں نہ بچھو، سامی عمرہ گوں کی شوگرین کا تادم ہے اس کے بعد

آج تک اس نے کوئی چوری نہیں کی تھی لیکن وہ لوگوں کی عشا کی تو اب تک کھا سکا تھا۔ تو کیا ماں نے مرنے سے پہلے اسے تیس دھاریں بخشیں

بخشی تھیں! اماں، کاتن، بھٹماں! وہ غصے میں پکارا اٹھا۔ اور پھر رونے لگا۔ اور اپنی روتے روتے سو گیا۔

صبح کو اہل میں بھاؤ ڈسے سے لیز جمع کرتے ہوئے اسے ملن یاد آگئی، ایک ہانکے کو سینے کے لئے جب وہ گلاب ناز چاہتی تھی تو اسے گھٹے

کوٹاڑھا کرنے کے لئے اس میں گھوڑے کی بیلانے کا خیال آیا۔ ٹوکر سر پر رکھ کر وہ ساجے گاؤں میں گھوم آئی مگر وہ کہیں سے یہ سننے لگی

ہر جگہ سے یہی جواب ملتا تھا کہ آج وہ بھی مہرا جا رہے ہیں۔ بعض سگھر گھرنے تو یہ کہ خشک کر کے اس سے ایندھن کا کام لیتے تھے۔

آج رحمان کے پاس ڈکروں لید جمع رکھی ہے مگر میں جو گاڑنا سیکے۔ فوراً اس کمرہ زمین پر اپنا کوٹھا ابھرا اور وہ پہاڑا پتھر کی طرح زمین پر گر پڑا۔

نکا، جب وہ اپنے اس کوٹھے کے سامنے پہنچا جس میں اس نے زندگی کے ساتھ برس گزارے تھے۔ تو یہ دیکھ کر اس کی باہر کی سانس باہر اڑا دی۔

اندر رہ گئی کہ کو بچے کی حجت گر چکی ہے اور ٹوٹی ہوئی دیوار پر دو تیاں آئے تھے ساتھ ساتھ دو تیس پھیلے غزا رہی ہیں۔ یہاں پہلے انکار میں غمزدگی

[illegible]

ایک روز ایک کراٹ کرکٹ کھلاڑی کو ایک بولنگ کرکٹ کھلاڑی نے پھینکا۔ بولنگ کرکٹ کھلاڑی کا سونے کا ہاتھ تھا۔

نوٹ کوٹھی میں بند کر کے اور ڈاک سے کوہ میں چھوڑ کر وہ بھاگا اور اسٹیشن کے ایک کونے میں دیک کر بیٹھا گیا۔ پھر اس نے اپنے منہ کی زبان کھول کر یہی
نوٹ کے پر میں اور موتق پاتے ہیں وہ پھر سے شجائے گا۔ مٹی کا ایک بار پھر مٹی سے بند کر کے وہ لپکا اور مٹی میں تو ہندوں اور غریبوں کے ڈھیر کے پاس
جائو رنگا گندھوں پر سے غریبوں سے بھرے ہوئے گھرے تاکہ جامعے تھے۔ اور وہ میرا بتا رہا تھا کہ آسنے جانے والے پر لاد دیو اس سے ملک
لگ کر گزرتے تھے۔

نیل، پیارے نیل

ابھی میزوں پر موسم تیاں نہ سشن نہیں ہوئیں۔

ابھی بال روم کے سٹنڈ انوں پر شام کی سرخی باقی ہے۔ آؤ وہاں بیٹھتے ہیں۔ اُس کوئی نہیں۔ جہاں میز پر کاسی کا پھول دان رکھا ہے اور جس میں صرت بوکس کی ہنسیاں ہیں۔ پتل دی کس ہنسیاں، کوئی پھل نہیں، کوئی سوتیا اور شکر لیا نہیں۔ آج ہم کچھ جلدی آگئے ہیں۔ بال روم میں بہت کم لوگ بیٹھے پیاسے وغیرہ پی رہے ہیں۔ اور ابھی میزوں پر موسم تیاں خاموش ہیں، اور روشنی کے انتظار میں بھی ہیں۔ ہمیشہ اسی وقت تیار ہوں جب میزوں پر موسم تیار کے غنہ غنہ شے نما رہے ہوتے ہیں اور بال روم کے وسط میں، طائف اور بیضوی فرش پر اپنی ونٹرز کا ہپانوی ہندی یا شمالی رقص شروع ہوتا ہے۔ اس وقت لوگوں کے چہرے بے حد چمکے اور دم دکھائی دیتے ہیں، اور اپنی ونٹرز کا نیم عریاں پیسید جسم دھیں سپاٹ سٹاک کی سرخی میں فرش پر آتش پارے کی مانند حرکت کر رہا ہوتا ہے۔ ڈانس پر دم اور پرسکون اندھیرے میں موسیقی جیسے پہاڑی جھنڈ میں سے اچھل اچھل کر سنگ مرمر پر گڑھی ہوتی ہے، اور باہرات سر ہوتی ہے اور اندھ فضا چائے، سگریٹ، شراب اور فرنی، انگلش، ہندی عطریات کی گرم دھندل جھل بوری ہوتی ہے۔ اور اپنی ونٹرز کا ہپانوی رقص شروع ہوتا ہے۔ اپنی انگلش عورت ہے۔ وہ بڑے بڑے بعدے اغاز میں ہپانوی رقص کی نقل اتارتی ہے۔ ہپانوی رقص — چھتارے، بھرے ہراتے ہوئے گھنگھریالے سیاہ بال، پھول دار سائے اور چھوڑ کی تال پر دھڑکتے، رکتے، گرتے اور سنبھلتے ہوئے سانوے جسم، اندس کے پھول، سرخ گلاب کے پھول اور الجھرا کی محرابی شہ نشینوں پر جھکی ہوئی انگور کی سلیں، اور غناطہ کی رادیوں میں سر شام کو گنجنے والے پرمابوں کے اودامی گیت — کہاں ہپانوی رقص اور کہاں اپنی ونٹرز! کہاں اندسی سرخ گلاب اور کہاں لندن کی گوی! پھر بھی جب اپنی ونٹرز ناچتی ہے تو اس کا اودھ کھلا سینہ، عریاں پیٹ، نیم عریاں رانیں، پنڈلیاں بازو، گال، آنکھیں، بھنویں، تیز اور تکیں بھنویں، جسم کا ایک ایک حصہ، ایک ایک عضو ناچنے لگتا ہے۔ غر کتنے لگتا ہے، اور بال میں مختلف آوازوں اور تیز سیشنوں کا شور گونج اٹھتا ہے۔ ایک میز پر وہ تماشا بین بیٹھے ہیں جو میرا منڈی جانے کی بجائے بال روم میں آگئے ہیں۔ وہاں سے ایک لمبی فحش نائے کے بعد آواز آتی ہے

”جیو من ونٹری جیو.....“

دوسری جانب کوئی ٹیکساؤ کتب خانہ کی طرح جھج اٹھتا ہے

”یا جیو.....“

اور پھر ایک آواز — IF WINTER COMES

پھر دوسری آواز — IF ANNE WINTER COMES CAN SPRING BE FAR BEHIND

پھر تیسری آواز — NO, NO, NO

اگر اسی جگہ بیٹھا جائیں۔ یہاں نسبتاً خوشی ہے، اور گھٹاں میں روکپش کی تاک تہنیاں ہیں، اور ابھی زیادہ لوگ نہیں آئے، اور موسم بھی اچھا ہے۔
 تھے شعلہ بیدار نہیں ہوئے۔ آج میں یہاں اس ہیں، اور چاہتا ہوں یہاں کوئی دکانے، کوئی سپنائری دکان نہ ہو، اور کوئی موسم بھی بد نہیں ہوگا۔
 پہلے سے کہ نہ ہوگا۔ ابھی لوگ آنا شروع ہو جائیں گے، ابھی یہاں کھڑے ہونے کو بھی جگہ نہ ملے گی، اور پھر فضا میں سگڑوں کا دھواں۔ چکیوں کی
 برائی جانے والی شراب کی پو اور بے حکم قبضوں، بے معنی باتوں اور تیزیشیوں کا شور ہی شور ہوگا اور کچھ نہ ہوگا۔ یہاں جب آدمی شور سے گھبرا جاتا
 ہے تو پہلے سے زیادہ شور مچاتا ہے۔ اور عجیب پہلے سے زیادہ شور مچاتا ہے۔ اور میری دکان میں اور میری دکان میں، اور
 ڈانس پر عجیب قسم کی سرکشی شروعات ہو جاتی ہے۔ اور پھر میں دیکھ دوں گا کہ کتنی ہوتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ سب کچھ چلا جاتا ہے جو اس سے
 پہلے تھا۔ لیکن روکپش کی تہنیاں گھٹیں ہیں، اسی طرح جھکی رہتی ہیں۔ اور پھر موسم جی کا شعلہ دیکھو دیکھو جھللاتا رہتا ہے۔

سرود انجیر اور گرم روشنی ——— ظالم اور پرستگاری دینی روشنی !

یہ کلپش کی کس تپیل کے پاس موم تہی کھدشن دیکھ کر مجھ یوں لگتا ہے جیسے بہان کی گرتی روت میں بند کرے میں آگ کے پاس بیٹھا
کسی بے بسی موسیقار سے بچپن کا کوئی آواز گیت سن رہا ہوں۔ جیسے بچپن کی پہاڑیوں میں اُگی ہوئی سبز چائے پینے کے جلد پاشپ میں ایرن نمود
کا خوشبودار مادہ تلخ تھا کہ بھر رہا ہوں۔

یو کلیش اور موسم تہی !

نہنوا اور اجشا!

سقراط کے لیکچر اور دہن کے آئینوں

یوکلپٹس کا درخت سکند کی فوج کے ساتھ آیا تھا۔ سکند کے محلے کا ہندوستان کی سرزمین پر اس سے زیادہ اہم کیا اثر ہو سکتا تھا۔ کہ اس کے جاتے ہی یہاں یوکلپٹس کے درخت اگنا شروع ہو گئے۔ یہ بڑا خوبصورت درخت ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ جزیرہ سلاویز کی نیلے ستاروں والی نیم گرم چمکی باتوں میں سرد کے درختوں میں لیے چوڑے ملائم ایرانی قالینوں پر قفس کرنے والی یونانی رقاصائیں کا خیال آ جاتا ہے۔ پھر وہ آسمان کا چاند بھی سرد کے درختوں میں طلوع نہیں ہوا۔ سکند کی سست رفتار لہریں ساحلی پتھروں کو پیادے سے تنہا کر دیاں ہیں۔ چمکے آسمان پر درات کے جھومر — نیلے جھومر خاموشی سے جھللا رہے ہیں۔ اور ایک آدمی پتھر پر بیٹھا شبنامی نمائشی قفسری پر بڑی آواز سے اور کوئل نے ادا پڑا ہے اور نیم غریباں، حسین اور صحت مند سلاوینیں روکیاں مسوں پر شاخوں کا چکر رکھے، بالوں میں پھول سجائے قالین پر قفس کر رہی ہیں۔ اور ان کے وسط میں چوڑے چوڑے پتوں پر سرخ، سبز اور نیلے انگوروں کے گچھے رکھے ہیں اور میب، انار، انجیر اور شراب اور سرسہ کے درختوں میں نیم سرخ چاند کا ٹنگتا ہوا چہرہ نمودار ہو رہا ہے اور بنسری پر نے تیز بوگٹی ہے اور قفس کے دائرے پھیل گئے ہیں، اور جزیرہ سلاویز کے سمندر پر لہروں کا شور بڑھنے لگا ہے، اور یونانی جنگلوں کی ڈھلوانوں پر تاریک جھنڈوں میں گلاب کے زرد پھولوں نے اپنی چمکیں بند کر لی ہیں اور اب شبنم گھنے لگی ہے۔ ایک پھول سے دوسرے پھول اور دوسرے پھول سے تیسرے پھول پر.....

میں سگریٹ شلگاتا ہوں۔ تم پکلیٹس کی ہنٹیاں میرے اور قریب کرو۔ تم نے اس وقت کو کبھی بارش کے بعد دیکھا ہے، جب اس کی شاخوں پر سے بارش کے رُکے ہوئے قطرے ٹپک رہے ہوں اور اس کی پتیاں لالچھیلوں ایسی ہلکی ہلکی جھک چھوڑ رہی ہوں پھر اس کی گول گول جھولہ اور لٹم ہنٹیوں کے بازوؤں کا رنگ جھانگدھی ہوتا کبھی گندم کا خیال نہیں آتا جو روز بروز مہنگی ہو رہی ہے۔ بلکہ ذہن میں غم و غم کی

کھانسی کھانسی کے دیکتے جسم پر نہ لگتے ہیں۔ اب جب کبھی لاہور میں بارش ہو تو تم اس کے بعد لارنس میں جا کر پوکیشن کے ذریعہ کو چھو کر کھانسی پر نہیں محسوس ہوگا کہ اگر کوئی بونانی وہ شیزہ چلتے چلتے ایک دم ٹھک جائے تو وہ پوکیشن کا درخت بن جاتی ہے۔ اور اگر پوکیشن کے درخت میں جان پڑ جائے تو تم اسے جزیرہ سلا میز کی نیلی ماقوں میں ایرانی قالین پر غص کر تے دیکھو گے۔ اس کے سر پر پتے ہوں گے اسکا ٹیبلر میں چولہا اور پاؤں میں نعلین اور سرخ انگوٹھ اور سیب اور اسپاٹلے کے جگہ اور ایجنٹز کے غصی اور کریٹ کے سوداگر۔ تم کچے پڑ گئے و کریم سکونیش اور کچ کرش۔ جگر بڑ چائے کریں لیل۔ میں تو صوف چائے پیوں گا۔ میں جب اکیلا ہوتا ہوں تو معرفت چاہتا ہوں اور آج میں اکیلا ہوں۔ بڑا اکیلا ہوں۔ تم بلیک ڈوگ۔ نہیں۔

اچھا پھر فیملی رہے۔

پھر کیا پڑے؟

چائے؟

تم بھی چائے پڑے؟ مسموم ہوتا ہے آج تم بھی اکیلے ہو۔

ویر؟

نہیں؟

دو بیٹے؟

دو بیٹے؟

ہاں دو بیٹے۔ چائے۔ ٹی، پیس ٹی۔

آج میری جیب میں پیسے کم ہیں۔ صبح چھوٹی بین کھا سکول کی نئی کاپیاں خریدنے کے لئے پانچ روپے دیئے تھے اور شام کو چھین لے گئے ہیں۔ اس نے بڑا شور مچایا۔ پھر میں بھی شور مچانے لگا۔ اور وہ پچھن کر جاک نکلا۔ ہم لوگ انہیں کیا دے سکتے ہیں۔ ان کے لٹکایا کر سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ لڑتے جھگڑتے رہیں اور جب وہ ڈولی میں سوار ہو کر گھر سے رخصت ہونے لگیں تو منہ چھپا کر دو آنسو بہا دیں۔

بچاوی نہیں۔ چھوٹی نہیں!

کتنے بچے ڈالوں؟

لوگ آنا شروع ہو گئے ہیں۔ بالی روم بہت جلد بھر جائے گا۔ اور آج اس کی گھٹی گھٹی فضا میں میرا دم گھٹے گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج یہاں کوئی آئے۔ آج یہاں سوائے ہم دونوں کے اور کوئی نہ ہو۔ آج میں بڑا اکیلا ہوں۔ آج تم بھی اکیلے ہو اور ہم دونوں سیلون کی چائے پی رہے ہیں۔ تلخ اور کڑوی چائے۔ یہ چائے تمہیں سوائے اس بوتل کے اور کہیں نہیں ملے گی۔ اس میں جنوبی ہند کی موسلا دھار بارشوں کی نمی اور ساحلی بحر پر اُگے ہوئے ناریل کے درختوں کی جھلک ہے۔ میں صرف یہ چائے پینے یہاں آتا ہوں، اور ہمیشہ اکیلا آتا ہوں، اس چائے کے ساتھ میری کچھ یادیں وابستہ ہیں۔ کچھ آفسو وابستہ ہیں۔

میں جانتا ہوں تم کچھ چپ چپ ہو۔ اس اس اس۔ اسی لئے میں تمہیں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ جیسا آدمی چپ چپ رہتا ہے۔ سوگایا ہوتا ہے تو وہ عرفی اس آدمی کی سنگت میں خوشی حاصل کرتا ہے جو اس سے بھی زیادہ سوگوار ہو۔ اسے یہ جان کر تسکین ہوتی ہے کہ زندگی

صرف اسی کے لئے ایک ویران باغ نہیں بلکہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو ننگے درختوں تلے سوکھے پتوں پر بیٹھے ان رنگین پتوں کو یاد کرتے ہیں جو اڑ گئے ہیں۔ ان بہاروں کے انتظار میں ہیں جو نہ موڑ چکی ہیں، کہیں راستہ بھول گئی ہیں۔
تہا سگریٹ بج گیا ہے۔

اسے دوبارہ سسکا کر اور میری باتیں اتنی توجہ سے نہ سناں پرتانا دھیان نہ دو کہ تہا سگریٹ بج جائے اور تمہیں پتہ نہ ہو۔
یہ بڑی معمولی باتیں ہیں۔ اس بال روم میں بیٹھ کر اپنی دنٹرز کا رقص دیکھنے سے بھی زیادہ معمولی! —
اپنی دنٹرز کی وجہ سے اس بال روم میں اب کافی لوگ آئے گئے ہیں۔ تقریباً ہر دوسرا آدمی اس سے عشق کرتا ہے۔ اعداد اس کی یاد میں آتے ہیں بھرتا ہے۔ اپنی دنٹرز بھی کسی کا دل نہیں توڑتی۔ وہ صرف کمر توڑتی ہے۔ اپنے عاشق کے ساتھ مال اور نامار کلی کے دو چکر لگاتی ہے اور کمر توڑ کر واپس آجاتی ہے۔ وہ کسی کا دل توڑنا جانتی ہی نہیں۔ یہ وہ عشق ہے جو ایک کار سے شروع ہو کر دوسری کار میں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ کبھی فورڈ ہے، کبھی شیوہ لکھا اور کبھی پونٹک — اس کا ایک ہاتھ کمر کے گرد ہوتا ہے، اور دوسرا جیب ٹوٹل رہا ہوتا ہے۔ ہم لوگ اس عشق کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارا عشق دھندلی گلیوں کے جھکے جھکے مکانوں میں جنم لے کر کچھ دیر نیم وا کھڑکی کے ساتھ لگا دل پر ہاتھ دیکھے کھڑا رہتا ہے، اور پھر ڈولی میں بیٹھ کر ہولے ہولے سسکیاں بھرتا رخصت ہو جاتا ہے۔ اس نے کسی کار کا نام نہیں سنا۔ وہ کار کو آنا دیکھ کر جلدی سے فٹ پاتھ پر چڑھ جاتا ہے۔ وہ ڈوبتا سورج ہے، ٹوٹا نغمہ ہے اور گرتا پتا ہے۔ اور گزرتا بادل ہے۔ اس کا ایک ہاتھ کمر کے گرد ہوتا ہے، اور وہ کبھی کمر نہیں توڑتا۔ وہ دل توڑتا ہے، ہمیشہ دل توڑتا ہے۔
ایک سگریٹ مجھے بھی ہوینا!

بال روم میں مزدور کوئی ایمن موڈ پی رہا ہے۔ مجھاس کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ تبا کو بڑا عمدہ ہے۔ موسم مرا شروع ہو گیا ہے۔ تھوڑے دنوں تک میں پائپ شریعہ کر دوں گا۔ اس طرح خرچ بھی کم ہوتا ہے اور تنگیں بھی بہت ہو جاتی ہے۔ تم پھر کیپشن پینے لگے ہو۔ اچھا ہے۔ آدمی کو اپنا براؤڈ بدلتے رہنا چاہئے۔ کبھی تپنی اور کبھی کیپشن — کبھی میٹرو اور کبھی گو انڈی۔ تصویر کے دونوں رخ، زندگی کے دونوں ٹوڈا! لیکن آج ایک تیسرا موڈ پیدا ہو رہا ہے۔

یہ ٹوڈا جھے گو انڈی سے اٹھا کر یہاں لایا ہے۔ اور یہاں سے کہنے کر کسی اور جگہ لے جانا چاہتا ہے۔ اس موڈ کا رنگ زرد ہے، اور انکھیں ویران ہیں۔ تم اگر ان آنکھوں میں جھانک کر دیکھو تو تمہیں دوزخ سوائے ان پتوں کے اور کچھ نظر نہ آئے گا جو درختوں پر سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوں گے۔ پت جھڑکا موڈ ہے، خزاں کا موڈ ہے۔ یہ مجھ سے پت کر چپ چاپ رو رہا ہے۔ اور مجھے خزاں کے سائے گیت یاد آ رہے ہیں، پہلا گیت نابیل کا گیت ہے، دیل کے پھولوں کا گیت ہے۔ بنگالی گیت ہے۔ اسے میں نے پہلی مرتبہ کلکتے کے ایک بازار میں سنا۔ اس گیت کا نام سدھا ہے۔ سدھا ایک بنگالی لڑکی کا نام ہے۔ بنگالی لڑکی مجھے پہلے روز ایک روڈ پر نظر آئی۔ میں ایک کینے میں چائے پی کر رہا تھا اور چیت پو روڈ کو جانے والی بس کا انتظار کر رہا تھا کہ سانسوں سے دہلے پتے جسم کی ایک لڑکی مرگ جوڑ کر کے بس سٹیڈ تک آئی اور پنچ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کا کچھ کتابیں اور ایک رجسٹر تھا۔ وہ گلابی کٹائے والی عام سپید بنگالی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ گھر سے سیاہ چھیلے بالوں کی مانگ مد میان سے نکل تھی اور جوڑے میں دیل کا گجرا بچ رہا تھا۔ گھر سے کے پھل مرگھا کر زردا دھڑیالے ہوئے تھے۔ ہاتھ پر چندن کا پیکا سا لیکا تھا، اور وہ کتابیں گود میں رکھے پنچ پر چکی چکی، سمٹ کر بیٹھی بڑی اداس مٹیسی سے مرگ پر کا دلوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سامنے والے گروہ پاشری اسکول میں استانی تھی۔

ادب نگار اپنی جارہی تھی۔ میں بچہ پر نہیں بیٹھا تھا۔ بلکہ دبا پے ہٹ کر باغ کے چنگے کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ دو تین اودامی وہاں آکر کھڑے ہوئے۔ مجھ میں ایک بندھی جوت بھی تھی جس نے ایک بڑا ساقیلا اٹھا رکھا تھا۔ بس آگئی۔ ہم سب اس میں سوار ہو گئے۔ جس میں صرف عورتوں کی دو تین بیٹیں خالی تھیں۔ میں نے ایک دھڑ سے دھرم تھک کا راستہ کھڑے ہو کر طے کیا۔ وہ لڑکی میرے قریب ہی کھڑکی کے ساتھ دلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ کتابیں اس کی گود میں تھیں۔ اور وہ مخصوص افسردہ سے انداز میں سڑک پر پیچے کی سمت بھاگتی ہوئی دکانوں، کالوں اور بجلی کے نمبروں کو نگاہ سے گزرتی تھی۔ اس کی گردن پر زم زم روٹیں اور سنہری بال تھے۔ اور وہ سبز رنگین شانوں کی طرف لگ گئی تھیں۔ وہ دھرم تھک پہنچ کر اتر گئی۔ اس دکان میں اس نے دو ایک بار ساڑھی کا پڑھ لیک کیا اور پھل سے اپنے بال کھجلائے۔

دوسرے دن ٹھیک اسی وقت میں پھر ایک روڈ کے بس سٹینڈ پہنچ گیا۔ نہ جانے کیوں میں اس بنگالی لڑکی ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا کیلئے پھوس کے ساتھ بس میں سوار ہو کر دھرم تھک سڑک نہا چاہتا تھا۔ خاص وقت پر وہ کل کی طرح سڑک عبور کر کے بس سٹینڈ پر آئی اور بچہ پر بیٹھ گئی۔ میں پہلے بڑی طرح چنگے کے ساتھ لگتا تھا۔ وہ کل کی طرح پید ساڑھی اور چل پہنے تھی۔ اور جوڑے کا گجرا کچھ اور مرھا گیا تھا۔ اور چند دن کا ٹیکا پھیکا پڑ گیا تھا۔ میں دھڑ سڑک پر اس بس سٹینڈ پر جاتا اور چنگے پر جھکا اس بنگالی لڑکی کا انتظار کرتا۔ وہ ٹھیک وقت پر سڑک عبور کرتی ہوئی بچہ پر آکر بیٹھ جاتی، اور پیپ چاہپ افسوہ نگاہوں سے کاروں کو گزرتے دیکھتی رہتی۔ پھر میں آجاتی، اور ہم دونوں دھرم تھک آتے۔ وہاں وہ ساڑھی اور کٹا ہونے کو سنبھالتی سچی سٹائی نیچے اتر جاتی اور میں پھر دوسرے دن کا انتظار کرنے لگتا۔ ایک دن بس سٹینڈ پر وہ اپنی کسی سیل کے ساتھ آئی جس نے اسے باتوں ہی باتوں میں مدعا کے نام سے پکارا۔ ایک ماہ گزر گیا۔ اس دکان میں نہ اس نے مجھے آنکھ بھر کے دیکھا اور نہ مجھ میں ہی اتنا حوصلہ تھا کہ اس سے کوئی بات کروں۔ اور پھر میں اس سے کوئی بات نہ کرنا چاہتا تھا۔ ردیل کے غمگین چہلوں سے کوئی کیا بات کرے گا۔

کچھ بار جب وہ میں سے اترنے لگی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی اتر پڑا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بازاروں اور گلیوں میں سے ہوتا تھا اس کے گھڑنگ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے اک منزلہ کو اڑنا مکان کے باہر کیلے اور شریفی کا دھڑکتا ہے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر جانے لگی ہے کہ ایک گیند اس کے پاس آکر اچھل پڑی ہے۔ اس نے گیند پکھلی ہے۔ اور کو اڑنے کے سامنے واسے پارک میں اس کا چھوٹا بھائی بنیان اور نیکر پہنے کھڑا اسے پکارے لگا ہے۔

”دیوی ایدی! میری گیند ہے۔ پھینک دو، زور سے۔“

”مدھانے بتاؤنی غمے میں اسے ڈانٹا ہے۔“

”آج کتنی جوں باسٹری سے کہے سامان کھینا رہتا ہے اور ذرا کام نہیں کرتا۔“ اس کوں کا کام کیا ہے؟“

”کہ لیا ہے دیوی! — اب پھینک دو نا گیند!“

اور اس نے گیند پھینک دی ہے۔ اور وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی ہے۔ مگر پہنچ کر اس نے ساڑھی اتار کر سیلی سی دھوتی پہن لی ہے اور اپنی ماں کے ساتھ کھانے پکانے اور مگر کے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی ہے۔ شام کو اس کا بھائی دفتر سے آگیا ہے۔ پھر اس کا باپ بھی آگیا ہے۔ وہ ایک کمرے میں بیٹھے ہیں۔ مدھان کا بھائی چائے بنا رہا ہے۔ اور وہ خود دوسرے روز کے لئے سٹنڈی کر رہی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی باہر ہی خانے میں وہی زبان میں اپنی ماں سے لڑائی کر رہا ہے۔ اس کا ادھیڑ عمر کا باپ صوفے پر بیٹھا بارہ نیم کھولے اس کے سر پر ٹھیک کر رہا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ میز پر رکھی ہوئی چائے کی پیالی میں سے ایک آدھ گھونٹ پی لیتا ہے۔ راکھ ان میں اس کا

سدا رنگ رہا ہے۔ بارونیم ٹھیک کر کے وہ اسے کچھ دیر بجا کر مڑتا ہے اور سدھا کی طرف بڑھا دیتا ہے۔
لو بھی اب اسے سنبھالو!

سدھا سڈھی کے بعد بارونیم نے کرکڑی کے پاس پہنچے ہوئے پنگھ پر بیٹھ جاتی ہے اور بارونیم کے لیے اور دیکھے سریل پر دھیرے دھیرے ایک پُرانا گیت گانے لگتی ہے۔ یہ گیت بنگال کے ایک پڑانے۔ بہت پُرانے عوامی شاعر کا ہے اور اس میں سدھا کے جوڑے میں گئے ہوئے روئل کے افسردہ پھول ہیں اور اس کی سدا خاموش رہنے والی آنکھوں کی اداسی ہے۔ کھل کرکڑی کے باہر آسمان پر شام کا اندھیرا پھیل رہا ہے اور کیلے کی ٹہنیاں اپنے چوڑے پتے جھکائے خاموش ہیں۔ کمرے میں کمزور بجتی کی بجلی ہلکی روشنی ہے۔ سدھا کا بھائی کتاب سامنے رکھے کرسی پر بیٹھا ہے اس کا باپ شال کندھوں پر رکھے صوفے پر نیم دھار اخبار پڑھ رہا ہے۔ چائے کی خالی پیالی میز پر ہے۔ اس کی آنکھوں میں سدا رنگ رہا ہے۔ بارونیم خانے کی طرف سے اب کوئی آواز نہیں آرہی۔ کامرس پر پتیل کے گھداں میں ماریوتی کے چول ہیں اور کانسی کے قہال میں بھی جوئی سا گرمی اور اگر تپیاں ہیں اور مرجھاتی ہوئی دو تین کلیاں اور سدھا نرم، دھیمی اور ٹھکی آواز میں گارہی ہے۔

ابھی میرے آگن میں چاند نہیں نکلا،

اور وہ دیو داسی جو ندیل کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی طرف جارہی ہے اسے کچھ نہ کہو۔

اسے اپنے راستے پر تہا جانے دو،

وہ ان موتیوں کی تلاش میں ہے جو کھو گئے

وہ ان کشتیوں کی تلاش میں ہے جو ڈوب گئیں،

ابھی میرے آگن میں چاند نہیں نکلا،

چاند نہیں نکلا۔

پھر صبح ہو گئی ہے۔ گھر میں ہر شخص کام پر جانے کی تیاریوں میں ہے۔ سدھا غسل خانے سے باہر نکل کر آگن میں کھڑی ہال سکھا رہی ہے اس کے بالوں سے ناریل کی جھک اٹھ رہی ہے اور وہ گیلے ہیں اور ان سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر اس کے شانوں پر گر رہے ہیں۔ اس کی باریک گل کی ساڑھی گیلے بدن سے کہیں کہیں چپک رہی ہے اور لکڑی کے تخت پر موٹے کے پھول بکھرے پڑے ہیں۔ گیلے بدن دھلے ہوئے بال اور ہلکتی ساڑھی اور لیے سیاہ بالوں میں سے ٹپکتے ہوئے پانی کے قطرے اور کیلے کے پتے ناریل کی جھک اور موٹے کے پھول اور روئل کے گجرے اور سدھا۔ اور ایک روڈ کی سنگین موٹر، پہاٹری سکول اور بیس بیٹنڈ! زندگی کتنی مشکل ہے!

ابھی میرے آگن میں چاند نہیں نکلا۔

چاند نہیں نکلا۔

لیکن میں کبھی سدھا کے گھر نہ گیا تھا۔ میں کبھی دھرم تلہ بس اسٹینڈ پر نہ اُترتا تھا۔ پھر بھی میں اسے جانتا تھا۔ اس کے ہاں بھائی اور بہنوں کو جانتا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے کبھی اس سے بات نہ کی تھی۔ اور میں اس سے کبھی کئی بات نہ کہتا تھا۔ میں نے

کبھی امانی پھول سے بات نہیں کی۔ میں اپنی معرفت دیکھتا ہوں اور دیکھتا رہتا ہوں۔ میں نے پہلی مرتبہ سدھا کو بس سینڈ پر دیکھا تھا، اور انہی مرتبہ میں اسی بس سینڈ پر دیکھا۔ ہم دونوں ایک روڈ سے سوار ہو کر دھرم تلہ سکوڑ تک آئے۔ وہ حسب معمول کتابیں اٹھائے، سارے ہی منہ جاتی سی مثالیں سے اچھی باتیں اسی شام فریئر سٹریٹ میں سوار ہو کر لا جو آگیا اور اس بات کو سات سال بیت گئے ہیں۔ میں پھر کھٹکتے نہیں جاسکا۔ میں پھر وہ گیت نہیں سن سکا۔ میں پھر سدھا کو نہیں دیکھ سکا۔ اور قیاد اب کبھی نہ دیکھ سکوں۔ کیا خبر وہ آج بھی اسی طرح سڑک عبور کر کے بس سینڈ تک آتی ہو گی؟ میں گدیوں میں رکھ کر کئی پریشہ جاتی ہوا درجہ چا پ، افسردہ انداز میں سڑک پر سے گزرنے والی کاروں کو دیکھتی رہتی ہو۔ اور کیا خبر اس کا بیاد ہو گیا ہو اور اس کی مانگ میں سینہ درد ہوا ہو، اور وہ اپنے گھر میں بچوں سے کھیل رہی ہو اور کبھی کبھی اپنے خاوند بچوں کے ساتھ ایک ریلوے سٹینڈ پر سے گزرتی ہو اور میری ہوا کبھی وہ جوڑے میں رویل کے پھول سجائے یہاں بچے پر بیٹھی بس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ شاید وہ اس لوہے کو پھول لٹی ہو جو بچے کے پاس ہی جھنگے پر جھکا اس کے ساتھ اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس کا انتظار کیا کرتا تھا اور جو سکتا ہے فسادات نے اسے نقل لیا ہو۔ وہ ایک دن بچے پر بیٹھی گھر جانے والی بس کا انتظار کر رہی ہو اور اس کی گدیوں میں کتابیں ہوں اور وہ افسردگی سے سڑک پر دیکھ رہی ہو کہ اچانک کسی نے اس کی پشت میں خنجر جھونک دیا ہو اور اس کے جوڑے میں گئے ہوئے رویل کے پھول زمین پر گر پڑتے ہوں اور کانس پر بکھا ہوا گلہاں لا جوتی کی کلیوں سمیت فرش پر اوندھے منہ آن پڑا ہو۔ پھر سائے گیتوں نے دم توڑ دیا ہو سارے پھول مر جھانگے ہوں، اور سامنے چاند ڈوب گئے ہوں۔ بس سینڈ ایک دم دریاں ہو گیا ہو اور بچے پر سرخ خلق بہہ نکلا ہو۔ اور سدھا کے گھر جانے والی بس اسے وہیں چھوڑ کر وہاں سے جاگ نکلی ہو۔ اور سدھا کے گھر میں کھلی کھڑکی کے باہر شام کا اندھیرا بڑھنے لگا ہو۔ اور اس کا باپ بے چینی سے کمرے کے چسکر کاٹ رہا ہو۔

”سدھا ابھی تک نہیں آئی؟“

”سدھا ابھی تک کیوں نہیں آئی؟“

سدھا کے فکر مند باپ! اب سدھا کبھی نہیں آئے گی۔ سدھا ناریل کے درختوں میں سے گزرتا ایک مسندوں کی طرف نکل گئی ہے۔ وہ ان کشتیوں کی تلاش میں چلی گئی ہے جو ایک حرم بڑا ڈوب چکی ہیں۔ سدھا کی غمگین بہنو! اپنے جھکے ہوئے سر اور پٹھا اور روتی ہوئی آنکھوں پر کیلے کے پتے اور موستے کے زرد پھول رکھ کر سو جاؤ، اور سدھا کے ہارونیم کو پو تو جھناکی لہروں کے سپرد کر دو۔ اور اسے بھول جاؤ اور سدھا کے چھوٹے بھائی سے کہو وہ پارک میں گیند کھیلتے ہوئے اپنی ویدی کو یاد کر کے آنسو نہ بہائے۔ اسے کہو جب گیند اچھل کر دروازے کی طرف جانے تو وہ کسی کو آواز دے کر نہ کہے

”ویدی ماویدی! گیند میری ہے۔ پھینک دو وہ اب پھینک دو نا!“

اب کوئی جھوٹ موٹ غصے میں آکر اسے نہیں ڈانٹے گا۔ اور اس کی طرف گیند نہیں پھینکے گا۔

اسے دیر لگ گھر کے سوگوار باسیو! اب کبھی تمہارے آگن میں چاند نہیں نکلے گا۔ اب کبھی تمہارے درختوں پر کیلے کے قرمزی

لہر نہ لگیں گے۔ سدھا کے سارے گیت مجھے دے دو، سدھا کے سارے پھول میری بھولی میں ڈال دو۔ اور وہ ویو داسی جو ناریل کے درختوں میں سے گزرتا ایک مسند کی طرف جا رہی ہے۔ اسے کہو نہ کہو۔ اسے اپنے راستے پر تہا جانے دو۔ وہ ان موتیوں.....

ابھی میزوں پر موسم تیاں رہشیں نہیں جوئیں۔

ابھی اپنی دھڑلہ نہیں آئی۔ چائے اور گھمائل؛ سیون کی چائے، کوئیر کی چائے، انگراب چائے، کاوہ ٹکٹ ٹائے گا۔ سب بلبل
کچا کچا پھر گیا ہے۔ اور مضامین ٹکٹل کا شور اور تباہی اور شراب کی بوندھ گئی ہے۔ یہاں ہر قسم کے لوگ جبر ہیں۔ یہاں ہر قسم کی باتیں جو دنیا میں
میں خباہتوں کے ایڈیٹر ہیں۔ اخباروں کے مالک ہیں۔ کاغذوں کے جتے دار ہیں۔ سجدوں کے دوست ہیں اور دوستوں کے جتے دار ہیں۔ گڑی
بھٹی کل کے ذریعہ ہیں، اور آنے والی کل کے سیاست دان ہیں، لیڈر ہیں، کاغذ، سوڈا، چینی اور تباہی کی ایک مارکیٹ کو لے دالے ہیں۔ ان لٹوں کے
میر ہیں جو کبھی نہیں گئی۔ ان ناہلوں کے معنی میں جو کبھی نہیں کھے جاتیں گے۔ اور ان تصویروں کے پیٹرن ہیں جو انہوں نے خود نہیں بتائیں۔
یہاں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی کاروں کو وہ سروں کی ملکیت سمجھتے ہیں، اور وہ لوگ بھی ہیں جو وہ سروں کی کاروں کو اپنا سمجھتے ہیں۔ سنو اس میز
پہ کیا باتیں جو رہی ہیں۔

وہ ہائے قسم خدا کی ساری مات کار میں لئے گھومتے رہے۔ کیا جال جو پٹی نے ات بھی کی ہو۔ ہر کناٹے گاڑی کھڑی کر کے پھو بیڑ
پینا شروع کر دی۔ بس خواہو تمہیں کیا بتاؤں۔ کیا آنکھ تھی! کیا پنڈلی تھی! کیا بات تھی! واہ واہ! — یا ہو —

”ہیرا، ہیرا، پان لانا — سب کے لئے“

”بس یاد خدا سے دعا کرو کہ اب کے روٹی کی فصل اچھی ہو جائے اور چار پیسے پنج جاتیں سب کے میں نے سوچ دکھا ہے کہ اسے
پندہ دن اپنے ہاں رکھنا ہے۔ میں کہتا ہوں کیا عورت ہے ظالم،

.....

”میں جیسا چلے جانا چاہتا ہوں۔ میرا پاکستان میں کوئی کام نہیں۔ جیسا — جہاں سرخ کیلے اور تاتاس اور دم ہوتی ہے۔ پاکستان
میں یہ میرا آخری سال ہے۔ اگلے سال میں یہاں سے فرود چلا جاؤں گا،
• چلو امریکہ چلیں۔“

”پہلے امریکہ ہی جاتیں گے۔“

”مگر وہاں رہیں گے کہاں؟“

”اس کا انتظام میں کروں گا۔ آدمی چالاک ہونا چاہئے۔ وہ ہر جگہ رہ سکتا ہے۔“

”اور اگر امریکہ دھانکے تو؟“

”تو پھر میرے پاس ایک دیپو ڈگرام ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ذرا قریب آ جاؤ۔ سنو! میرا ایک دوست افریقہ سے آیا ہے۔ وہ کہتا ہے وہاں پنجابی عورت کی بہت مانگ ہے۔“

”بس ہم افریقہ چلے جاتیں گے!“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یہاں سے دو تین لڑکیاں لے جاتیں گے۔“

۱۰۔ اس کا بندہ دست میں کر لیں گا۔ ہم یہاں اس سے فتادیاں کر لیں گے۔ پھر میں کوئی سودک بیگے گا۔

446

یکی تھائی

”مت کہو مری! میں سمجھ گیا ہوں۔“

.....

وہ کہتے ہیں:

ممنوعہ کجوں گا میں تمہارے سامنے کھڑا ہو کر لوگوں کی حیرت و حیرتوں کا کہوں گا کہ تم فراڈ ہو، سر سے لے کر پاؤں تک، اور پاؤں سے لے کر پھر سر تک فراڈ ہو۔ بہت بڑے فراڈ ہو۔ بلیک میل ہو۔ تم سبھی ہوئی خوفزدہ عزتوں کے سوشل کتے ہو تم عقاب کے پر لگا کر مردہ شکار پر بیٹھتے ہو، اور تم اپنے بچوں پر جبارا خون نہ چھپا سکو گے۔ تم بے ثمر تاروں پر کتے کی آواز میں کوئل کے گیت گارہے ہو۔ اور تم عین غفل میں کپڑے جاڑ گے تمہاری بڑھی رگوں میں جھاگ داد نہریلا خون گردش کر رہا ہے۔ اور تم بہت جا اپنے خون کے زہر سے ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور سب تم مر جاؤ گے تو تمہارے کتے پر لکھا جائے گا —

”یہاں بحال کا علاقہ، دکن کا جغدادہ میر کا چچا کیسہ و دفن ہے۔“

اگر میں دوزخ میں گیا تو اس کے دروازے پر بیٹھ کر کہاں ضرور انتظار کروں گا؟

”یہ عجیب ٹھ ہے۔ کجا اس ہے“

”دنیا میں صرف ایک بات سچی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ سب کو اس ہے، سب فراڈ ہے۔ تم بھی فراڈ ہو، اور وہ بھی“

جو میکا جانا چاہتا ہے، اور وہ بھی جو فرقہ جانا چاہتا ہے اور وہ بھی جو ساری مات لڑکی کوئے کر گاڑی بیوہ گھوٹا چاہتا ہے۔ تم سب فراڈ ہو اور

تم سے بٹا فراڈ میمال روم ہے۔ جہاں تم بیٹھتے ہو، جہاں تم پروگرام جانتے ہو۔ کبھی افریقہ جانے کے اور کبھی امریکہ جانے کے،

دیشرا دیشرا!

یس سر:

تم گدھے ہو:

یس سر:

ہم سب گدھے ہیں:

یس سر:

ایک گدھا لاؤ۔ جالہی۔ ایک دم جالہی۔

.....

میں دوسرے تیسرے اس ہوش میں آتا ہوں اور بال روم میں آکر بیٹھتا ہوں۔ اور ان لوگوں کی کھوکھلی باتوں کی آوازیں اور کھوکھے سکون کی مصنوعی جھینکاریں سنتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے اس ہوش میں سیلون کی چائے پینے لگتی ہے۔ پھر بھی میں نے ان لوگوں کی باتوں کا کبھی برا نہیں مانا۔ میں ان سے بہت کم بد ہوتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں زیادہ قصور ان لوگوں کا نہیں بلکہ اس ماحول کا ہے جہاں ان کی تربیت ہوئی ہے۔ لیکن آج میں ان کی آوازیں، ان کا شور ان کے بے ہنگم قہقہے برداشت نہیں کر سکتا۔ آج میرا بال روم گھٹ رہا ہے۔ آج اس بال روم کی دیواریں، اس کی چھت چھتوں سے لٹکے ہوئے فلوز اور میز پر، اگر سیالیاں اور ان پر بیٹھے ہوئے جھدے، بد وضع، بے ڈھنگے لوگ مجھے بڑے اجنبی لگ رہے ہیں۔ آج میں اکیلا ہوں، میں رونا اکیلا ہوتا ہوں۔ مگر آج یہ اکیلا پن مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ میری اچھی بال روم کا شور نہیں۔ خزاں نصیب درختوں کی خاموشی چاہتی ہے۔

اڈیالہ سے اٹھ چلیں۔

تم سگریٹ جیب میں ڈالو اور میں یوکلےٹس کی ٹینیوں کو چوم کر ان سے رخصت طلب کرتا ہوں۔ چلو لارنس چلیں۔ جیسے سرسبز پارک اور گنجان درختوں کے ملک میں چلیں۔ اپنے ملک میں چلیں۔

* * * * *

یہاں کتنی ٹھنڈک اور خاموشی ہے!

باغ میں اس گرنا شروع ہو گئی ہے۔ اکتوبر کے جیسے میں لارنس کی راتیں۔ سوئٹزرلینڈ کے جنگلوں سے کم نہیں ہوتیں بات کتنی شگفتہ اور چھیلی ہے۔ نیلے آسمان پر لاکھوں چھوٹے بڑے ستارے چمک رہے ہیں اور یہ کتنی اچھی بات ہے کہ آج اوپن ایئر ٹیٹل ہاؤس بھی خالی ہے۔ آؤ وہاں بیٹھ کر چائے پیئیں۔ وہاں۔ اچھی کے درخت تھے۔

یہاں نہیں چائے اچھی نہیں ملے گی لیکن چائے پینے کا صحیح ماحول ملے گا۔ بال روم میں چائے اچھی ملتی ہے۔ لیکن ماحول نہیں ملتا یہاں کہیں بھی کوئی چیز اپنی جگہ پر مکمل حالت میں نہیں ہے۔ بس ٹکڑے ہی ٹکڑے ہیں جو ادھر سے ادھر چکر لگا رہے ہیں۔

دیکھو! خشک پتوں پر بڑی آہستگی سے قدم رکھو۔ ان پر پیار کے نوحے لکھے ہیں۔ یہ بڑی مقدس سرزمین ہے۔ یہ میری اہیادوں کا

یروشلیم ہے۔ یہاں بڑی محبت سے، بڑی نرمی سے بڑے پیار سے قدم اٹھاؤ۔ یہاں ہر دوسرے قدم پر میری زندگی کے عموما اور نئی نالی دفن ہیں۔ یہاں میں چلو گیا تھا۔ پاؤں ان گھرے بڑے پتوں کو چوم رہے ہیں۔ ہم ان لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ جو فائدہ اور نقصان کی

بہنیں یہی پتہ جانا چاہئے۔ اسی جگہ۔۔۔ جہاں موٹے کا بھاڑ ہے۔ اندھیرے میں ہمیں موٹے کی اودھکلی پسید کلیاں نہیں دکھائی دیں گی۔ وہ تھیلے کے آئینل میں چھپی ہوئی ہیں لیکن تم ان کی دھیمی دھیمی ٹھنڈی خوشبو مزید غصہ میں کر دو گے۔

موٹے کے پھول مجھ بڑے پسند ہیں۔ شاید اس لئے کہ سدھا اسے اپنے بالوں میں ردیل کے گجروں کے ساتھ لٹکایا کرتی تھی اور اس دن جب وہ غسل خانے سے ہٹا کر باہر آئنگن میں کھڑی بال سکھا رہی تھی اور اس کی باریک ساٹھی اس کے سانوسے بدن سے کہیں کہیں چپک نہی تھی تو سامنے کلاڑی کے تخت انہی پھولوں کی سفید کلیاں بکھری پڑی تھیں۔ ٹھہرو۔۔۔ بیرے کو آؤر دے لیں۔

— 24 —

14

”اور کچھ نہیں۔۔۔ چائے لاؤ۔ سیلوں کی چائے، اکو سیلو کی چائے۔“

۱۵۰

• مرثیہ چائے لاؤ:

جیسا کہ چائے نہیں آتی میں تمہیں پتہ جبر کا ایک اور گیت سناتا ہوں۔

یہ حکمت و ریاضے نیل کے ملاحوں کا ہے:-

”۔۔۔ نیل! پیارے نیل!!“

تو نے قلعہ بندہ کو دیکھا ہے! جس کے سر پر میروں کا تاج تھا۔

اور ان غلاموں کو بھی — جن کے جسموں سے پسینہ بہہ رہا تھا۔

نیل! پیارے نیل!

تیرے آسمان پر تائے سدا چکتے رہیں،

تیرے بچوں کے درخت کہیں نہ سوکھیں،

ہماری کھیتوں کو بھی ہرا بھرا کر دے۔

تیل! پیارے تیل! —

یہ گیسٹ ہجے اسی باغ میں اسی جگہ اسی کے دوست تھے بیٹھے ناؤمی نے سنایا تھا۔ ناؤمی ایک لڑکی تھی بھورے بالوں اور چھوٹے
تھک کی فٹنریسی یہودی لڑکی۔ جس کا باپ تابرہ کی یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کا پروفیسر تھا۔ اور جو دلی کی ایشیائی کالفرنس میں حصہ لینے کے لئے
ہندوستان آیا تھا۔ اور واپس جاتے ہوئے پندرہ دنوں کے لئے لاہور ٹھہرا تھا۔ ناؤمی سے میری ملاقات یونیورسٹی لائبریری میں ہوئی۔ میں

کینا لگ رہی تھی کہ اس کے سامنے کھڑا "۵" کے خانے میں ایک انٹرنیشنل مصنف کی کتاب کا نمبر ڈھونڈ رہا تھا کہ ایک دہلی اور مختصر سی لڑکی میرے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور "۶" کا خانہ کھول کر کھڑا تلاش کرنے لگی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ کیونکہ یونیورسٹی لائبریری میں کسی لڑکی کا ایسا لاگ رہی تھی کہ اس کا کھڑا جو جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ لیکن جب وہ لڑکی کافی دیر وہاں کھڑی خانے کھولتی، بند کرتی رہی، اور مجھے بھی کتاب کا نمبر نہ مل سکا۔ تو میں نے ذرا گردن گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے بال عبور سے تھے۔ اور برش پھیر کر بنائے ہوئے تھے اور اس کے شانوں پر آستانہ کی مانند گرہ تھے۔ میں نے یہ نہیں کہا دیا۔

• کیا میں کچھ مدد کر سکتا ہوں؟

لڑکی پہلے تو کچھ جھینپی لیکن فوراً سنبھل گئی اور پھر ہم دونوں نے مل کر اس کا پسندیدہ مصنف ڈھونڈ لیا۔ جب وہ کتاب کا نمبر نوٹ کر کے شکریہ ادا کر کے گئی تو میں نے کہا

• اب میں تباہی مچا رہا ہوں؟
• وہ کچھ شرماسی گئی اور ذرا تعجب سے تنکے لگی
• کیسی مدد؟

• مجھے میرا پسندیدہ مصنف نہیں مل رہا۔

وہ ہنس پڑی اور میں نے دیکھا کہ اس کے رات ہوگ پھل کے نیم پیسہ بوترے دانوں کی طرح تھے اور اس کی آنکھیں اس کے بالوں کی طرح عبوری عبوری تھیں۔ وہ میرے ساتھ مل کر کھڑا تلاش کرنے لگی جب کارڈ مل گیا تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم وہاں سے کاؤنٹر پر آکر اپنی اپنی کتابوں میں مصروف ہو گئے۔

اب ایک بڑے خوبصورت اتفاق سے جب میں لائبریری روم سے باہر نکلنے لگا تو پھر اس لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ جیسے ہی وقت وہ بھی دروازے میں سے گزر رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور اکٹھے برآمدے میں سے گزر کر پلاٹ کے ساتھ ساتھ جانے والی مدش پر چلنے لگے۔ گیٹ تک آتے آتے میں نے اس سے شکل ایک آدھ بات کی اور گیٹ سے باہر نکلنے ہوئے بغیر کچھ سوچے کچھ چائے کی دعوت دینی۔
• اور۔۔۔ شکریہ! میں چائے کی عادی نہیں ہوں۔

• کوئی ہرج نہیں۔ اس کیفے میں خالص انڈیئن چائے ملتی ہے۔
• وہ انکار نہ کر سکی اور ہم یونیورسٹی کیفے میں آکر بیٹھ گئے۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ حیف میں پیدا ہوئی تھی اور پھر اپنے باپ کے ساتھ قاہرہ آگئی تھی۔ جہاں اس کا باپ یونیورسٹی میں پروفیسر ہے اور اس کا بچپن قاہرہ میں گزرا ہے۔ اور وہ انگریزی اور فرنگ کے علاوہ عربی زبان بھی جانتی ہے اور اس کا نام ناؤمی ہے۔ ناؤمی۔۔۔ جو آج سے دو ہزار سال پہلے ایک فلسطینی شہزادی کا نام تھا۔

• ناؤمی کا رنگ سردی نال پیدا تھا اور وہ بچوں کی طرح پیالی پکڑے ہوئے لے لے کر چائے پی رہی تھی۔
• یہ چائے اچھی ہے۔

• یہی تو میں کہتا تھا۔ یہ چائے دارجلنگ کی دھانوں پر لگتی ہے۔

ناڈمی! تم نے دارجلنگ دیکھا ہے؟

نہیں۔۔۔ میں تو پہلی بار یہاں آئی ہوں!

دارجلنگ بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ وہاں کے جنگل، ان جنگلوں کی سسنان تارکی اور بانس کے درختوں میں سے گزرنے والی

پہاڑی سڑکیں سرخ سڑکیں اور برساتوں کا شور اور.....

تم نے دارجلنگ دیکھا ہے؟

نہیں!

اور وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی اور چائے اس کے حق میں تاک گئی اور اسے اچھوسا آگیا۔ میں نے جلدی سے رمال

رمال دیا اور وہ اس میں منہ چپا کر ہنسنے ہنسنے کھانسنے لگی۔ اور جب اس نے بانوں کو جھٹکتے ہوئے سرلو پر اٹھایا تو اس کی بھوری آنکھوں میں دہانی

آگیا تھا۔ وہ اب بھی ہنس رہی تھی۔

ہنسنے کی بات کیا تھی؟

اس نے رمال سے منہ صاف کیا، اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

میرا خیال تھا تم دارجلنگ کافی دیر رہے ہو گے!

اس میں کیا ہے میں تو بارہ کبھی نہیں گیا، لیکن اس کے متعلق کئی مضمون لکھ سکتا ہوں۔

وہ پھر ہنسنے لگی، اور پھر میں بھی ہنس پڑا، اور ہم کیفے سے باہر نکل آئے۔

دوسرے دن ہم پھر یونیورسٹی کیفے میں آئے، اور شام کو وہ مجھے اپنے باپ سے ملانے لے گئی۔ اس کا باپ کلب روڈ پر اپنے کسی

دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اس کا قد چھوٹا، شانے چوڑے اور بھوری آنکھیں ہر چیز کی گہرائی میں اتر جانے والی تھیں۔ گول سرور میان سے گنجل تھا۔

اور کناروں پر کہیں کہیں سپید بال چمک رہے تھے۔ وہ کوٹھی کے باغ میں بے لبتے چیرھ کے درختوں کے درمیان آرام کر رہی پر بیٹھا، اختیارات

کا مطالعہ کر رہا تھا۔

وہ مجھے بڑی محبت سے ملا۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ میں ناڈمی کا دوست ہوں اور یونیورسٹی کا طالب علم ہوں تو، اس نے اخباریں

پر لکھنا اور عینک مٹانی ڈیرا میں بند کر کے مجھ سے یونیورسٹی کے طریقہ تعلیم پر باتیں کرنے لگا۔ ناڈمی بھی میرے پاس ہی کرسی پر بیٹھی تھی۔ تھوڑا

دیر بعد وہاں قبوہ آگیا۔

شاید تمہیں یہ قبوہ پسند نہ آئے۔ لیکن یہ خاص مصری قبوہ ہے۔

وہ خاص مصری قبوہ مجھ بالکل پسند نہ آیا۔ اس میں کچھ ایسی بو تھی جس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ لاشوں کو حنوط کرنے والے

مسالے کی بو تھی۔

ناڈمی اور میں دن میں دو بار ضرور ملتے۔ صبح دس بجے ہماری ملاقات لاٹیری میں ہوتی، جہاں سے نکل کر ہم کیفے میں چائے

پیتے اور عجائب گھر اور مال کی سیر کرتے، اور شام کو لارنس باغ میں اسی جگہ ملتے۔ جہاں اس وقت ہم دونوں بیٹھے ہیں۔

اور پیرا ابھی تک چائے نہیں پایا؟

ایک رات کی بات — ایک دوسری رات کی بات کو بڑی سڑی پڑی تھی اور صبح بازاروں میں دس بجے تک دھند چلی ہوئی تھی۔ دو دنوں یونیورسٹی کیفے کے نیم گرم کیسین میں بیٹھے گرم گرم خوشبودار چائے پی رہے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں ناؤمی نے بتایا کہ جس لڑکے سے اس کی سنگنی ہو چکی ہے اس کا نام ڈیوڈ ہے۔ یہی ڈیوڈ! وہ حیفہ میں پڑھ رہا ہے، جہاں اس کا باپ چھوٹے اور اون کا کاروبار کرتا ہے۔ جب وہ پڑھ لکھ لے گا، اور وہ بھی تعلیم سے فارغ ہو جائے گی تو ان دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ پھر وہ حیفہ چلی جائے گی اور وہیں رہے گی۔ حیفہ — جو اس کا اصل وطن ہے۔ اور جس کے گلی کو بچے اسے خواب کی طرح یاد ہیں۔ اپنے سنگیتر کا ذکر کرتے ہوئے وہ بدستانی لڑکی کی طرح شرما رہی تھی، اور بات کو جلدی ختم کر دینا چاہتی تھی۔ میں نے سگریٹ منگوا کر دیا تو اس نے حیفہ اور یروشلم کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے بھی حیفہ اور یروشلم کے گلی کو چوں سے پیار ہے، اور مجھے بھی وہ کیسی کسی بہت یاد آتے ہیں۔ میں وہاں کسی نہیں گیا لیکن یوں لگتا ہے جیسے میں وہاں سے کسی باہر نہیں نکلا۔ میں ہمیشہ اپنی اونچے نیچے پتھرینے بانا محل میں جاتا کھیلتا رہا ہوں۔ مجھے ان شہروں، ان بازاروں سے محبت ہے، اور ان لوگوں سے محبت ہے جو ہر راہگیر کے سرے شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے وہاں سے گزرا کرتے تھے۔ جو اپنی راہ میں بچے ہوئے کانٹوں پر اس پیار سے پاؤں رکھتے تھے جیسے وہ آنے والی ہزاروں کے بیج ہوں۔ جنہوں نے اس وقت پھول دیئے جب ان پر پتھر پھینکے گئے، جنہوں نے اس وقت محبت کی جب ان سے نفرت کی گئی — ناؤمی! میں بھی اپنی گزشتے ہوئے قافلہ کی اٹنی بھرتی ادا کر رہی ہوں۔ اسی آفتاب کی بھڑکی ہوئی حقیر سی کرن ہوں۔ اس کرن کی روشنی کا آخری نقطہ ہوں — میں ان بازاروں، ان بٹلوں اور ان بڑوں کے کیسینوں میں تنہا ہوں۔ لیکن میری تنہائیاں اکیلی نہیں ہیں۔ ان میں کہیں یروشلم کے مینار ہیں، کہیں مجور کے کلس ہیں، اور کہیں قرطبہ کے گنبد، اور کہیں سیلونی ناریوں کے جھنڈ ہیں۔ حیفہ پہنچ کر میرا بھی انتظار کرتا۔ شاید کسی دن تم اپنے خاندان کے ساتھ کسی خوبصورت ٹرک پر چل رہی ہو تو میں بس میں سے اتر کر تمہاری طرف بڑھوں اور تمہارے قدموں پر ہونٹے کے چول رکھ کر تمہیں کہوں

”ناؤمی! میں آگیا ہوں — دیکھو میں آگیا ہوں!“

شاید میں کہیں وہاں پہنچوں — شاید!

ایک دھندلی سی شام کو ناؤمی نے اسی جگہ بیٹھ کر مجھے دیر بٹے نیل کے تاجوں کا وہ غلغلی گیت سنایا۔

”نیل! پیارے نیل!“

تیرے آسمان پر تارے سدا جلتے ہیں،

تیرے کھجور کے درخت کہیں نہ سوکھیں،

ہماری کھیتوں کو بھی برا بھلا کر دے،

نیل! پیارے نیل!“

اور پھر ایک دن وہ اپنے باپ کے ساتھ واپس قابرو چلی گئی۔ میں جوائی اڈے پر اسے چھوڑنے گیا۔ اس دن جوائی سردی تھی۔ چار بجے اٹھتا ہوا سڑک پر دھند بھاٹی تھی۔ جوائی اڈے پر لوگ بے کوشاد گرم سکر لیٹے اور ہر کھڑے ہاتھوں کو گرما رہے تھے۔ اور قمرس بوتلوں سے پانی نکال کر پی رہے تھے۔ ناؤ می اپنے باپ کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا باپ اپنے چچا ایک دوستوں سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ لپک کر ہمارے میں آئی اور بولی

”میں نے سوچا شاید تم نہ آؤ؟“

”یہ کیسے ہو سکتا تھا بھلا؟“

میں نے دستاں میں سے ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔ اس کے باپ نے خندہ پیشانی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں اونٹاؤمی برائے سے اس نے ہرادرہ کی باتیں کرتے رہے۔ اس نے بھوسلے رنگ کی ٹوئڈ کا زناہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور سر پر گرم لیڈی فیٹ تھی، اور صبح کے دھندلے میں اس کی بھوری آنکھیں کبھی چمک اٹھتی تھیں کبھی بج جاتی تھیں۔

جہاز کے چھنے میں صرٹ پانچ منٹ باقی تھے۔ ناؤمی نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ”دوست! ہم نے بڑے خوبصورت دن اکٹھے گزارے ہیں“ انہیں بھول نہ جانا۔

میں بھی انہیں یاد رکھوں گی۔ شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں۔

اس کا باپ میری طرف بڑھا

”سولنگ ماٹی سن!“

ناؤمی نے مجھ سے ہاتھ ملایا

”خطا مرزور کھنا۔“

”تم بھی مرزور کھنا۔“

”ہاں، میں بھی لکھوں گی۔“

وہ جہاز میں سوار ہو گئی۔ جہاز کے پردوں میں طوفانی گردش پیدا ہوئی۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ آسمان پر اڑتے ہوئے صبح کی دھند میں غائب ہو گیا۔

* * * * *

رات گری جوسنے لگی ہے۔ خلی بڑھ گئی ہے۔ تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟

میرا منہ لے لو۔ ہا۔۔۔ آج چائے کا ذائقہ کس قدر سکون اور فکر انگیز ہے۔ تم بھی کچھ بولو میرے دوست! تم چپ کیوں

ہو؟ آج ہم دونوں اکیلے ہیں۔ دونوں آندوہ ہیں۔ رات کے سمندر کے دو گناںم جزیرے!

آج میں نے اپنی محبت کو لوگوں کے ہجوم میں سے گزرتے دیکھا، اس کا رنگ فق تھا، چہرہ اترتا ہوا تھا۔ اور وہ زگس کا سر جھلایا ہوا

پھریلے خالی خالی آنکھوں سے آسمان کو تک رہی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ لیکن اب افسوس سے کیا ہوگا۔ جب کچھ باقی نہیں

رہا تو پھر یہ افسوس بھی کیوں رہے۔ آؤ آج اس افسوس کا بھی گلا گھونٹ دیں۔ اور پھر لوگوں کو بتائیں کہ دیکھو۔ یہاں وہ دفن ہے

بیرا —
ابھی لایا جناب!

.....
ایک دن — ایک بڑی سردی پڑی تھی، اور صبح بانادوں میں دس بجے تک دھند چلی ہوئی تھی۔ ہم وہ فوں یونیورسٹی کینے کے نیم گرم کیسین میں بیٹھے گرم گرم خوشبودار چائے پی رہے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں ناؤمی نے بتایا کہ جس لڑکے سے اس کی سنگنی بچہ لگی ہے اس کا نام ڈیوڈ ہے — یہی ڈیوڈ! وہ حیفہ میں پڑھ رہا ہے، جہاں اس کا باپ چپڑے افادہ کا کاروبار کرتا ہے۔ جب وہ پڑھ لکھ لے گا، اور وہ بھی تعلیم سے فارغ ہو جائے گی تو ان دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ پھر وہ حیفہ چلی جائے گی اور وہیں رہے گی۔ حیفہ — جو ہنس کا اصلی وطن ہے۔ اور جس کے گلی کو چھ اسے خواب کی طرح یاد ہیں۔ اپنے سنگیتر کا ذکر کرتے ہوئے وہ بدستانی لڑکی کی طرح شرمیلی تھی، اور بات کو جلدی ختم کر دینا چاہتی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگا یا تو یہ بتایا کہ اس سے حیفہ اور یروشلم کی باتیں کرتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے بھی حیفہ اور یروشلم کے گلی کوچوں سے پیار ہے، اور مجھے بھی وہ کبھی کبھی بہت یاد آتے ہیں۔ میں وہاں کبھی نہیں گیا لیکن یوں لگتا ہے جیسے میں وہاں سے کبھی باہر نہیں نکلا۔ میں ہمیشہ انہی اونچے نیچے پتھر پر بانادوں میں جھانکنا کھیلتا رہا ہوں۔ مجھے ان شہروں، ان بانادوں سے محبت ہے، اور ان لوگوں سے محبت ہے جو ہر راہگیر کے سر شفق جیسا ہاتھ رکھتے ہوئے وہاں سے گزرا کرتے تھے۔ جو اپنی ماد میں بچے ہوئے کانٹوں پر اس پیار سے پاؤں رکھتے تھے جیسے وہ آٹے والی ہاروں کے بیج ہوں۔ جنہوں نے اس وقت پھول دینے جب ان پر پتھر پھینکے گئے، جنہوں نے اس وقت محبت کی جب ان سے نفرت کی گئی — ناؤمی! میں بھی اپنی گزرتے ہوئے قافلوں کی اٹتی پھرتی، آوازہ گرد ہوں۔ اسی آفتاب کی بھڑی ہوئی حقیر سی کرن ہوں۔ اس کرن کی روشنی کا آخری نقطہ ہوں — میں ان بانادوں، ان ٹولوں اور ان بڑھوں کے کیسینوں میں تنہا ہوں۔ لیکن میری تنہائیاں اکیلی نہیں ہیں۔ ان میں کیسین یروشلم کے مینار ہیں، کیسین مجور کے کلس ہیں، اور کیسین قرطیس کے گنبد، اور کیسین سیونی نارہیوں کے جھنڈ ہیں۔ حیفہ پہنچ کر میرا بھی انتظار کرنا۔ شاید کسی دن تم اپنے خاندان کے ساتھ کسی خوبصورت ٹرک پر چل رہی ہو تو میں بس میں سے اتر کر تمہاری طرٹ بڑھوں اور تمہارے قدموں پر سوتے کے پھول رکھ کر تمہیں کہوں

ناؤمی! میں آگیا ہوں — دیکھو میں آگیا ہوں!

شاید میں کبھی وہاں پہنچوں — شاید!

.....
ایک دھندلی سی شام کو ناؤمی نے اسی جگہ بیٹھ کر مجھے دریائے نیل کے ملاحوں کا وہ غمگین گیت سنایا۔

نیل! پیارے نیل!

تیرے آسمان پر تارے سدا جلتے ہیں،

تیرے کجور کے درخت کبھی نہ سوکھیں،

ہماری کھیتوں کو بھی برا بھلا کر دے،

نیل! پیارے نیل!

ادب صحت اور ایک دن وہ اپنے باپ کے ساتھ واپس قابو چلی گئی۔ میں بھائی اڈے پر اسے چھوٹنے گیا۔ اس دن فنی سردی تھی۔ مجھے کچھ چار بجے اٹھنا پڑا۔ سڑکیں پر دھند چھائی تھی۔ بھائی اڈے پر لوگ لمبے کٹ اور گرم سفر پیٹے اور ہرادر کھڑے ہاتھوں کو گرم رہے تھے۔ اور قمرس بوتلوں سے چائے نکال کر پی رہے تھے۔ ناؤ میں اپنے باپ کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا باپ اپنے چند ایک دوستوں سے باتیں کر رہا تھا۔ تھکے تھکے کردہ لپک کر باہر سے میں آئی اور بولی

”میں نے سوچا شاید تم نہ آؤ؟“

”یہ کیسے ہو سکتا تھا بھلا؟“

میں نے دستانے میں سے ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔ اس کے باپ نے خندہ پیشانی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں اور ناؤ میں برائے میں کھڑے اور ہرادر کی باتیں کرتے رہے۔ اس نے بھوسے رنگ کی ٹویڈ کا زناہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور سر پر گرم لیٹی فیلٹ تھی، اور صبح کے دھندلے میں اس کی بھوری آنکھیں کبھی چمک اٹھتی تھیں کبھی بج جاتی تھیں۔

جہاز کے چلنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ ناؤ میں نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو

”دوست! ہم نے بڑے خوبصورت دن اکٹھے گزارا۔ میں انہیں بھول نہ جانا۔“

میں بھی انہیں یاد رکھوں گی۔ شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں۔“

اس کا باپ میری طرف بڑھا

”سو لائگ ائی سن!“

ناؤ میں نے مجھ سے ہاتھ ملایا

”خطا مزور لکھنا۔“

”تم بھی مزور لکھنا۔“

”ہاں، میں بھی لکھوں گی۔“

وہ جہاز میں سوار ہو گئی۔ جہاز کے پردوں میں طوفانی گردش پیدا ہوئی۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ آسمان پر اڑتے ہوئے صبح کی دھند میں

غائب ہو گیا۔

x x x x x x x

مات گری ہونے لگی ہے۔ نکلی بڑھ گئی ہے۔ تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟

میرا سفر لے لو۔ ہا۔۔۔ آج چائے کا ذائقہ کس قدر پر سکون اور فکر انگیز ہے۔ تم بھی کچھ بولو میرے دوست! تم چپ کیوں

ہو؟ آج ہم دونوں اکیلے ہیں۔ دونوں آندروہ ہیں۔ رات کے سمندر کے دو گناہم جزیروں!

آج میں نے اپنی محبت کو لوگوں کے ہجوم میں سے گزرتے دیکھا، اس کا رنگ فق تھا، چہرہ اترتا ہوا تھا۔ اور وہ زنگس کا سر جھلایا ہوا

پہرے لگے خالی خالی آنکھوں سے آسمان کو تنگ رہی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ لیکن اب افسوس سے کیا ہوگا۔ جب کچھ باقی نہیں

رہا تو پھر افسوس بھی کیوں رہے۔ آؤ آج اس افسوس کا بھی گلا گھونٹ دیں۔ اور پھر لوگوں کو بتائیں کہ دیکھو۔۔۔ یہاں وہ دفن ہے

جس کی محبت کا ہمیں کوئی افسوس نہیں ہے۔ مجھے ان لوگوں سے جدا ہو جانا چاہئے۔ جدائی کے سبب دل خالی ہوتے ہیں۔ اور جب دل خالی ہوتا ہے تو آنکھیں بھرتی ہیں۔ لیکن آنسو جدائی کی اس گھڑی کو نہیں روک سکتے۔ وہ تو خود نہیں رکھتے۔ وہ کسی دوسرے کو لیا رکھیں گے۔ میں ان لوگوں سے کبھی جدا نہ ہونے کے لئے ملا تھا۔ اور اب کبھی نہ ہونے کے لئے جدا ہو رہا ہوں۔

دیکھو ڈھلان پہاں درختوں کی قطار کے اور ستاروں کی ٹولی نمودار ہوئی ہے۔

یہ رات کے ماتھے کا جھومر ہے۔ آج رات میری محبت کے ماتھے پر بھی اسی طرح کا ایک جھومر سجایا جائے گا۔ اور پھر صبح وہ ڈولی میں بٹھا کر رخصت کر دی جائے گی۔

ہونے والی دہن! خدا تھا یا سہاگ سلامت رکھے!

نئی زندگی کے قالمیں پر قدم رکھنے سے پہلے پاؤں پر بھی ہوئی یادوں کی گرد جھاڑ دینا۔ کم خراب اور ریشم پر بیٹھے بیٹھے سوت اور کھد کو یاد نہ کرنا۔ اور گھر سے رخصت ہوتے ہوئے ان پرانے دنوں، بیتے دنوں سے بھی رخصت مانگ لینا جو چلوں پر آنسوؤں کے دیپ لٹے کچھ دور تمہاری ڈولی کے ہمراہ ضرور آئیں گے۔ تم میرا خیال نہ کرنا۔ میری محبت نے ہمیشہ الوداعی گیت ہی گائے ہیں وہ دوست بن کر آتی ہے اور دہن بن کر چلی گئی ہے۔ وہ ہمیشہ ڈولی کے ساتھ ساتھ روتی ہوئی گئی ہے۔ آج میں نے گم شدہ محبتوں کے درخت کو بڑے زور سے جھنجھوڑا ہے۔ اور اس کی ٹہنیوں پر سے یادوں کے ان گنت پھل ٹوٹ کر میرے قدموں میں بکھر گئے ہیں۔

آج مجھے بڑے پرانے گیت — بڑے اداس گیت یاد آ رہے ہیں۔

آج میں اپنی ویران محبتوں کے سرہانے کھڑے ہو کر وہ تمام مرثیے پڑھنا چاہتا ہوں جنہیں بہارِ خزاں کے زرد پتوں پر دم توڑنا چھوڑ گئی ہے۔ میری یادوں کے سائے چہرے کھلا گئے ہیں۔ اور میں ان چہروں پر آنے والی بہاروں کا صندل چھڑکنا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے دوست! ویران رات کی اس اداس گھڑی میں ان بھولوں کا ذکر چھڑیں جو ہم سے بچھڑ کر چلے گئے ہیں۔ اور ان گیتوں کے دیپ جلاتیں جن کے جہاز بھی ہوئی چٹانوں سے ٹکرا کر ڈوب چکے ہیں۔ آؤ ناؤ می کو ڈھونڈیں، سدھا کو ڈھونڈیں۔ روپل کے بھولوں اور موتیوں کی نکلیوں کی تلاش میں نکلیں۔

نیل! پیارے نیل!

تیرے آسمان پر تارے سا چمکتے رہیں،

ہماری کھیتیاں کب ہری بھری ہوں گی!

نیل! پیارے نیل!!

اک نکار آتشیں رخ...

یوں تو یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی بے حد معمولی سا بھنی طور پر بیاہ شاعر "عظیم" مشتاق شاعری کرتے کرتے ان گنت محبت کی فطریں کھٹ ڈالنے کے بعد ایک سوہ اور گھٹیا قسم کی سیکر اور فوسلی نظم لکھ کر سے۔ یعنی وہ زندگی میں اسے دن کے بے شمار چھوٹے چھوٹے واقعات کی طرح ایک نہایت غیر اہم اور ناقابل توجہ کی بات تھی۔ یہ گھٹیا بڑی عجیب اور غیر معمولی بات تو ہمیں بھی جس پر اس قدر سنجیدگی اور توجہ دی سے غور کیا جائے۔ اسے بھی کیا تو اس جو زندگی کا ایک دن اور گزر گیا۔ یہ بھی کوئی افسوس کرنے کی بات ہے۔ یہ تو زندگی کا پتھر ہے جو یوں ہی ہمیشہ چلتا رہتا ہے اور کبھی رکتے کا نام نہیں لیتا۔ اور ویسے بھی اتنی زیادہ مصروف اور بھری زندگی میں کس کو اتنی ذرا سی بات پر سوچ بچار کرنے کا موقع ملتا ہے۔

لیکن وسط مارچ کی اس شام کو جب اس پاس کے راسے، رشتوں کے سلیے گہرے ہو چکے تھے۔ خاموش نیلے آسمان میں شفق کی کھل گلابی آہستہ آہستہ گھول رہی تھی۔ آسمان کی پہاڑیوں میں ہلکا سی گنت غم گیا تھا۔ اور ہریم بہار میں پہلے پہل کھلنے والے بھول کیاریوں میں اپنا سرو کاٹے چپ چاپ کھڑے تھے اور ان کی جینے جینے سنگد سے ساری فضا بھری ہوئی تھی۔ اس گھڑی دن بھر انگریزی ادب کی بہت ساری موٹی موٹی غیر محسب کتابوں میں سرکھپانے کے بعد اعظم پر ویز نے اپنی فکر میں شاید پہلی بار نہایت بے کہنی کے عالم میں یہ محسوس کیا کہ واقعہ وہ بہت تھک گیا ہے۔ خیالات کی ساری گلیاں سونی ہو گئی ہیں اور زندگی کا سست کارواں بھٹکتے بھٹکتے ان اجاڑ اور سست راستوں کی طرف نکل آیا ہے۔ جہاں ہر طرف کو دیر کی کتابوں کے اوراق بکھرے پڑے ہیں۔ ہر طرف اسی چھائی ہے۔ کوئی ہماچی نہیں کوئی پہل پہل نہیں۔ اب کوئی فتنہ نہیں اٹھتا۔ اب کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوتا۔ وہی ڈکے ہیں۔ وہی ساتھی ہیں۔ وہی سب لوگ ہیں۔ لیکن سب پر مومن طاری ہے۔ سب پر چھو و طاری ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ سب باتیں پرانی ہو گئی ہیں جو زندگی کی شاخ کو مسرت اور بے فکری کے نرم جھونکوں سے ہلاتی رہتی تھیں۔ اب بھولے سے بھی کلاس چھوڑ کر بھاگنے اور دن بھر کام میں پگ پانگ کھیلنے یا ہوسٹل کے لان میں صبح سے شام تک کرکٹ کا میچ کھیتے رہتے کو بھی نہیں بچا رہا۔ امداد اب رات کے وقت وارڈن کے کمرے سے دور جا کر اس قدر دور زد سے بے معنی اور فضول بحثوں میں گلا پھاڑ پھاڑ کر بھگڑنے اور شور مچا کر ساری دنیا کو سر پر اٹھانے اور بے لگے گونج و اقباع لگانے کو طبیعت چاہتی ہے۔ اسی طرح طوفان اٹھانے کا بھی کوئی ارادہ نہیں کہ وارڈن صاحب بچا ہے۔ ہند سے اٹھ کر بڑھتے ہوئے ہمارے پاس آجائیں اور پھر ہم ان سے نہایت مصروفیت کے ساتھ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں قلم یہ کہہ رہیں کہ صاحب! ہم تو کچھ ایسا زلیوہ شور و غل نہیں مچا رہے تھے البتہ ان وڈن آپ کے کان ہی کچھ زیادہ حساس ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ سوئی ہوئی سیاہ راتوں میں کھڑے آلی مسجد کی پخت پر جمع ہو کر اپنے ایک کنڈل کلب کی "انڈر گراؤنڈ" میٹنگ کرنے کا تو اب خیال ہی نہیں آتا۔ اب تو ہر گرج یہ سب باتیں آئی گئی سی لگتی ہیں۔ اب تو صرف کتابوں کو من چاہے یا نہ چاہے پڑھنا ہے اور انہی کے بارے میں سوچنا ہے۔ (دہ جانے کب شروع ہو کر ختم ہو گا امتحان؟)

اعظم پر ویز نے بڑی گھبراہٹ اور ایک عجیب سی تلخی آئیز پر ہنسنے کے ساتھ سوچا۔

پھر وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

شام بالکل خاموش تھی۔

اس وقت اعظم پرویز کو فخر شہزادی ملوہہ انگریزی کی وہ نظم یاد آئی جس میں شاعر نے آسمان کی دستوں پر پہیلی ہوئی اماں شام کو اس آئینہ میں اپنا اور
چرخ کوں کہا تھا جس طرح اسپتال میں کوئی مریض اپنی پیش پیش پر بے حس و حرکت پڑا ہو۔

پھر شام کے دھندلے سایے خاموشی کے ساتھ چپکے سے چپٹ کر سر گئے۔ اور ہر طرف اندھیرا بھانے لگا۔ اور صوفیوں پر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ پوٹل
کی دوسری منزل کی ساری بالکونی دیواریں ڈری تھیں۔ وہ بھی بالکل خالی پڑا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف خاموشی تھی اور تنہائی۔ تنہائی بڑوں سے
ڈھکے ہوئے دروازے کے فنس (FENCE) سے اس پار سے گزرتی ہوئی گوشت کھانے والی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی اشاف کلب کی طرف جاتی تھی
کسی پرنس کی کار یا پھر ٹرولر و تقریب کے بعد تصویریں لے کر طرف جاتے ہوئے واکوں کی کون ٹول اور اسے شرمیلی ہوئی گھبراہٹ تو ظاہر ہوتی تھی خاموشی کا نظم
ٹوٹ جاتا اور اپنے آپ ہی ربا عروس ہونے لگتا۔ جیسے کسی منتی نے بڑی دیو کی خاموشی کے بد اپنے سامنے رکھے ہوئے دروازے کے تاروں کو یکایک دور سے
جھنکا دیا ہو۔ اور قریب ہی ہاشوک کے گئے درختوں کی لمبی کلا تھلک کے اس جانب سرخ و سفید والے پوٹل کے کسی کمرے میں بیٹھا ہوا اسفندیار ایرانی داخلین پر
مسئل "MOVEMENT OF CAMELS IN THE DESERT" کی دھن بجا رہا تھا۔ لیکن اس کے داخلے کی مدد آواز نہ تھا بلکہ کوئی حرکت
نہ تھی۔ اس کو ٹھٹھکی نہیں دیا۔ وہ بڑے ہیاد سے تھپک تھپک کر سوائے دے رہی تھی۔

پوٹل کے سارے لٹکے ایک ایک کمرے کے شام کی تعزیر کے لئے اپنے کمروں سے نکل گئے تھے۔ صرف جنوبی ہند کا ایک لڑکا رہ گیا تھا جو اس روز
خلاف معمول باہر نہیں گیا تھا۔ شاید آج اس کے ہم وطن دوست اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے نہ آئے ہوں۔ وہ بڑے غم ناک لہجے میں کچھ گنگنا رہا
تھا۔ یہ اس کی عادت ہو گئی تھی کہ ہر وقت وہ کچھ نہ کچھ گنگنا رہتا۔ کچھ لوگوں کا تو اس کے متعلق یہ خیال تھا کہ لڑکا کور کو چھینے سے سینکڑوں میل دور شمالی ہند میں آکر
اگر اس کو کوئی چیز پسند آئی ہے تو وہ ہندوستانی زبان کے غلی گانے ہیں۔ میں اور کچھ نہیں۔ اس کی آواز اس قدر تیز اور کرجت تھی کہ پوٹل کے اسی
دنگ کے سارے لٹکے جھریں رہ رہتا تھا اس سے بیزار تھے۔ یہ بھی کیا کہ ہر وقت گاتے رہو۔ نہ صبح دیکھنا، نہ شام۔ کچھ لڑکے جو تانوں کے طالب علم تھے
لیکن کلاس کبھی نہیں جاتے تھے اور آئندہ اگر کوئی دوسرا کام نہ لے سکا تو پھر دیل بننے کا نہایت خطرناک ارادہ رکھتے تھے۔ اس سے تعریفات ہند کے کسی دفعہ کا
حوالہ دیتے ہوئے کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ "اسے مسٹر رائے فرام ساتھ لے آؤ! بند کرو اپنی یہ ہر وقت کی راگنی، نہیں تو ہم تم کو کورٹ میں نوٹس دے کر گھسیٹ
لے چلیں گے۔ کچھ لڑکے جو درازیاں، جمہوریت پسند واقع ہوئے تھے اس کو کئی دفعہ یہ بتا چکے تھے کہ ہم لوگ تمہارے سامنے یہی ہرگز تھیلیں اکٹھا کر کے پیش
کرنے والے ہیں جس سے مجبور ہو کر تم اپنی نہایت سریلی نائیں ہمیشہ کے لئے بند کر دو گے۔ لیکن ہر بار وہ کچھ ڈر کر، کچھ شکر کر بڑی بجا جنت اور شرمندگی کے ساتھ
معافی مانگ لیتا۔ مگر معافی مانگنے کے کچھ ہی دیر بعد اس کو پھر معافی مانگنی پڑتی اور وہ پھر گانے لگتا۔ اس وقت بھی وہ بالکونی کی ریلنگ پر بٹھکا ہوا بار بار سرگوشی
کے انداز میں گاتے مار رہا تھا "وہ دن کہاں گئے بتا۔۔۔"

اعظم پرویز نے سوچا کہ آخر اتنی دیر سے وہ یہی گیت کیوں گارہا ہے۔ دوسرے غمی گیت بھی تو اس کو یاد ہیں جنہیں وہ وقت بے وقت گایا کرتا ہے۔
ہر گیت سے اس کی ایک ایسی ہی شام کی کوئی بھولی بسری کہانی وابستہ ہو۔ جیسے ہونے والوں کا کوئی رنگین خواب متعلق ہو جس کو
یاد کر کے اس کے ذہن میں پُرانی یادوں کے چراغ جھللا اٹھتے ہوں۔ اور پھر اس کو اپنے دور دراز وطن کے کسی بہرے بھرے گاؤں کی کوئی سڑک
صورت یاد آگئی ہو جو آج بھی نایل کے ٹھنڈے کنوئیں میں یا پھر کسی خوبصورت جھیل کے ٹھیرے ہوئے پانیوں کے پاس یا کسی دھان کے ہلکے ہونے
کھیت کے کناروں پر اس کی یاد کا دیب جلائے، اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اس گانے سے اس کو ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ملتی ہوگی۔ کچھ اطمینان اور کچھ تسکین
ہونا ہوگا۔ وہ اس گیت کا پہلا بول بچا سوس و فہ لگتا رہا تھا۔

جب ہر طرف خاموشی طاری ہو اور لمحہ بہ لمحہ اُداسی بڑھتی جا رہی ہو اور دل درد سے بھر گیا ہو اور بے کینی کے احساس سے مذہم حال ہو کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کیا کیا ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں اگر کوئی کانوں میں بار بار یہ کہے: "وہ دن کہاں گئے بتاؤ؟" تو کیا محسوس ہوتا ہے۔ اچھا لگے کوئی جھیل سکوت کے عالم میں ہو۔ اس میں اگرچہ کچھ لہروں کا کہیں دور و نزدیک پڑ نشان نہ ہو۔ اُداسی حالت میں اگر کوئی اس کی سوتی ہوئی خاموشی سطح پر پتھر کا ایک ٹکڑا پھینک دے تو کیا ہوتا ہے؟ — پانی چل چل جاتا ہے نا! — بالکل ایسا ہی اُس گانے کے پہلے بول نے اعظم پرویز کے ساتھ کیا۔ وہ بالکل اُداس اور انتہائی بدیت نے عالم میں مٹیا ہوا اس طرح رہا تھا کہ جیسے نوخیوں کے امانوں کے دن اب واقعی ختم ہو گئے ہیں۔ اب نصاب میں مسرت کے سنہری شہر شاید ہی کبھی پھر چڑھیں۔ ہر طرف اُداس گردینے اور دکھناورینے والی بچھائیاں بکھوٹی ہیں۔ لیکن وہ دن کہاں گئے بتاؤ؟ کبھی ہم اور پراسرار سوال اس کو ایک نئے احساس کی دنیا میں لے آئے جتنی پہلی باتیں اُس کے خیالوں میں ابھکیں گئے تھیں۔ اور وہ دنیا جو کب کی سوتی ہوئی تھی پھر سے اٹھ اُٹھائی لے کر جاگ اٹھی۔

وہ دن کہاں گئے بتاؤ؟ —

اُداسے بھی کیا باتیں کہ وہ دن کہاں گئے۔ یہ تو ٹیڈی ہے کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ بس اتنا معلوم ہے کہ وہ دلی بہت اچھے تھے اور وہ دن ایک ایک کر کے بیت گئے۔ جب ہر روز صبح ہوتی تو ہم سب انگلوں بھرے دل سے کتنی خوشی کے ساتھ کہتے کہ دیکھو! ایک نئے دن کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر وہ سرد دن طلوع ہوتا۔ پھر تپسلا اور اسی طرح دن پر دن حال کی سرحدوں کو چھوٹے ہوئے ماضی کی اظہان اور پھر سرد بیتوں کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ بہتے ہوئے چلے گئے اور کسی کو اس کا احساس تک نہ ہوا کہ دیکھتے دیکھتے اتنے سارے پیارے دن اور اتنی ساری پائی باتیں گزر گئیں۔ آج اُن کو یاد کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی کے مٹے پسپوں کا حسین طلسم دفنہ ٹوٹ جائے اور پھر ابھی آنکھیں مل کر اپنے چاروں طرف عیرت سے دیکھتے ہوئے کوئی کہہ اُٹھے کہ اُداسے یہ دنیا اتنی بدل کیسے گئی اور وہ بھی اتنی جلدی۔

پچھلے تھے سرسبز لہاں ہل کے سالانہ اُداسی ڈزے والی کے بعد کافی رات گئے ہوٹل کے پیچھے لگے ہوئے پچھلے کچھس اور پیام کے خاموشی و خوں کے موٹ سے جاڑے کے آخری ایام کا حسین ٹنڈا اور سہانا چاند دھیرے دھیرے نکل رہا تھا اور چاندنی کا دودھیالی چادر یہی ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ ساری دنیا کے ہلکے سروں میں کچھ گنگناہی تھی۔ رات سہ لحاظ سے رونا تک تھی۔ ایسی ہی راتوں میں شاعروں کے خیالوں میں رنگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں۔ کچھ سوتی، کچھ جاگتی آنکھوں میں دھورے پلے کے خوابوں کی تعبیر جھلکتی ہے۔ حسن کی چمکیں شراب کا آہستہ سے اُٹھتی ہیں اور کچھ کہہ کر پھر جھک جاتی ہیں۔ پھر خیالات کی دھارا اور تیز ہو جاتی ہے۔ لیکن اعظم پرویز نے اس سہانی رات کو کچھ بھی نہ سوچا۔ البتہ نصیر زہیری نے رات کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر یہ شعر کہتا تھا کہ یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ہماری NON-SERIOUS PARTY ان دنوں اپنے راستے سے ہٹ گئی ہے اور اس قدر SERIOUS بن گئی ہے کہ سوائے پڑھنے اور امتحان کے دنیا کی کسی اور چیز کے متعلق سوچتی ہی نہیں۔ مگر یہ ابن الوقتی نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ مجھے بتاؤ۔ جیسا شعر دیکھا دیکھتے ہوئے۔ یہ کوئی مذاق نہیں بلکہ سرچنے اور رونے کی بات ہے۔ ابھی ہم کل کیا تھے اور آج کیا ہو گئے۔ یہ "انقلاب" ہمارے لئے سخت نازیبا ہے۔ یہ اپنے محسوس کردار سے فطری ہے۔ دیکھو چاند کا خاموش چہرہ کتنا خوبصورت ہے۔ یہ رات کتنی حسین ہے۔ آؤ چلیں اور ان چاندنی سے دھکی ہو کر گریز کردار گریز کریں جو نہ جانے کب سے ہماری راہ دیکھ رہی ہیں۔ خوب دلچسپ اور مزیدار باتیں کریں۔ قہقہے لگائیں۔ شور مچائیں۔ مدد نہ کریں۔ میں کہتا ہوں بھی آخر اتنا زیادہ پڑھ کر کیا کرو گے۔ بہت پڑھ لیا ہے۔ لیکن اعظم پرویز نے نصیر زہیری کی باتوں کو الٹی سنی کر دیا اور اچھی کتابیں لیں میں جا کر سنار لائبریری کی طرف چلا گیا۔ نصیر زہیری کا دل جیسے چٹھ گیا اور اپنے کمرے میں جا کر اس نے مسائیات کی ایک موٹی کتاب ڈی بے ڈی کے ساتھ جمائیاں لے لے کر پڑھنی شروع کر دی۔

اس دن سے کئی ہفتے قبل اعظم پرویز نے اپنے چاروں طوط پھیلے ہوئے چھوٹی سی دنیا کا جائزہ لیا تو اس کو سخت اچھا ہوا اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا، تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا۔ کیسی زمین بنائی، کیا آسمان بنایا۔ اور جس نے نصیر زبیری کی پارٹی بھی بنائی۔ کچھ خدا بڑا رحیم اور کارساز ہے۔ کچھ لوگ تو نصیر زبیری کی پارٹی کی دن و دن رات چوگونی ترقی دیکھ کر سب سے کہتے پھرتے تھے کہ یہ پارٹی وارٹی تو خیر کیا ہے اصل میں یہ ایک ایسی ٹولی ہے جس کے سارے ممبر شیطان کے گرد ہیں جنہیں دوسروں کی برائیاں دیکھنے، کچھ اُچھالنے اور دوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ کچھ اور آتا ہی نہیں۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ ماہرہ کا جو نصیر زبیری ہے نا، اس کم نعت ۲۲ آدمی نے اپنے گرد خدا کی نہ جانے کیسی مخلوق جمع کر رکھی ہے۔ سب کے سب نہایت غیر ذمہ دار اور غیر بخیرہ قسم کے انسان ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو نصیر زبیری کی پارٹی نہایت اہم تھی۔ یا لوگوں نے اس کو اہم بنا دیا تھا۔ اس کے سارے ممبر بڑے پر غور تھے اور کبھی ذاتی مفاد کو اپنے پاس تک پھٹنے نہ دیتے تھے۔ اور کبھی اس پارٹی کے اندر ملک کی سیاسی پارٹیوں کی طرح پھوٹ، گتھ بندی اور اختلاف نہیں ہوا تھا۔ اس کے سارے ممبر ایک ہی رٹی کو کھانے پیتے تھے۔ وہ سب کے سب دنیا کو ایک ایسی شے سمجھتے تھے جس پر ہمیشہ طریہ ڈراے کھیلے جاتے ہیں۔ جو اس دنیا میں خوش نہیں رہ سکتا۔ جو حقہ نہیں لگا سکتا جو مصیبتوں سے ٹکرا کر شکر نہیں سکتا۔ وہ انسان نہیں ہے۔ وہ ہماری پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا۔ یہ چھوٹا سا اعلان نامہ نصیر زبیری نے خود لکھا تھا اور سارے ممبروں نے اس پر روشنائی سے دستخط کئے تھے۔ خون سے نہیں، اس لئے کہ وہ مجنوں نہیں تھے۔

اس پارٹی کا بانی اور لیڈر اور کتیا دھرتا نصیر زبیری ہی تھا۔ بڑا تیز اور عجیب کیلنڈر کا انسان تھا۔ اس کے اتنا پتلہ پرزہ آدمی تو دھڑکتے سے شاید ہی کہیں مل سکے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ آدمی ہے یا گھن چکر۔ یا ایک سوا بیہ نشان جس کا جواب کسی کو بھی نہیں معلوم۔ ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ ہے، ابھی ہنس رہا تھا تو ابھی شور مچانے لگا۔ شور مچا کر ذرا چپ ہوا تو پھر باتیں کرنے لگا۔ اور ہاتھوں کو منہ کے بعد چپ ہوا تو پھر باتیں کرنے لگا۔ اس سے اگر کہا جاتا کہ تم ذرا کم باتیں کیا کرو تو وہ جگر کرکھا کیوں؟ آخر کیوں؟ یہ تو ایک بات ابھی ہے جس کو میں نے اپنے قومی رہنماؤں سے بیکھا ہے دوسری بات جو میں ان سے سیکھنے کی ان دنوں کوشش کر رہا ہوں وہ ہے منصوبہ بندی جو ہمارے یتا ڈرائنگ روم اور دفاتروں میں بیٹھ کر آئے دن کوئے رہتے ہیں۔ جب میں یہ کام پوری طرح سیکھ چکوں گا۔ تو پھر خوب اسیکیں بناؤں گا اور اس طرح اپنے آپ کو دھوکا دوں گا۔ لیکن یہ کام خدا مشکل ہے اس لئے کہ میرے پاس نہ تو کوئی ڈرائنگ روم ہے اور نہ دفتر۔ تو پھر میں یہ اسیکیں کہاں بیٹھ کر بناؤں گا۔ غرض نصیر زبیری عجیب باغ و بیار انسان تھا۔ نفسیاتی تجویز کرنے والوں کی بھڑے بالاتو، وہ اپنے کمرے کو بڑی شان کے ساتھ انکل ٹومز کین کتا تھا۔ وہ کچھ دنوں کے لئے گرمی کی چھٹیوں میں حیدر آباد چلا گیا تھا کہ اس آفت انگشتی۔ اس نے وہاں کے مختصر صبحے میں "ق" کو "خ" کہنا شروع کر دیا! ابھی جھنڈ کیا بول کے بولے کی رٹ لگا کر سب کی ناکیں دم کر دیا۔ دوسرا سب سے اہم ممبر ایک جنوبی افریقہ کا لڑکا تھا۔ کئی سال پہلے جب وہ افریقہ سے ہندوستان آ رہا تھا تو اس کے باپ نے اس کو تین ہائیکس دی تھیں۔ (۱) بڑا کھین نہ کھینا (۲) داڑھی والے انسانوں سے بچنا۔ (۳) کسی ایسی طرح سے پیار ہرگز مت کرنا جو تم سے زیادہ خوشیار ہو۔ اور وہ ان پر بڑی مستعدی سے کاربند رہا۔ وہ ہندوستانی بہت کم جانتا تھا لیکن ہمیشہ بولنے کی کوشش کرتا اور ہندوستانی لباس بھی اکثر پہنتا۔ اس کا گھر جو ہنس برگ میں تھا۔ وہ اپنے تمام قریبی دوستوں سے اکثر کہتا کہ کبھی میرے گھر چلو۔ میری کوٹھی "جو برگ" میں ٹاؤن ہال کے پاس مریس واک میں ہے۔ تم کو واقعی بڑی خوشی ہوگی۔ لیکن نہیں۔۔۔۔۔ نہیں تم کو افسوس ہوگا کیونکہ وہاں ملائی کی حکومت ہے جو تم کو کالا آدمی کہہ کر سفید آدمیوں کے کسی بھی ہٹل میں جانے نہیں دے گی۔ یہ کالے گورے کی تفریق، یہ آدمی آدمی کی تفریق، یہ نسلی امتیاز اور یہ فاشزم کا بھوت۔ ہم سارے ساؤتھ افریقی اب جان گئے ہیں کہ اس کا علاج کیا ہے۔ پھر وہ اپنے کمرے میں لگی ہوئی ڈاکٹر یوسف داد اور ڈاکٹر نیکر کی تصویروں کو بڑی عقیدت کی نظروں سے دیکھنے لگتا۔

تیسرا عظیم پرویز جافانہ لگا رہا تھا۔ سارے لوگ اس سے ڈرتے تھے کہ نہیں وہ اپنے کسی افسانے میں ان کے چہرے پہ نقاب نہ اٹھا دے۔ وہ کوئی ایسا بڑا افسانہ لکھتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اسے ناپ کی حرکت اور مہربانیاں سے کم نہ سمجھتا تھا۔ کہیں سے تھوڑی سی ٹوٹی پھوٹی جگہ لکھ لیتا تھا اور ہر دم جگر اور غم کی باتیں کیا کرتا۔ کچھ بڑے مصنفین کے اقتباسات یاد کرتے تھے جس سے ہر نئے سنے والے پر عجب بایا کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت لگاؤ تھا۔ لیکن پادشہ کا بہت پر غلوں میں رہتا تھا۔ غرض کہ۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پروانہ طبع لوگ
انسوؤں غم کو میر سے محبت نہیں رہی

اعظم پرویز کے علاوہ اور بہت سے میر تھے۔ ایک فاضل پرویز کا تھا جس کا نام سارے میروں نے لی کہ جان گلین رکھ چھوڑا تھا۔ وہ ایک ہی شاعر تھا۔ کسی اپنے باز کو کھلے نہ دیتا۔ اگر کوئی پوچھے بھی تو ہمیشہ گول کر جاتا۔ اس کو دنیا میں صرف دو ہی کام آتے تھے۔ ایک تو فلوپیروں سے غلٹ کرنا اور دوسرے سینے بجانا۔ اس کے علاوہ ایک اسامی رکھا تھا جو سب کو اپنی زبان کی گالیاں سکھاتا تھا اور غارسی میں ایم اے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک اور رکھا تھا تو یہ جو ہمیشہ اپنی محبوبہ کی باتیں کرتا تھا جو بلدی میں کئی آدمیوں سے ایک وقت عشق لڑا رہی تھی۔

ہاں! یاد کیا۔ ایک سردار بھی تھا۔ وہ سندھی ریویجی تھا اور جانندھو سے ایم اے اور ایل ایل بی کرنے وہاں چلا آیا تھا۔ پہلے اس سے تمام لوگ بہت بھڑکتے تھے اور کٹے کٹے رہتے تھے اور وہ چیز ان کے آخریہ لوگ تھے۔ اس قدر دور دور کیوں رہتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تو بہت ہی سویت ہے، ان کی بلادی کا آدمی ہے اور پارٹی کا بہت اچھا ممبر ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ ہر ہندو میں دن پابندی کے ساتھ بک اسٹال سے سویت لینڈ خریدتا اور ہسٹل کے سارے لوگوں میں اس کو پھرتا۔ وہ امن کا سپاہی بھی تھا۔ اس کو سب "پنجاب کا ایلینا" کہتے تھے۔

یہ تھے نصیر زبیری اور اس کی "نان سیوس پارٹی" کے اراکین۔ ایک سے ایک بڑے بڑے لوگ۔ اپنے اپنے فن میں طاق۔ زندگی کو کھیل سمجھنے کے آرٹ کے ماہر کتنی ہی بڑی مصیبت آئے، کتنی ہی گھیر صورت حال پیدا ہو جائے کیا مجال جو کسی کے ماتھے پر ذرا بھی شکن آجائے۔ اپنے اوپر غیر سنجیدگی کا لیل تو ان سب نے یوں ہی لگا رکھا تھا کیونکہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے تھے جو صرف بڑے ہی "بقراط" قسم کے لوگ کرتے ہیں۔ سیاست میں ان کو ذیل مذہب میں ان کو دسترس۔ جنوبی ہند میں کمیونزم کے بڑے بڑے لے کر ہندوستان کے غذائی بحران، روس، نئے چین، برما، فرانس، مارشل ایڈ، کو بیا۔ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز، احمد عباس اور کریم چنگ پر وہ بڑی عالمانہ گفتگو کر سکتے تھے۔ نصیر زبیری اور جان گلین کھنڈ تقریری مقابلے میں گئے تو وہاں سے خوب بڑی سی چاندی کی ٹرائی جیت لائے اور پہلا انعام بھی۔ جنوبی افریقہ والے لڑکے اور اعظم پرویز نے جو انگریزی میں مضامین لکھنے شروع کئے تو ان کے سامنے قلم گھس گئے۔ سردار جو اپنی صافی اور داڑھی کو سنوارنے میں زیادہ لگا رہتا تھا اس نے اگر کچھ نہیں کیا تو کیا کم کیا کہ پنجابی کے بہت سارے گیت لکھ مارے اور وہیں اور نئے چین پر پچیسویں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اور اعظم پرویز نے افسانے لکھ لکھ کر لوگوں کا جواب نہ پڑایا۔

اصل میں ان سبوں نے اپنے اپنے "غیر سنجیدگی" کا لیل ایک خاص وجہ سے لگایا تھا۔ وہ اپنے ماحول سے سخت نا افسوسہ تھے۔ وہ اپنے سماج کی غلط تقسیم اور فرسودہ بنیادوں سے میرا رہتے تھے۔ وہ یونیورسٹی کے پڑانے تعلیمی نظام سے بھی خوش نہیں تھے، وہاں جتنے لوگ تھے وہ سب اپنے چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے تھے۔ اندر کچھ باہر کچھ اور جو لوگ اشتراکی تھے وہ یڈر زیادہ تھے اور اشتراکی کم اور دنیا کو صرف کتابوں اور اخباروں کے ساحل پر کھڑے ہو کر دیکھنے کے عادی تھے۔ سب تھیوری۔ عمل کچھ بھی نہیں۔ لڑکیاں تھیں، لڑکے تھے۔ لیکن سب اپنے ماحول سے اکتائے ہوئے کسی سے پوچھ کر آئندہ کیا کر گئے تو جواب نہ دے۔ جیسی کچھ نہیں معلوم کہ ہماری قسمت میں کیا ہے۔ ان کی کوئی زندگی نہیں تھی۔ صرف دکھا داتا تھا۔

حکمِ حرم پر زندگی کی غلط اقدار کا پاس۔ اصل میں سب شر ہے۔ جس ہے۔ حقیقت کچھ نہیں۔ وہ سب ان باتوں سے نفرت کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی "خیر سنجیدگی" ان کے ماحول پر ایک گہری طنز اور ایک کڑی تنقید تھی۔ ان کی خیر سنجیدگی میں زندگی کے لئے ایک نئے راستے کی تلاش تھی۔ اس دنیا سے ایک بہتر دنیا بنانے کے خوابوں کی کسک تھی، ایسی دنیا جو بناوٹ اور دکھاوے کی دنیا نہ ہو جس میں کوئی نسلی امتیاز، اونچ نیچ کا فرق، لوٹ کھسوٹ اور دھولے سے پیدا ہونے والی برائیاں نہ ہوں۔ اور ساری دنیا ایک گھرانہ ایک خاندان ہو۔

ان کا ایک مشترکہ کلب بھی تھا جس کو وہ بڑی شاعری سے "ہمارا اسکینڈل کلب" کہتے تھے۔ اس کا کام تھا ہر طرح کے اچھے بُرے معاملات پر بے لگ بھروسہ کرنا۔ اس خیال میں بہت سے واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو بہت غور طلب ہوتے ہیں لیکن جن کی حقیقت نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ ایسے واقعات کی جانچ پڑتال کے لئے وہ باقاعدہ اپنے کلب کی طرف سے کمیشن مقرر کرتے اور جب صحیح واقعات کا پتہ چل جاتا تو وہ اس کو TOP SECRET کہتے۔ انہوں نے اپنے کلب کی شاخیں بمبئی اور دہلی میں بھی قائم کر رکھی تھیں۔ اس کا ایک ڈاکٹر بھی ہوتا تھا۔ وہ بڑی بڑے اسرار و شخصیت کا انسان تھا۔ کسی کو اس کے متعلق کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ لیکن وہ تمام باتوں سے باخبر رہتا۔ اس کو تو یہاں تک معلوم رہتا تھا کہ کون کون کی کس کس طرح کے سے آئندہ غلط کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

یہ سب کے سب اکثر و بیشتر پوسٹل کے ٹیریس پر اکٹھا ہوتے اور بڑی عجیب اور بے محکم بحثیں کرتے۔ اور جب کبھی ان کی بحث جھگڑے کا رخ اختیار کر لیتی تو نصیر زبیری چلا کر کہتا:۔ زندگی جھگڑوں کے لئے نہیں ہے! اور اس پر سب خاموش ہو جاتے۔ کبھی کبھی وہ خدا کے وجود سے لے کر عورت کے وجود تک پر بڑی لگائیں بحث کرتے تو پاس ہی رہنے والا مولوی صورت لڑکا سوچنے لگتا کہ اسے خدا یہ سب کم بحث کہاں بخشے جائیں گے۔ ایک دن جب وہ یونیورسٹی کی تمام لڑکیوں پر بے لگ بھروسہ کر رہے تھے وہی مولوی صورت لڑکا جس کا ہم شکیل اختر تھا مدینہ اخبار کی پرانی فائل پڑھتے پڑھتے اُن کے پاس گیا اور بڑی ہیر پری کے ساتھ ان سے کہنے لگا۔ کوئی بھی ایسا نہیں فنا جو لڑکیوں کی باتیں نہ کرنا ہو، کیا یہاں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان خرافات کو چھوڑ کر سنجیدہ موضوعات پر گفتگو کر سکتا ہو، نہ جانے کیا ہو گیا ہے ان سادے لوگوں کو۔ تو اس پر نصیر زبیری نے ذرا ہنساؤنی سنجیدگی سے کہا:۔ مولانا شکیل! یہاں تو آپ کو شاید ہی کوئی ایسا آدمی مل سکے، آپ کیوں ذایک ترکیب کریں۔ اور وہ یہ کہ اپنے سامنے آئینہ رکھ کر باتیں کیا کریں۔ ہم تو لڑکیوں سے محبت کرتے ہیں۔ آپ چمکتے ہوئے پلیٹوں اور پرانی کتابوں سے محبت کیجئے جیسا کہ ریورٹ بروک کیا کرتا تھا۔ اگر وہ شاعر آج زندہ ہوتا تو آپ کو بہترین دوست ثابت ہوتا لیکن انہوں نے اس کو مرے ہوئے ایک زمانہ بیت چکا ہے۔ اس پر مولانا شکیل اختر پیر پٹک کر خگی کے عالم میں وہاں سے چلے جاتے تھے اور وہ سب چلا اٹھتے کہ جلدی اب کوئی دوسری بات کر دے، مولانا نے یہاں اگر ساری فضا کو تقدس سے بھر دیا ہے۔ پھر ان میں سے کوئی کہتا:۔

آج کے اسکینڈل لڑکیاں ہیں

پھر وہ خیال آرائیاں تو ہیں کہ بس مزہ ہی آجاتا۔

ان میں سے کوئی کہتا:۔ سب اہم بات یہ ہے کہ اس نئے مسلم دنیا کی مغنویت بہت بڑھ گئی ہے۔

وہ کیسے بتاؤ؟ کوئی سوال کرتا۔ اور جواب ملتا:۔ اسے اس نے تو نہیں جو رکھلی ہیں اور ہر دم دونوں اہل حقوں سے ان پر وہ تاؤ دیا کرتا ہے۔ اس کے متعلق دوسری اہم خبر یہ ہے کہ کل ۶ بجے شام سے اس پر مشق کے سخت دوسرے پڑ رہے ہیں۔ اس کے پاس لاہور کی ایک سنہری بالوں والی لڑکی نے اپنی تصویر بھیجی ہے۔

اور تیسری اہم خبر یہ ہے کہ کامرٹھ پھر غائب ہو گیا ہے۔ ابھی میری روڈ سے دونوں گانے آصف مسود آتے ہیں تو ان سے پوچھا جائے گا۔ وہ سب

نیے سا پتل جینڈ کے پاس کھڑے ہیں۔

”آصف! — اسے بھٹا اڑاتے کیوں نہیں؟“

”کیونکہ جی! اگر بھٹا کرنا“ اس نے اپنا بیٹ سر سے اتارتے ہوئے کہا۔

”تم نے کچھ سنا ہی، کل رات سے کامیڈ پھر خفا ہو گیا ہے۔ ہم تو اس کے دندوز کے خفا ہو جانے کے عادی ہو چکے ہیں، لیکن وہ ہے کہ ہلکے ذوق کا ذوق بھی غلامی نہیں ہوتا۔ تم اب کی بار مصیبت کراؤ۔ اگر ہم پھر لڑیں تو تم کبھی پیچھاؤ نہ کرنا۔“

”اچھا تو تم لوگ پھر لڑو!“ آصف نے تعجب سے کہا۔

”لڑو کہاں لڑے ہم بھی! — کچھ ذرا اس کی ہانسی کی پٹائی پالیسی پر گفتگو ہو گئی تھی۔“

”ہم نے کے مرتبہ کہہ دیا کہ تم لوگ اس پچاسے سے اس موضوع پر بات ہی نہ کیا کرو۔ اس لئے کہ وہ اپنی پارٹی کی سابقہ حماقتوں پر بحث نام ہے۔ اور ویسے بھی وہ اب تم لوگوں کو رجعت پسند نہیں کہتا۔ اب تو وہ جمہوری مودبہ اور مشترکہ پیٹ فارم کی باتیں کرتا ہے۔ اگر تم آج ہی اس کی دلیل پر دستخط کر دو تو وہ تم سے پھر خوش ہونے لگے گا۔“

ایک دن کیا ہو اگر وزیر سٹی کے کچھ مغرب پرست لوگوں نے مغربی سرستی کا پروگرام کیا: اعظم پروڈیوسر اور سوداگر بھی وہاں مدعو تھے۔ وہ وہاں تپو پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ اور ایڈیٹر پروگرام پر کوئی ریکارڈ بچ رہا تھا۔ کسی نے اس کو اگر بتایا کہ پروڈیوسر کیس کا بنایا ہوا ایک راگ ہے۔ پھر اس کے ترپ اگر کسی امریکی کانٹریڈیکشن پر بھی ہوئی لڑکی نے خاص نام کی بے بی میں اس سے پوچھا۔

”آپ کوئی تھوڑی سی کون سی ٹھیک لگتا ہے؟“

”کون سی؟ — جی جگے تو سب پسند ہیں۔“

”اور موڈ آرٹ اور آرٹھرٹس بھی پسند ہیں۔“

”جی ہاں۔ کیوں نہیں؟“

یہ سب جھوٹ تھا۔ اعظم پروڈیوسر کے باپ کو بھی مغربی سرستی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بی تھوڑی اور موڈ آرٹ کے صرف نام ہی سنے تھے۔ اور جتنے لوگ اس شام کے وقت وہاں موجود تھے ان میں سے کوئی بھی مغربی سرستی سے واقف نہیں تھا۔ لیکن نہیں صاحب ہم ضرور یہ یقین دلائیں گے کہ ہم لیڈرین میڈنگ کے تمام راگوں سے واقف ہیں اس لئے کہ جب موسیقی میں موڈ آرٹ وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے تو خواہ مخواہ بہت رعب پڑتا ہے۔

ستے میں ایک ٹھٹھنے قد کی خوبصورت بالوں والی لڑکی جو کشمیر سے آئی تھی اعظم پروڈیوسر کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اعظم پروڈیوسر سے انکیس جھپکا کر کچھ پوچھا۔ لیکن اعظم پروڈیوسر نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور سوداگر نے اسے کان میں یکساں کیا اس کشمیری لڑکی کی کھپکتی ہوئی آنکھیں یہ کہتی ہیں کہ یہ دنیا ایک دایم ہے، خواب و خیال ہے۔“

پھر وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔ شام دھل چکی تھی۔ اور اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ سواریوں کا زمانہ تھا۔ سڑک پر دونوں طرف لگے ہونے والی چٹیاں اس کے خیال میں لپٹی ہوئی سو رہی تھیں۔ وہ دونوں سڑک پر ہوشل کی طرف چلے جا رہے تھے۔ سوداگر نے یکایک سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”خزندہ خاؤں!“ اعظم پروڈیوسر نے اس سے کہا۔ ”آپ تو نہ جانے کہاں رہتی ہیں۔ آپ کے تو درشن ہی نہیں ہوتے۔ یہ سنتے ہی خزندہ قانون نے فریاد مچا دیا جیسے کوئی کڑوی حیر اس کی حلقہ میں لکھ گھبر۔ اس نے اپنی جھکیلی آنکھوں سے اس کی طرف گھور کر دیکھا گویا کہہ رہی ہو۔ یہ بھی

کوئی بات میں بات ہے۔ تم سخت بدتمیز معلوم ہوتے ہو۔ راستے میں کسی لڑکی سے ایسی باتیں نہیں کرتے ہو۔
 کھاجب! دشمن نہیں ہوتے۔ کوئی ہم بھی دیوتا ہیں کہ دشمن دیتے پھریں۔ اس پر وہ ناراض ہو کر چلی گئی۔ وہ دونوں چلتے چلتے۔ راستے میں مسعود انور
 فرزندہ خاتون کی برائیاں کرتا رہا۔ چہرہ دونوں ہوٹل پہنچ گئے۔ مسعود انور اسی طرح بکھار رہا۔ آغوا کا اعظم پرویز سے ملا گیا۔ اس نے کہا، جی اس کے
 متعلق دس قسم باتیں نہ کیا کرو۔ تم جانتے ہو ایک زمانے میں اس کا گرفتار رہ چکا ہوں۔ وہ لڑکی ہے اصل میں بہت اچھی۔ تم سے ٹھنڈی باتیں کرے گی۔
 تم ذرا بھی بور نہیں محسوس کرو گے۔ بہترین تقریب ہے۔ اور کبھی میک اپ نہیں کرتی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ذرا خوبصورت نہیں ہے تو کیا ہٹا اس کا
 دماغ تو خوبصورت ہے۔

اے یہ کیا جو اس مجاہد کی ہے اتنی دیر سے۔ کوئی اور بات کرو۔ یہ فرزندہ خاتون ہی کے پیچھے ہاتھ دھو کر تم دونوں کیوں پڑ گئے ہو جہاں گلپیں
 نے بجلی کے پوٹے پر چائے کا پانی رکھتے ہوئے کہا۔ اچھا بتاؤ تمہارے اس نئے ”ورک“ کا کیا حال ہے۔ کچھ بات جتنی ہوئی نظر آتی ہے کہ نہیں۔ میں
 نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم لاکھ کوشش کرو لیکن تم اس کے کڑی کے جسم میں کوئی حرکت نہیں پیدا کر سکو گے۔ وہ یوں ہی بے حس و حرکت
 ہے گی اور تم اس کو اس طویل خواب سے جگانے کی کوشش کرتے رہو گے اور تمہارا وقت ضائع ہوتا رہے گا۔ ذرا سوچو تو کہ اس کو تم کتنے ناموں
 سے پکارتے ہو، میم، ایملیا، مونا لیزا۔ اور میں کہتا ہوں کہ وہ اس دنیا کی لڑکی ہی نہیں۔ اور تم مانتے ہی نہیں اور اپنی دماغ پر اڑے ہوئے ہو۔
 تم یہ سب باتیں اس لئے کہتے ہو کہ تم اس کو جانتے ہی نہیں۔ اعظم پرویز نے کہا۔ جانا تو کیا تم نے تو اس کو کبھی قریب سے بھی نہیں دیکھا
 ہے۔ اس کا معصوم چہرہ، اس کی معصوم آنکھیں، اس کے نازک ہڈیوں پر بہت کم آنے والی ہنسی تم نے کبھی دیکھی ہی نہیں کبھی تم اس کی دسری آنکھوں
 سے کچھ کہتے اور وہ تمہارے سامنے خاموش محبت بن کر بیٹھ جاتی اور اس کا چہرہ جیسا کہ آگ سے دھک اٹھا تو تم ضرور بکا ایک اپنے آپ ہی کہہ اٹھتے، ”اک
 نگار آتشیں رخ“۔۔۔۔۔

پھر تنویر جو پاس ہی بیٹھا ہوا تھا بولا: ”دیکھو تم نے پھر وہی شاعری کی باتیں شروع کر دیں اور ہڑا میں اڑنے لگے۔ اس دنیا میں رہ کر اس دنیا
 ہی باتیں کیا کرو۔ یکن کرو گے بھی کیا؟ تمہارا دماغ ہی ایسا ہے جو ہمیشہ آسمانی رہتا ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے آج بھی یہی کہہ رہا تھا کہ تم اس سوتی ہوئی
 لڑکی سے ایک طرح کی روحانی محبت کیا کرنے لگے ہو کہ کسی کو نگاہ ہی میں نہیں لاتے۔

اور نصیر زبیری چائے کی پیالیوں کو صاف کر کے میز پر رکھتے ہوئے صبح کو بولا: ”جھوٹ۔ یہ سب جھوٹ ہے، فریب۔ یہ اعظم پرویز کسی
 نے محبت نہیں کرتا۔“ ”اک نگار آتشیں رخ“ بالکل ہی ایک فرضی چیز ہے۔ یہ تو افسانہ نگار ہے۔ ایسی ہی کہانیاں بکھرتا رہتا ہے اور لوگوں کو محبوب
 کرتا رہتا ہے۔ اس کے متعلق تو یہاں کے دو چرخ جیسے شاعروں نے ایک ہی بات کہی ہے کہ یہ کسی سے عشق کر ہی نہیں سکتا۔ اگر تم اس سے ذرا سی
 بحث کرو تو صاف کہہ دے گا۔ کہ اک نگار آتشیں رخ تو میں نے زندگی کا سب سے بڑا کھا ہے۔

”تم چپ رہو۔ یہ باتیں تم کیا سمجھو؟ اعظم پرویز نے زبیری کو چراتے ہوئے کہا۔

”واہ! کیوں نہیں سمجھتا۔ دشت گزری ہے اسی عمر کی سیاحی میں۔“

”خوب دشت گزری ہے۔ ذرا اس صبح پر غور تو کرو۔“

”ہاں تو کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔ بالکل میری دشت گزری ہے۔ اے صاف کرنا، عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔ جلدی
 میں اٹھے کہ گیا تھا۔ ہاں تو جب میں جید آباد میں تھا تو ایک لڑکی مجھ سے پیار کرتی تھی۔ وہ مجھے اب بھی دل و جان سے چاہتی ہے اور برابر محبت

برے خطرات کھتی ہے۔ وہ ڈاکٹری پڑھ رہی ہے۔ جب وہ ایڈی ڈاکٹر بن جائے گی تو میری اس کی شادی ہو جائے گی جو پہلے ہی سے ہے۔

ابو نعیم کی انکھیں کل جائیں گی اور خواب ختم ہو جائے گا۔ اعظم پرویز نے کہا کہ انکھیں زہریلی کچھیر پڑے ہوئے ہیں۔ اور دیکھو مجھ سے تم یہ سب یا اس تم کو کہ تم کو موت دے گا کہ وہ نہ کبھی کو اگر میں نے ان باتوں کو لگا کر کوئی انسان کہہ دیا تو تم بلا وجہ بنام ہو جاؤ گے اور پھر تمہارا اسامہ مشتق ہوا ہو جائے گا۔ تم تو ہمارے ہی ہو کہ لوگ مجھ سے کہیں کہ تم بے گناہ تھے۔ ابھی کل کی بات سنو۔ میں جی کھنوی خاتون کو انگریزی پڑھانے وہ تین دن سے جاتا ہوں ان ہی سے مشق یہ بات ہے۔ کل صبح کو وہ بازار جانے کے لئے اپنے گھر سے نکل کر باہر آئیں اور اپنے ریشمی خرابے کے دونوں پاؤں کو بڑے انداز سے چلتے اٹھا کر نہایت تکلف سے کہا: اللہ! علی گڑھ میں کتنی دھول اور گرد ہے۔ ہمارا کھنڈ گنا صاف ہے۔ میں بھی دیں کھڑا تھا۔ اور جب میں نے ان کے خرابے کو غور سے دیکھا تو ان کے جوائی جان کا بچ گھبرا سے گئے۔

تیس کے بغیر بھی ہے۔ ان ہی دنوں میں سے ایک دن نصیر زہری نے غائش سے وٹنے سے بعد کہا۔ آج میں نے اپنی چٹائی کو غائش میں بیکھا۔ کچھ خاص بات نہیں اس میں پوچھا کیا کریں اب تو اس سے پیار ہو ہی گیا۔

اس پر سب نے ایک آواز پر کر خرابے کی گھنٹی بجا دی۔ خوار!! ان انکھوں سے کبھی پیار نہ کرنا وہ نہ جہاں خرابے میں تہا اگھر ہم سے لڑا ہی کہ میرا دل پر ہاں اپنے محبوب سے خرابہ کر اس کو گھوڑے سمیت پتھر کا بنا دیتی ہیں۔

وسطا درج کی اس شام کو اعظم پرویز نے سوچا کہ یہ سب کچھ کتنا اچھا تھا۔ یہ سب کچھ ختم ہو گیا لیکن ایک دن میں نہیں۔ ایک عرصہ لگا ہے اس میں۔ بہت محنتیں گزری ہیں۔ پھر دن نکلا ہے۔ اس طرح ہنسنے کیسے چاند سی عورت جیسے دل دیت گئے۔ اس کے ساتھ جان گلپس کی سیٹیاں بھی بندھ گئیں۔ اب اس کی گونج پوسٹل اور پیورسٹی کے برآمدوں میں نہیں سنی جاتی۔ کچھ ہی دن ہوئے اس کو یکایک یہ خیال آیا کہ امتحان میں اب کتنے دن اور وہ گئے ہیں۔ وہ بالکل گھبرا گیا جس طرح پیٹ خرم پر کھڑے ہوئے مسافر آتے ہوئے انجن کی دھمک سن کر پریشان ہو جاتے ہیں پھر اس کی سیٹیاں غلامی گم ہو گئیں۔ اس نے کسی بھی دکان سے ٹوٹ کر نہ کی قسم کھالی یہ سوچ کر پہلے امتحان پاس کر میں پھر زندگی میں یہ کام کرتے ہیں گے۔ پھر وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اعظم پرویز نصیر زہری اسرار اور سارے لوگ اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔

لیکن وسطا درج کی وہ شام گزرنے لگی تھی۔ اور رات ہو چکی تھی۔ لڑکے گھوم گھام کر واپس آچکے تھے۔ باہر اندھیرا تھا۔ پوسٹل کے عقب میں اشوک کے درختوں کے اوٹ سے چاند اپنا خاموش چہرہ ادا تھا ہوا تھا۔

اب یہ سب ختم ہو گیا۔ تاہم یہ زندگی کا دور بہت یادگار رہے گا۔ اگرچہ یہ جیتے ہوئے دن رات اب لوٹ کر نہیں آئیں گے پھر بھی ان کی یاد ہمیشہ تازہ پاتی رہے گی۔ لوگ لاکھ ہم کو کہیں کہیں۔ برا کہیں اس لئے کہ اب ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ لیکن چاہے ہم یہاں ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن زندگی تو اسی طرح رہے گی۔ کچھ دوسرے نصیر زہری، اعظم پرویز اور جان گلپس اور اسرار یہاں آئیں گے اور اسی ٹیریس پر بیٹھ کر قہقہے لگائیں اور زندگی کا عظیم تسلسل اسی طرح قائم رہے گا۔ اور یہ زندگی ہم جس کی پوجا کرتے ہیں یوں ہی منہستی رہے گی۔ البتہ ہم یہاں نہ ہوں گے اس لئے کہ زندگی کے "نئے حقائق" اور "نئے سرسبز چراگاہ ہمارے منظر ہیں۔"

لہو اور تالین

انہاد

(جس ترتیب سے بیچ پراتے ہیں)

بابا لوسٹر
تجمل ایک سرمایہ دار
انتر مصور
دُفت تجمل کا برا بیوی بیٹا

منظر :- سرمایہ داروں کی کوئی انشاد کا ایک وسیع کونہ۔ یہ کوئی انشاد کے طور پر استعمال کرتا ہے نہایت اعلیٰ ترین معیار پر قائم، دیوانوں پر مشہور سمجھوں کے شاعر، ایک فن ریلو سیٹ، کہ غلطی پر صوفیہ اور گریس، شمالی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی دونوں الماریوں میں جھلکتی ہیں۔ کاریں اور تپائیوں کے اوپر تہہ تہہ چھوٹی چھوٹی ترین گلدان، جودانے اور کھڑکیوں پر بیٹھی ہوئے۔ وسط میں ایل۔ ایبل پر کینوس جو اسی ایک سادہ اور صاف ہے، قریب ایک تپائی پر لگوں کے ڈبے، جس کی چھوٹی چھوٹی پیالیں، طرح طرح کے حکم اور مصوری کا دوسرا سامان۔

گرمیوں کے ابتدائی زمانے کی ایک بڑی شہنائی میں سے دھوپ اندھا رہی ہے۔
حب پر وہ اعتقاد ہے تو بابا جلاؤں سے کرے کی چیزیں صاف کرتا ہوا دکائی دیتا ہے۔ وہ چاروں کے بعد
تجمل آتا ہے۔ تجمل کی عمر ۴۰ کے درمیان بڑی۔ صحت نہایت اچھی جسم پر قیمتی سوٹ۔

تجمل :- یہ اختر کہاں ہے بابا؟

بابا :- آؤ ہر باغ میں ہیں سرکار!

تجمل :- اچھا تک باغ میں۔ وہاں کیا کرتے ہیں؟

بابا :- ٹل رہے ہیں۔ میں نے کہا بھی سرکار کا شہ تیار ہے اندھا جاؤں۔ مگر انہوں نے تم مجھ جھوک دیا۔ اچھا تک دھوپ میں ٹل رہے ہیں۔

رات سرکار درخشاں ہو جاتا ہے،

تجمل :- مات کیا؟

بابا :- میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ ہمارے سرکار میری اچھا آگ کھل گئی۔ دیکھتا ہوں کہ باغ میں کوئی شخص گھوم رہا ہے۔ بھار چو رہے۔ شور

ہاں ہے وہ لاکھ انحریمیاں کے ہاتھ میں ان کی چھڑی نظر آگئی۔

تجمل :- اس قسم کے لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ ہر وقت کسی دیکھی سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں۔ انگ تھک رہنا چاہتے ہیں۔
بابا :- ہوا میں تو نہ خود پہاں آتا ہوں اور نہ کسی کو پہاں آنے دیتا ہوں۔ وہاں صفائی کے لئے پانچ دس منٹ کے لئے آجاتا ہوں۔ میں کہا سرکار
تجمل :- کیا ہے؟

بابا :- شاید کچھ پریشان میں چند روز سے۔

تجمل :- پردہ حجابات۔ ایک بار کہہ جو دیا تم فنکاروں کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ہر وقت یونہی پریشان رہتے ہیں۔

بابا :- دیکھ رہے تھے برٹے، اچھا سرکار!

تجمل :- بھلاؤ انہیں۔ جلدی کر۔

بابا :- بہتر!

دبا با کر سے نکل جاتا ہے۔ تجمل آگے بڑھ کر کہنے کی دیکھنے لگتا ہے۔ اختر آتا ہے

ادھیر عرکا شخص۔ سر کے بال پھرے ہوئے، آنکھیں شب بیداری کا درجہ سے سرخ

لباس پاجامہ اور قمیص، مینتیں چھٹی ہنسی آنکھوں کے گرد جھٹکتے زیادہ نمایاں،

اختر :- تجمل کا طرت دیکھو، بھرے کپڑے!

تجمل :- بڑی دیر تک ٹھٹھتے رہے ہوا آج۔

اختر :- علی ہیں۔

تجمل :- ایک بہت بڑی خوشخبری سنائے آیا ہوں تمہیں۔ ابھی ابھی میرے ایک دوست نے فن کیا ہے۔ مجھوں نے تمہاری تصویر کو ادل انعام کا

مستحق قرار دیا ہے۔ میں نے تفصیل معلوم کرنے کے لئے روف کو بھیج دیا ہے۔ ابھی آجائے گا۔

اختر :- تمہارا خبر سے معلوم ہو چکا ہے۔

تجمل :- (اختر کی بے نیازی پر تعجب) تمہیں اس کا علم تھا اور —

اختر :- اختیار مع سیر سے مل جاتا ہے۔

تجمل :- تمہیں یہ خبر سن کر اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہئے تھی۔ میرا خیال ہے یہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

(اختر خاموش ہے)

تم نے ملک کے تمام معرودوں کے مقابلے میں یہ انعام جیتا ہے۔ یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ میں اس خوشی پر آج شام چائے کا اہتمام

کیا ہے۔ تمہیں مبارکباد دینے شہر کے سرکاری آفس میں۔ سنا تم نے۔

(اختر خاموش ہے)

کیا کہا!

اختر :- کچھ نہیں۔

تجمل :- کہ نہیں اختر کے پاس کوئی کتاب ہے کہ شاید بابائے غلط نہیں کہتا تھا۔ معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟
اختر :- جی نہیں۔

تجمل :- اس نے کہا تھا رُسکاں ہمارے معصوم کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے ان دنوں۔ تنہا کیا خیال ہے پتا؟
اختر :- صبح کہا تھا اس نے!
تجمل :- یقین کہ

اختر :- یہی کہ یہاں سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔
تجمل :- کیا کہا؟ (بچے میں حیرت) رخصت ہونے کی ضرورت؟
اختر :- میرا دل چاہتا ہے۔

تجمل :- کوئی شکایت؟ کوئی تکلیف؟
اختر :- کوئی شکایت نہیں۔

تجمل :- پھر بات کیا ہے؟ اگر کوئی تکلیف ہے تو صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے تھے؟
اختر :- میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں، پھر بھی
تجمل :- پھر بھی کیا مطلب؟
اختر :- مجھے جانا ہی چاہئے۔

تجمل :- بے وقوف نہ بنو اختر، یہ میٹھے میٹھے آج نہیں کیا ہو گیا ہے؟
اختر :- اس کا جواب دے چکا ہوں۔

تجمل :- اگر تمہیں کچھ نہیں پڑا تو اس بے وقوفی کی وجہ؟ ذرا سوچو تو۔ یہاں اگر تم نے کتنے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ کتنی زبردست خدمت و منزلت حاصل کی ہے۔ اس سے بڑی عزت کیا ہوگی کہ آج تم ملک کے بہترین مسودہ نگار بنے ہو۔ اور کیا چاہئے تمہیں؟
اختر :- اس کے لئے میں آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تجمل :- مجھے شکریہ کی ضرورت نہیں صاف صاف بتاؤ تمہیں تکلیف کیا ہے۔ کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور کیا چاہئے تمہیں؟
اختر :- مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ رخصت ہونے کی اجازت دیجئے۔

تجمل :- میں اس پاگل پن کی اجازت کبھی نہیں دے سکتا۔
اختر :- اتنا کیوں؟

تجمل :- اس پاگل پن کی اجازت کیونکر دے سکتا ہوں؟
(اختر خاموش رہتا ہے)

سننا ہے آرٹسٹوں پر کبھی کبھی دوسرے پڑتے ہیں۔ شاید اختر کو خود بھی پڑتا ہے۔ آخر کامیاب ہو رہا ہے۔ (کچھ اس قسم کی بات معلوم ہوتی ہے۔)

تجمل :- یہ سب سے بڑی حقیقت ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ ڈاکٹر کو کرنا چاہئے۔

اختر :- آپ ابھی تک اسے ایک مذاق سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ ابھی تک آپ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھ رہے ہیں اور اب اس کا دوسرا رخ دیکھئے جو اتنا بھیانک اور اتنا خوفناک ہے کہ آپ کے تصورات کا شبیہ محل بھی زمین پوس ہو جائے گا۔ گزشتہ دو روز ہر رات میں جتنی تصویریں میرے نام کے ساتھ اس شاندار محل سے باہر گئی ہیں ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔

تجمل :- داخلہ گھر تے ہوئے معاملہ اتنی دیر تک جا پہنچے گا مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ اختر میرا مشورہ یہ ہے کہ اس وقت آرام کرو۔ تمہیں مکمل آرام کی سخت ضرورت ہے۔

اختر :- ذرا قہقہے سے کام لیجئے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے کہنے دیجئے۔

تجمل :- تم پاگلوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ قہقہے سے کام لو!

اختر :- حبیب آپ کو پوری حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اس وقت فیصلہ کیجئے کہ یہ پاگل پن ہے یا کچھ اور۔

تجمل :- یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ آخر گزشتہ دو سال سے تم میرے یہاں ہو۔ اس دوران میں تم نے کئی تصویریں بنائی ہیں جو شہر کے سبز لوگوں کی کوٹھڑیوں میں آویزاں ہیں۔ ان میں سے اکثر میں نے تحفہ اپنے دوستوں کو دی ہیں۔ یہ سب کی سب تمہاری میں تمہاری اپنی تخلیق ہیں۔ لیکن آج تم کہہ رہے ہو، ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔ کوئی اور نے گا تو کیا کہے گا۔

اختر :- مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی اور نے گا تو کیا کہے گا۔ میرے لئے یہ کشمکش ناقابل برداشت ہو چکی ہے۔ اس غلش نے مجھے بے قرار کر دیا ہے۔ یہ فریب اب زندہ نہیں رہ سکتا۔

تجمل :- فریب آج تمہیں کیا ہو گیا ہے اختر۔ کاش میں کچھ سمجھ سکتا کہ تمہاری اس پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ ڈاکٹر کو تم بلانے نہیں دیتے۔ میں کیا مجھوں آخر؟
اختر :- آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔ یہ کوئی عجز نہیں ہے۔ سنئے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج سے دو سال پہلے میں ایک تنگ و تاریک گلی کے ایک خستہ اور بدنام مکان میں رہتا تھا۔ بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے۔ اور جو جانتے تھے انہیں میرے متعلق صرف یہی معلوم تھا کہ میں ایک مفلس نقاش اور گناہ مصروف ہوں۔ میں نے بے شمار تصویریں بنائیں مگر وہ تمام کی تمام کباڑیوں یا بیلاں گھروں میں پہنچ کر کوڑیوں کے بھاؤ بک چکی تھیں۔ زندگی اسی حالت میں گزر رہی تھی کہ اتفاقاً تصویروں کی ایک نمائش گاہ میں میری آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے میری تصویروں میں دلچسپی لی اور مجھے اسی شام کو اپنے ہاں چائے پر بلا لیا۔ میں اپنے بڑا بڑا ہمیشہ بھائیوں کی طرح غربت کی چکی میں پس رہا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہ سکتی۔ آپ نے میری حالت کا اندازہ لگا لیا۔ اور اس بات پر اصرار کیا کہ میں اپنے غربت کو سے نکل کر آپ کے ہاں آ جاؤں۔ تاکہ اطمینان کے ساتھ فن کی خدمت کر سکوں۔ آپ نے میرے لئے یہ کمرہ وقف کر دیا اور مجھے زندگی کی ضروریات سے بے نیاز کر دیا۔

تجمل :- ان باتوں کے ذکر کی کیا ضرورت ہے۔

اختر :- میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے سلوک نے مجھ پر کتنا اثر ڈالا۔ میں سمجھنے لگا کہ آپ نہایت اونچے درجے کے افسان ہیں۔ دولت مند ہونے کے باوجود آپ کے پہلو میں ایک ایسا دل و حرک رہا ہے جو انسانیت لازم ہے جس میں ساری دنیا کا درد سمایا ہوا ہے۔ آپ نے اپنے دوستوں کو بلا کر انہیں میری تصویریں دکھائیں۔ آپ نے بڑے بڑے اداروں کے دفتروں میں میری تصویریں آویزاں کرائیں۔ آپ نے میری شہرت کے لئے میری تخلیقات رسائل و جرائد میں چھپوائیں۔ کئی اس وقت آپ میری نظروں میں ایک دیوتا تھے۔ ایک فرشتہ تھے، ایک ایسی ہستی تھی جس کی تعریف ہمارے

تصنیف اور کلامِ نبوی کی گنتی ہے۔

تعلیم۔ میں نہیں سمجھ سکتا، اس ذکر سے تمہارا مقصد کیا ہے؟

اختر۔ مگر تمہارے غور سے بعد ہی ایک جیسا تک خیال اپنا غور سے میرے ذہن میں ڈالنے لگا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں نے آپ کی خات کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے وہ محض میری اپنی خوش فہمی ہے حقیقت کچھ اور ہے۔

تعلیم۔ کیا مطلب؟

اختر۔ مجھ پر حقیقت واضح ہو گئی کہ آپ کی سرپرستی تو محض ایک اہتمام ہے آپ کی مصروفیت اور شخصیت کا اس سرپرستی میں آپ کا ایک خاص مقصد چھپا ہوا ہے۔

تعلیم۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟

اختر۔ آپ مجھے نواز رہے تھے مگر ایک خاص مقصد کی خاطر، اور وہ مقصد یہ تھا کہ آپ سوسائٹی کو بتانا چاہتے تھے: دیکھو میں کتنا اچھا ہوں۔ میں نے ایک غریب اور محض مصروفیت کے ہاں پناہ دی ہے، اب یہ جو کچھ بتا رہا ہے وہ محض میری سرپرستی کا نتیجہ ہے۔ میں نے اس کی صلاحیتوں کو زندہ رکھا ہے وہ دیکھو کتنی بڑی بڑی کمانوں کے دروازوں پر انسانی پیکروں کو نہایت خوبصورت اور شگفتہ لباس پہنا کر انہیں اللہ کے اندر سجادہ جاتا ہے تاکہ لوگ ان میں جیل جیل کو دیکھ کر کانداروں کے اعلیٰ ذوق اور ان کی نشان و شوکت سے مرعوب ہو جائیں۔ اسی طرح آپ بھی اپنی ملامت اور اپنی شخصیت کی نمائش کے لئے میری خات کو میرے فن کو استعمال کر رہے تھے۔

تعلیم۔ دیکھئے، یہ جھوٹ ہے۔ سراسر جھوٹ ہے۔

اختر۔ اور آپ کہہ سکتے ہیں، مگر بلکہ باز سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ آپ کے بیان میری یہی حیثیت تھی۔ اور جن وقت مجھے اس کا احساس ہوا مجھے محسوس ہوا جیسے میری اہلیتوں پر بھروسہ کی تہ تم گئی ہے۔ میرے سینے میں ایک بھی شرابہ باقی نہیں رہا۔ یہ احساس میرے لئے سوا ہونے کا ثابت ہو رہا تھا کہ اپنے جگر کا خون دے دے کر میں نے فن کی جس شمع کو اب تک روشن رکھا ہے، اس کا مقصد آپ کی شاندار کوٹھی اور آپ کی شخصیت کو بچھانے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ ایک نئی کاری یہ بھی بدداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا فن اپنا اصل جوہر کھو کر کسی کے لئے محض ایک فیسور شہرت بن کر رہ جائے۔ انہی دنوں مجھے ایک ہمیشہ دوست مل گیا جو بدستور غربت کی چلی میں پس رہا تھا میں نے اسے اپنی ذہنی کیفیت بتائی۔ اور انتہائی کہ وہ مجھے اپنے ہاں رہنے کی جگہ دے دے۔ یہ سنا اس نے کہا: دیکھو اگر تم آج کل تصویریں نہیں بنا سکتے تو کوئی حرج کی بات نہیں تھا میں نے میں تصویریں بناتا رہوں گا۔ تم مجھے اتنے پیسے دے دو کہ میں ادھر میرا خاندان عزت و آبرو میں زندہ رہ سکوں۔ یہ تجویز میرے لئے ناقابلِ برداشت تھی، مگر اس کا اصرار کم نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح وہ کھیل شروع ہو گیا جو دنیا کا سب سے گندہ اور ذلیل کھیل ہے۔ مجھے یہاں تک حاصل کرنے میں کوئی وقت نہیں آئی تھی۔ یہ سوچے میں اسے دیتا تھا اور وہ مجھے اپنی تصویریں — ان تصویروں کو میں —

تعلیم۔ ان تصویروں کو تم

اختر۔ اپنی تصویریں بنا کر پیش کر دیتا تھا

(تعلیم اس زمانہ سے اختر کو دیکھتا ہے جیسے وہ افادے سے اچھا سا لکھو)

تعلیم۔ تم مجھے دھوکہ دیتے ہو اب تک۔

اختر۔ دھوکا کچھ اور بہر حال واقعہ ہے کہ نازی کو نشانہ بنانے کے لیے۔ مجھے بنی بنائی تصویریں اور آپ کو فنی کی قدر افزائی اور مصروف نازی کے لئے ہر ساقی میں عرض و احترام۔

تجمل۔ میں بھی سب سے پہلی نہیں ملتا تھا کہ تم اس پست سا پتہ لکھے ہو۔

اختر۔ میں نے خود بھی نہیں سوچا تھا، لیکن اس پست سچ پر اتنے کے سچے حیرت انگیز نازی نے مجھے کئی تصویریں دی ہیں۔ یہ تصویریں آج آپ جیسے سبز لوگوں کے ڈانگ دونوں کی زینت ہیں۔ وہ پہلے کی طرح منحس نہیں ہے۔ وہ اپنی بہن کی شادی کر چکا ہے۔ اسے مدنی اور کپڑے کی بھی تکلیف نہیں۔ اب ملک مکان بھی اسے پریشان نہیں کرتا کیونکہ جانتا ہوں اس کے دل کی کیا کیفیت ہے۔ اپنی اولاد کو چند سکول کے عوض دوسروں کو سونپ دینا ایک ایسا تکلیف دہ واقعہ ہے جس کا اعزاز آپ نہیں لگا سکتے۔ آج جب اس نے سنا ہو گا کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر اعلیٰ انعام کی سستی قرار پائی ہے تو اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ دیکھا سوچے گا اسے کتنا دکھ ہوگا۔ میں اس تصویر سے کانپ جاتا ہوں۔

تجمل۔ تو اب تک تم نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔ اپنی نالائقی چھپاتے تھے۔ مجھے اتنی آسائشیں بھلا رہیا کی تھیں۔

اختر۔ آپ اس کی قیمت وصول کر چکے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس سودے میں آپ ہی کو فائدہ ہوا ہے۔

تجمل۔ اس قدر فریب دینے کے بعد اپنے عس کو جلی کٹی مٹاتے ہوئے تھیں شرم نہیں آتی۔

اختر۔ مجھے شرم کیوں لگے گی۔ شرم تو آپ لوگوں کو آنی چاہئے جو ہندوؤں پر پھنسنے کے لئے ہزاروں انسانوں کو اپنی میٹھی بناتے ہیں۔ بولیک فیکٹری کی سرپرستی بھی کرتے ہیں تو اپنے مطلب کے لئے۔

تجمل۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم کیا ہو۔ احسان فراموش چور۔ مجرم۔

اختر۔ میں سب کچھ ہوں مگر تم۔ تم کیا ہو؟ جی تو کہو

تجمل۔ میں؟

اختر۔ ہاں تم۔ بتاؤ خاموش کیوں ہو۔ بتاتے کیوں نہیں۔ دوسروں کے جرم دیکھ لیتے ہو۔ دوسروں کو مجرم کہتے ہو۔ مگر اپنے مستحق کچھ نہیں کہتے۔ بتاؤ کون ہو تم؟

(لڑت آتا ہے۔ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں)

لڑت۔ وہ خبر بالکل درست ہے جناب۔ پہلا العام اختر صاحب ہی کو ملے۔ یہ راجیک (جیٹ چیک نکالتا ہے) آپ.....

(دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے)

تجمل۔ تم چاڑ اس وقت۔

(لڑت دروازے کی طرف جانے لگتا ہے پھر پھرتا ہے)

لڑت۔ بہتر جناب!

اوہ یاد آگیا۔ مشر اختر آپ کا کوئی واقف کار راستے میں ملا تھا اس نے ایک پیغام دیا ہے آپ کے نام۔ آپ لاگتی محدود دوست ٹھانا نیادی۔

اختر۔ ہاں! کیا ہوا اسے جلدی بتاؤ؟

رؤف :- افسوس کچھ مجھ اس نے خود کشی کر لی۔

اختر :- خود کشی!

رؤف :- جی ہاں۔ ہسپتال میں جانے سے پہلے ہی مرجھا تھا۔

اختر :- (تجمل سے) سنا تم نے۔ ابھی پوچھ رہے تھے۔ میں کیا ہوں؟ اب تو تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ تم کیا ہو۔ تم قاتل ہو۔ تم نے قتل کیا ہے۔ تجمل :- رخصت سے گھر کے بکواس بند کرو۔

اختر :- قانون تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ مگر انسانیت کی نظروں میں تم قاتل ہو۔ تم نے دو قتل کئے ہیں۔ ایک مصور کے فن کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ دوسرے مصور کی جان لے لی ہے۔ یہ قتل نہیں تو اور کیا ہے؟ اور قتل کیا ہوتا ہے؟

تجمل :- نکل جاؤ یہاں سے۔ کیٹے۔ پاجی۔ احسان فراموش رہا

اختر :- میری زبان رک نہیں سکتی۔ میں چیخ و گونج کر کہوں گا۔ دیکھو لوگو! یہ قاتل ہے۔ اس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ سوسائٹی کا خوف ناک مجرم ہے۔

تجمل :- رؤف کھڑے کیوں ہو۔ اس پاجی کو دھکے دے۔ دے کر نکال دو۔ بے جاٹا سے پاگل خانے میں۔ پولیس کو ٹیلیفون کرو۔ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ خطرناک پاگل ہے۔

رؤف اختر کو دھکے دے کر باہر نکالنے لگا ہے۔ اختر چیخ و گونج کر کہہ رہا ہے۔ تم قاتل

ہو۔ تم نے قتل کیا ہے۔ میں خاموش نہیں رہوں گا۔ یہ آواز

آہستہ آہستہ ڈوبنے لگتی ہے تجمل دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہے

(پہرہ گھرتا ہے)

تین کتیاں

صحرا نورد کے خطوط :- بلند ٹی تختل اور حسن نگار شش کے لحاظ سے ایک بے نظیر کارنامہ۔
(چار روپے)

صحرا نورد کے رومان :- زندگی کے تلخ حقائق رومانوں کے پردے ہیں۔
(تین روپے آٹھ آنے)

جنگل :- افسانوں کا وہ مجموعہ جس کی ہر نقاد نے تعریف کی ہے۔
(دو روپے آٹھ آنے)

مکتبہ دارالاولیاء

نہ فریب دانہ دوام ہے نہ وہ شرطِ قیدِ مقام ہے
 کہیں لگ نہ جائے جہن میں آگ ترے نوب بہار سے
 جنہیں دے گئی ہے پیامِ خواب صدائے کوچ کی دلکشی
 غمِ روزگار کی تلخیاں بھی نہ جن کو دل سے بھلائیں
 جو ترے تسلیم یک نفس کی تجلیوں کو ترس گئے
 یہ تمیزِ عشق و ہوس نہیں یہ حقیقتوں سے گریز ہے
 جنہیں عشق سے سروکار ہے وہ مزدِ رابل ہوس بھی ہیں



آج ہم روئے نہ جی بھر کر
 اب کسی کا یہاں نہیں کوئی
 دل ہے ویراں کہ اب نہیں باقی
 سب کو دھوئے تھانا خدائی کا
 رہ گئے کتنے راز سینے میں
 موت گناہ بے لطف جینے میں
 دردِ غم تک اس آگینے میں
 کتنے طوفاں اٹھے سینے میں

کچھ غمِ عشق کے سوا بھی ہے
 غمِ ہستی ترے عزیز نے میں





صبح جمی یا شامِ قفس! کس پر چلا ہے اپنا بس
 دکھ کا زمانہ لمبے سال سکھ کی گھڑی دو چار نفس
 ہائے وہ اُن کا وقتِ سفر بوجھل ہے اب تک نفس
 تازک ہونٹوں پر مسکان یا کچی کلیوں کا رَس!
 قافلے کتنی دور گئے! گونج رہی ہے بانگِ جرس
 شام و محسوس کے وعدوں میں بیت گئے کتنے ہی برس
 بئر کی ناگن اسے اگر کتنے بہرہوں کو گئی ڈس
 مال تو سب سیراب ہوئے سوکھی کھیتی پر بھی برس

بھول ہی جاتے صادق کو

لیکن اُس کی بات کا رَس!

میں اضطرابِ امید اور سکونِ یاس بھی ہوں
میں جس سے دور ہوں عارف اُسی کے پاس بھی ہوں
بجا کہ میرا شبستان دھواں دھواں ہے مگر
میں تیرے حُسنِ فروزاں کا خصوصیتِ شناس بھی ہوں
غمِ حبیبِ لٹا کر غمِ جسمِ جاں پایا
میں آج خوش ہی نہیں ہوں بہت اُداس بھی ہوں
مری نگاہ میں شادابی چمن ہی نہیں
میں رگزاروں کے تشنہ لبوں کی پیاس بھی ہوں
ترے شعور پہ ہے فیصلے کا دار و مدار
میں ورنہ ایک حقیقت بھی ہوں قیاس بھی ہوں
مجھ سے جلوتِ ہستی، مجھ سے خلوتِ زلیست
کہ میں حیات کا پیکر بھی ہوں، قباس بھی ہوں
میں اپنے عہد کا ماتم سہی مگر عارفِ —
میں آنے والے زمانے کے دل کی آس بھی ہوں

تمہاری دُمن میں جو دامن فگار گزرے ہیں
وہ اپنے حُسنِ نظر کا شکار گزرے ہیں

○
رہیں رسمِ دنا ہیں وہی زمانے میں
جو بن کے دار و رسن کی بسا گزرے ہیں

○
بہائے شوق رہی ہے وہ رہگذر جس پر
گزر کے بھولے سے ہم بار بار گزرے ہیں

○
مقامِ ہوش میں دشوار تر تھے جو لمحے
روِ حسنوں میں وہی سازگار گزرے ہیں

○
خزاں بھی موت کو ڈھونڈے گی جن کی حسرت میں
چمن سے ایسے بھی کچھ گل عذار گزرے ہیں

○
دلیلِ مسیح منور بجھے بجھے تارے
نصیبِ شب کے لئے سو گوار گزرے ہیں

باغوں میں ہمارا آپکی ہے خونِ بوی کے شفق نہا چکی ہے
 پھولوں کی فسروگی نہ دیکھو، یہ آگ دیئے حبلا چکی ہے
 مشتاق نظر ہے خوں گرفتہ جیسے کہیں چوٹ کھا چکی ہے
 ہر شاخ چمن بہارِ سا دنیا یوں بھی جگمگا چکی ہے
 لیکن یہ جنوں کی سادہ لوحی کتنے ہی فریب کھا چکی ہے
 گل کر دو نظر نہ روزِ شمعیں رات اپنی کتنا سنا چکی ہے
 یہ موجِ سبکِ حسنہ امِ ساحل طوفان میں سرائٹا چکی ہے
 دیوارِ دُش کے تو کہہ دوں اک بات لبوں تک آچکی ہے

اے ساتھیو! مستم بڑھاؤ

منزل تو قریب آج

لطف کیا ملے گا اب حالِ دل سنانے سے
جو گندگئیِ دل پر تیرے مسکرانے سے

اس نے آزما کر بھی قسم کو بادِ فنا پایا
جس کو بے وفا پایا قسم نے آزمانے سے

نہند اگر نہ آجاتی موت اگر نہ پا حباتی
حشر تک نہ اُٹھتے ہم تیرے آستانے سے

مغر مہری سی لہجے میں کسپکی سی ہونٹوں پر
اور بھی نمایاں ہے دردِ دل چھپانے سے

ہر کلی ہے پژمرده گلستاں ہے افسردہ
اک ہمیں نہیں غمگیں آپ کے نہ آنے سے

اک نشہ ساطاری ہے روح کی فضاؤں پر
کتنی مستیاں بکھریں عشق کے فسانے سے

دل کی بے قراری کا آبِ سلیم کیسا کیجے
جس نے ہم کو لوٹا ہے منتِ نئے بہانے سے

پلوں پر کچھ دیسپ جلے
 آج وہ موسم سے روٹھ چلے
 پہلے جبب دل توڑ دیا۔
 پھر کوئی کیوں مانتے ملے!
 سب کا غم اپنا غم ہے
 آپ کے غم میں کون جلے
 ذوق سفر ہی کام آیا۔
 غم گر گر کر بھی سنجلے
 کس دن بن کر چمکے گا،
 دل سے کہہ دو خوب جلے
 طوٹناں سے ابھیں گے جمیل
 ساحل ساحل کون چلے!

خوش در شید و شعلہ مستعمل بود
حافظ

حفیظ مرشارپوری

تاریخ وفات

چودھری برکت علی مرحوم

ز دنیا چودھری برکت علی رفت

شد اور اجنت الفردوس ماوا

پسے تاریخ اور ضوال ز جنت

”بجنت برکت مرحوم گفستا

24

[The body of the document contains extremely faint, illegible text, likely bleed-through from the reverse side. The text is organized into several paragraphs, with some lines appearing as distinct blocks of text. Due to the low contrast and noise, the specific content cannot be transcribed.]

ادب و لطیف کی ترتیب کے سلسلے میں انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہ کی، ڈھائی برس کی اس مدت میں انہوں نے مجھے کسی ایک غزل نظم یا افسانہ کی مثال پر دیکھا اور کسی کی سفاکی کی، ابتدا ایک بار انہوں نے پریمی میرا اور دیکھ دیا اور نہایت مدحیہ طور پر صرف اتنا کہا کہ آپ اس ایک صفحے میں "عظمیٰ نظامِ تعمیر" اور "نگار" کے اخلاقی احتمال کئے ہیں اور لوگ یہاں پر رسالہ چھپاؤں اور شہرہ کی علامت بن جائیں گے، اس ہماری "گاتھل نہیں ہو سکتا" بات قبول تھی۔ میں اسی گیا اور جو پہلی پیش کش کر رہی تھی اس کی جو دھڑی مٹا دیا۔ نتیجہ نکلتا اور پورے کام کی کامیابی آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ آپ کو یہ فدا سے مشورہ دینے کے لئے میں نے کتنی بار کمرِ تہمت باندھی ہے مگر ہر بار اس خیال سے اس غری کو فرج کیا کہ ادیب ہر حال انفرادیت پسند ہوتا ہے، آپ برا مان جائیں گے۔ اور پھر قہقہہ لگا کر بولے۔ "مجھے تو آپ کے ادیب ہونے کے بارے میں شبہا جو نہ ہے، وہ نہ موتا رہا کہ تو اسی ادیب کی زندگی رہتی ہے جو صنوبر کو رنگستانوں اور انگیکہ کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر دکھاتا ہے اور اس پر اس کی خامی واضح کی جائے تو ست قہقہے نہیں لگا سکتا ہے کہ میں نے تو ایسا ہی عسوس کیا تھا۔"

اس میں ایک اور بڑا واقعہ سعادت حسن منٹو صاحب کے مشہور افسانے ”بُو“ کے خلاف فحاشی کا مقدمہ تھا۔ ”بُو“ کے شائع ہوتے ہی ادب لطیف کے

انقلاب ایک وقت دوہری نہیں، بلکہ "معاذہ" کے ایڈیٹر موسے خان کا خیالوں کی طرف سے ہندوستان کی گہرا توجہ اور اخباروں کی طرف سے اس واسطے سے بھی نہایت
اور عریانی کی نشر و اشاعت کا الزام، سالنامہ ادب لطیف جس میں خوش صاحب کا یہ افسانہ شائع ہوا آج تک رسالوں کی دنیا میں ایک حسی یادگار بنا ہوا ہے، سوچیں
چودھری صاحب مرحوم، چودھری نذیر احمد اور میں "بو" کی اشاعت کے الزام میں قلعہ کپھری کے محسوس میں گرفتار کر لئے گئے اور خوش صاحب کو قید سے پڑھنے کے ذریعے
بجایا گیا چودھری صاحب مرحوم نے ایک بار بھی توجہ سے یہ نہ کہا کہ یہ افسانہ کیوں چھپایا گیا انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے اس صاحب کا مقابلہ کیا اور سالنامہ
کی خوب صورت ترتیب کے حلقے میں میرے حق النعمت میں امانت ذکر کیا۔ قندیس کے تمام اخبارات انہی نے برداشت کئے اور عدالت میں چودھری کے خلاف میرا
اور کسی پریشانی سے سانبہ نہ پڑا۔

ڈھائی برس کے اس عرصے میں میں نے دیکھا کہ چودھری صاحب نہایت فذ و دل انسان ہیں، وہ ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جاملے دیتے جب وہ کھل کر قہقہہ
لا سکیں، اور اس قہقہے میں سب کو شامل کر لیں، انہیں معاشرہ بال اور میز انبال کے بے شمار شعاریات تھے اور گفتگو کے دوران میں ان اشعار کو وہ قہقہے پر چھپا کر دیتے
تھے کہ گھنٹے والا پھر دھک اٹھتا تھا، ایک بار سی آئی، ڈی کا ایک آدمی مکتبہ اردو میں آیا اور بھلا "قاسمی صاحب کہاں مل سکتے ہیں؟" میں نے اپنا تعارف کر لیا تو اس نے
میرے شعروا فسانہ کی قیصرہ خوانی شروع کر دی اور حقیقت کا ایسا زبردست مظاہرہ کیا کہ مجھے سخت کوفت ہونے لگی، اوپر سے چودھری صاحب آگئے، وہ اُسے پہانتے
تھے یا پہچان گئے۔ بہر کیف انہوں نے اس سے "تشریف آدمی" کا مقصد پوچھا، اور جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ محض مجھے خواجہ قیامت ادا کرنے آیا ہے تو مرحوم نے آڑ
دیکھا نہ تاؤ، کان پر ہاتھ رکھا اور پھپھڑوں کی پوری قوت سے غالب کا یہ شعر پڑھا نہیں بلکہ گایا۔

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا

اٹھے تھے سیر گل کو، دیکھنا شوقی بہانے کی

اس کے بعد سی آئی ڈی کے ان صاحب نے صرف جلدی سے کہے ہوئے سلام حکیم پر اکتفا کیا اور آئندہ کبھی ملنے کا وعدہ کر کے یوں گئے کہ کبھی نہ ملے۔
نظرے کے لحاظ سے وہ شدید قسم کے سامراج دشمن تھے، اور اس معاملے میں اتنے نڈر اور لہجہ کرب بعض اوقات ان کا سارا ادارہ ایک کچے دھانے سے
کھٹے گلتا تھا مگر وہ پیچھے نہ ہٹتے تھے، چودھری محمد حسین مرحوم ان دنوں حکومت کی پریس رانج کے انچارج تھے، چودھری برکت علی مرحوم نے ان سے جو شکریں لی ہیں۔
اور جس انداز سے ان کی زیادتیوں کا مقابلہ کیا ہے اسے جاننے والے بہت اچھی طرح جانتے ہیں، ہماری پریس رانج عملاً ایک طرف تعاون کا مطالبہ کرتی ہے حالانکہ اگر حکومت
عوام کا تعاون چاہتی ہے تو عوام کو حکومت کا تعاون بھی تو چاہیئے، ماسی بار پر ان دنوں چودھریوں میں وہ وہ کشمیں ہوئی ہیں کہ میزوں پر کتے پڑ رہے ہیں، آنکھوں میں
خون ٹپ رہا ہے۔ جسم پر لرزہ طاری ہے۔ مگر ہار دونوں نہیں مانتے، اس لئے کہ دونوں جبری تھے چودھری محمد حسین مرحوم کی جرات کے پیچھے حکومت کی ساری چینری
تھی اور چودھری برکت علی مرحوم کے پاس ان کا لٹینیٹ حکم تھا جو ایمان کا وہ جہ حاصل کر چکا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ مکتبہ اردو کی بیشتر مطبوعات ترقی پسند ادب، اور ترقی پسند سیاست کی نمائندہ ہیں، مکتبہ اردو نے جب اپنا اشاعتی پروگرام شروع کیا ہے
تو کتابوں کی دنیا پر صرف ان مادیوں کا قبضہ تھا جو یا تو اپنی قمار صرف کر چکے تھے، یا اپنی باتوں کو دھراتے چلے جا رہے تھے ماس وقت نئے ادیبوں کی تعریف چھپاتا
بڑے دل گرہے کا کام تھا خصوصاً جب یہ ادیب کمپنی کی حکومت "جیسی کتابیں لکھتے تھے اور ملک پر کمپنی ہی کے پوتے پڑ پوتے حکمران تھے، چودھری برکت علی
مرحوم امدان کے ساتھیوں کا کا نام ہے کہ انہوں نے ترقی پسند ادب کی تحریک کا جبر پور ساتھ دیا اور اردو ادب کو نئے، جاندار، توانا اور صحت مند ادب کے شہسواروں
سے ملا کر دیا۔ ورنہ کسی بھی ادیب میں اتنی بہت رشتی کہ وہ اپنی کتاب آپ ہی چھاپ کر آپ ہی نیچے، ساتھی مکتبہ اردو کتابوں کی گٹ اپ کے سلسلے میں بھی ایک
انقلاب لے لیا، آج اگر وہ مطبوعات کا حسن بیرون ملکوں سے بھی خارج تھیں وصول کر لیا ہے تو یہ نہایت ہے چودھری برکت علی مرحوم نے شروع کیا

اور ہر اسے مستخدم منجاری رکھا۔

گروہ ترقی پسندوں کی ایک کمیٹی صاحب مرحوم نے مجھے پیغام بھیجا کہ آج شام کو انہیں مجھ سے چند اہم امور پر گفتگو کرنا ہے۔ اردو کے شہر قائد میں صاحب صاحب کی وفات کے بعد ان کی تعلیم کے جوہر صاحب صاحب کے قریب اپنی کار پر میرے ہاں تشریف لائے، ابھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میرے گرتی ہوئی محنت اور مفید ہوتے ہوئے ہاتھوں کے بارے میں انہوں نے تشویش کا اظہار کیا اور پانچ بجے کے قریب وہ ممتاز صاحب کو اور مجھے اپنی کار میں شاہکار مسلم ٹاؤن کے قریب فہر کے گناہ سے لے گئے، راستے میں انہوں نے ہمیں اپنی کار میں لگے ہوئے ریڈیو سیٹ سے گیت سنائے۔ ہر کے کنارے آدیں سے آدیں صاحب نے چند امور پر گفتگو شروع کی۔ یہ امور ان کی بے حد اہم تھے۔ دھندے کی وجہ سے ان کے ہونٹ تشویش ناک مدنگ خشک ہو گئے تھے۔ اس لئے وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو زبردستی دھبے اور دھبے دھبے، ان کے سلسلے میں ایک پروگرام تھا جس کی تین شیئر تھیں، "نئے زاویے" کی تیسری جلد کی ترتیب، اشاعت اور سلسلہ جاری رکھنے کا فیصلہ ۳۔ رسالہ ادب لطیف کے معیار میں مزید غندی دوز نکھار۔ ۳۔ کلاسیکل ادب اور جدید ترقی پسندانہ تصانیف کی بات آمد و اشاعت۔

"نئے زاویے" کی مستقل ترتیب کا کام انہوں نے ممتاز صاحب کے اور میرے سپرد کیا۔ اور کہا کہ دو چار ابتدائی روزے گزر جائیں تو ممتاز صاحب اسی شام کو گرجی واپس ہمارے قے ہونے سے جلد امور طے کر لیں گے اور اس کے بعد ترتیب کا کام شروع ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں انہوں نے پاکستان و ہند کے تمام اردو ایروں کا تعاون حاصل کرنے پر زور دیا، کرشن چندر کی تعریف میں وہ طلب انسان تھے، انہوں نے اس روزیہ بیان تک کہ دیا کہ مکتبہ اردو ایسے عظیم ادارے کی تعمیر میں کرشن سے زیادہ شہرہ کی کیلوب نے ان کا ساتھ دیا ہو، وہ کرشن چندر کے علوم، ہمدردی اور انسانی دوستی کی باتیں کر رہے تھے تو ان کی آنکھیں، جو اس روز زرد ہو رہی تھیں، چمک اٹھیں۔

"ادب لطیف" کا ذکر چلتا تھا انہوں نے سب سے پہلے ان کی ترقی پسند مصنفین کے رویے کی شکایت کی اور کہا کہ دیکھ لیجئے، انہیں نے ہمارا ہائی کاسٹ کر دیا گزندگی اور ادب کی ترقی پسند قردوں پر میل خفیہ اتنا پختہ ہے کہ میں آپ لوگوں کے غائب سے دکھلایا نہیں بلکہ میرا ادیب صاحب کی مدد سے ترقی پسند ادب پر پیش کشا ہوں، اور واقعی میں خفیہ کی کچی کی ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ ذمہ ۱۹۴۴ء کی پہلی کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کا نفرین کے بعد چودھری صاحب مرحوم سے میرے بڑے بڑے صبر کے رہے، یہ صبر کے سب کے سب بالمشافہ ہوئے۔ چودھری صاحب کہتے تھے کہ آپ لوگ مکتبہ اردو کی اور خود اپنی انجمن کی گذشتہ تیر سال کی روایات پر پانی پھیرنے لگے ہیں، اور میں کہتا تھا کہ ہمارا نظریہ ہر یا شخصیت یا ادارہ کسی کو جامہ نہیں پہنچا جائیے۔ اور آخر ان تمام گرجے گرجتے مباحثوں کا انجام نہایت پر تکلف چائے ہوتا تھا اور چودھری صاحب یہ کہہ کر بڑی غندہ پیشانی سے مجھے رخصت کرتے تھے کہ آپ جو بھی کہیں مجھے عند ہے کہ میرا ادارہ اور یہ سلسلہ ترقی پسند ہیں۔ اور خدا اگر صداقت پر مبنی ہو تو بڑی قوت ہے، یہ حضرت موسیٰ کی ضد ہی تو تھی کہ خدا آپس اپنا جملہ دکھانے پر مجبور ہو گیا۔ بہر کیف اس روز اپنے گزشتہ جگہوں کو بحال کریم نے "ادب لطیف" کے بارے میں سوچا اس کی ادارت نہایت قابل ہاتھوں میں تھی، صرف ہم سب کو مستقل اور مسلسل تعاون و سہکار تھا سو اس کام سے وہ مدد کیا اور یہ وعدہ آج چودھری صاحب کے انتقال کے بعد بھی قائم ہے، اس رسالے سے ہماری تحریک کا پورا رامنہ وابستہ ہے، اور جب تک اس کی موجودہ ترقی پسندانہ، جمہوری اور انسانیاد خیالی کی پالیسی قائم رہتی ہے یہ وعدہ بھی قائم رہے گا۔

مطبوعات کے جدید پروگرام کے سلسلے میں ہم تفصیل سے باتیں نہ کر سکے کیونکہ اطلاع کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ان باتوں کو دو چار روز بعد پر ملتوی کر کے ہم چودھری صاحب کے ہاتھ کی مکانی واقعہ پر روٹ پڑ گئے، وہاں سے ان کا ڈائیوڑ میں نسبت روٹ پہنچا آیا، بعد میں معلوم ہوا کہ ہم سے جدا ہونے کے کوئی پندرہ منٹ بعد انہوں نے وعدہ گھولا۔ یہ ہوش پر کر گئے، اور ایسے گئے کہ پھر نہ اٹھے، ایک نہایت مفید اور مصروف زندگی کا یہ قبل از وقت انجام کس ادب دوست نے

فکر تنقیدی

چودھری صاحب کے آخری ملاقات

پیارے میٹر ادیب

بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں، جن پر اگر چین کر لیا جائے۔ تو اسے دکھ کے پتیل چٹنے لگتی ہیں۔ چودھری برکت علی کے انتقال کی خبر نے مجھ پر یہی دہشتور عمل کیا۔ بالکل اسی طرح کلیدہ علی تقریباً دو سالہ شریاری جنگ کے انتقال کی خبر نے پیدا کیا تھا۔ اسی باتوں کا تسلیم کرنا تھا مشکل ہوتا ہے۔ کتنی اذیت اور کب کے ساتھ یہ نہر کو ٹھونٹا تھا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جن کی ذہنی وابستگی کی جڑیں کافی گہری چلی گئی ہوں۔

چودھری صاحب کے ساتھ میری ذہنی وابستگی کچھ اس قسم کی تھی۔ کاش! یہ شخص اس ذہنی وابستگی کو بندامی میں کاٹ دیتا۔ تو آج اذیت کی یہ شکل اتنی ناقابل برداشت نہ ہوتی۔

میری اور چودھری صاحب کی آخری ملاقات کا منظر ایک بار پھر میرے ذہن میں جاگ اٹھا ہے۔ اور میں شدت کے یہ چاہ رہا ہوں، کہ یا تو اس منظر کو جھٹکاؤں اور آنکھیں بند کر کے یوں فراموش کر دوں کہ یہ واقعات کبھی مجھ پر نہیں آیا تھا۔ اور یا پھر چودھری برکت علی کے انتقال کی خبر سے منکر ہو جاؤں۔ اسی ملاقات کا اندازہ اور شگفتہ منظر اور موت کی یہ افسردہ اور اُداس خبر۔ میرا ذہن ان دونوں متضاد حقیقتوں کو ایک ساتھ برداشت نہیں کر سکتا۔ موت یقیناً اتنی ناقابل نہیں ہو سکتی۔ کہ ایسے جیتے جاگتے شخص پر ہاتھ اٹھا سکے۔

یہ اُداس دنیا کی بات ہے۔ جب لاہور ماہگیری سامراج کے غور سے تڑپ رہا تھا۔ وحشت اور بربریت فقر و دارانہ فسادات کا گھناؤنا روپ دھار کر لاہور کے گلی کوچوں میں بھڑکتا اور اٹھتا رہے بھیرتی ہوئی گھوم رہی تھی۔ ہندو سکھوں کا ایک دیکھ ڈی، اسے دی کالج میں بن چکا تھا۔ اور میں ۱۵ اگست کے سہیل تین ماہ تک کی کڑی جدوجہد اور فحش و جہانی کلکش کے بعد اپنی شکست کا اعتراف کر کے لاہور چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اور دگھٹے پہلے لاہور کے آزاد بازاروں، سڑکوں اور گلی کوچوں سے الگ ہو کر ڈی، اسے دی کالج کے رفیو جی کیمپ میں پہنچ چکا تھا۔

مجھے بچے لپٹے آنا ہندوستان کی طرف روانہ ہونا تھا۔ کتنی مسرت کا مقام تھا، کتنی تاریخی مسرت نے میرے اوپر نیچے پھیلا رکھے تھے۔ لیکن میں خاموش تھا۔ اتنی بے روبرو اور بھکی خاموشی میں نے زندگی بھر محسوس نہیں کی تھی۔ اساری ستوت کے قلع سے کھڑی ہوئی خاموشی اُداس، ناکام اور ڈنگی خاموش "عجیب جبر ہے یہ بھی"۔ میں سوچ رہا تھا۔ تو گویا اب گھینڈ سے مجھے نے منو لیا جا رہا ہے۔ کہ میں اپنے مسلمان احباب میں نہیں رہ سکتا۔ میں ان کی خطیں لکھ نہیں دیکھ سکتا۔ ان سے دور ہی نہیں سکتا۔ وقت اور تاریخ کا ظالم گھینڈ میری پشت پر کچھ کے دے کر مجھے اُس سے ٹھنڈے جا بھڑکتے ہوئی کی اس کیفیت پر غصہ تو بیکھر تھا ہی، تاہم مذکورہ جہان بڑولانہ بنایا گیا تھا۔ یقیناً تو میرا ایمیں نے بے تماشہ آنکھیں بند کر لیں۔ یہ احساس کہ میں ابھی لاہور ہی میں ہوں، آنکھیں بند کرتے ہی بہت زیادہ تیز ہو گیا۔ تصور ہی میں میں تیزی اپنی جان بچانی سڑکوں اور بازاروں میں جا پہنچا۔ میرے تصور پر کئی نیکیں نہ اٹھ سکی۔

میں اپنے بندے ہوئے بستر کو زمین پر رکھے، اسی پر آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ میرے دونوں پہلوؤں میں ڈی، اسے دی کالج کی ایسی دیواریں تھیں، اور وہاں دیواریں ختم ہوتی تھیں۔ وہاں دروازے پر چار فوجی منتہی ہر دے رہے تھے۔ اندر اٹلیں بائیں چاروں طرف ایک ناقابل فہم شورو غل تھا سڑکوں کی آواز میں پانچوں کی چیخ پکار، اپنا دھابی جاری ہے اور میں لاہور کی ال رڈ کی طرف منہ کئے، آنکھیں بند کئے، تصور ہی تصور میں اپنے مسلمان احباب کے ساتھ جو ٹھکر تھا۔ بائیں کی

"اے! یہ آپ لوگوں کی امانت ہے۔ چودھری صاحب نے چھل کی ٹھکی میں سے سترے میل میل کریم دونوں کو دینے شروع کئے۔ چودھری صاحب نے اس امانت کی حفاظت کرنا میرا کام ہے۔ اگر آپ لوگ میرا ساتھ دیتے رہیں۔ تو میں اسے اس اندھیرے میں بھی ایک روشنی خسل کی طرح جگائے رکھوں گا۔"

اس کے بعد چودھری صاحب نے ایک بات سمجھتے ہوئے رہے۔ وہ صاحب لطیف اور کتبہ آرو کے آئندہ پروگرام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ چودھری صاحب نے اسے دیکھ کر یہ شخص بقیہ کا اگلا کریمیری لکھ کر دیا۔ جسے تسلیم کیا۔ چودھری صاحب نے اپنے رسالہ اور کتبہ کے کئی کام میرے ذمے لگائے۔ تلویب لطیف کے بارہ سالہ ادبی انتخاب کے بارے میں مجھے بالخصوص تاکید کی۔ کہ اس بارے میں کام کرنا میرا فرض ہے۔ چودھری صاحب نے اس کا سہرا مجھے سوپ کر کے لکھا۔ اسے جاتے ہی مکمل کر کے بھرا۔ اور ادب لطیف کے لئے مسلسل لکھتے رہا۔ ہندوستان کے ادیب دوستوں کے تعاون سے یہ کام چلتا رہا۔

حکومت اگلی اور پولیس کے لئے بھی۔ اس سے زیادہ میں نہ ہو سکی۔ کیونکہ اس طاقات کو شکوک نگاہوں سے دیکھنے والے فوجی منتزلی اور کیمپ کے حصار و قلعہ کے لئے اپنے تئیں تھے۔ اور جس کا مار دینے کے لئے اس طاقات کو فوراً ختم کر دو۔

یہ نیا ہم تینوں کے ذہن سازشی نہیں تھے۔ ہم ادب اور ترقی اور تعمیر کو سازش کا کردہ نام بھی نہیں دے سکتے تھے، مگر وہ نام اتنی نادر فزیشن پر لکھا گیا تھا۔ کہ میں جبراً لکھنا کر دیا گیا۔

جاتے جاتے چودھری صاحب نے اپنی لڑی سر سے اتار کر ہال، تہنہ لگایا اور لوٹ گیا۔ جیسے وہ مجھ سے ملنے کے لئے جس اتھاہ غلوں اور ہیبت کے چنات لے کر گیا تھا۔ میری طرف سے ان جذبات کا اسی سرگرمی اور غلوں سے استقبال کیا گیا تھا۔ اور یہ ترقی پسندانہ احساسات کی فتح کا لمحہ تھا۔

اور آج — میں ادیب اہم کہہ رہے ہو کہ میں اتنی بڑی مادیالی یقین خبر کو تسلیم کر لوں۔ کہ چودھری برکت کا تہنہ بند ہو گیا، اُس کی شگفتہ آنکھوں کا بے پایاں غار ٹوٹ گیا، اور اچھ وہ قبر کی آغوش میں چلا گیا ہے۔

چودھری صاحب نے کیمپ کی اُس شام کو مجھ سے ترقی پسند تحریک سے زندگی کی آگے بڑھتی ہوئی طاقتوں سے جو وعدہ کیا تھا کہ وہ ہم سب کی امانت ہے۔ اُسے انہوں نے آج تک بڑی خوبصورتی اور بہادری سے محفوظ رکھا ہے۔ آج یہ امانت ہم سب ترقی پسندوں سے سوال کر رہی ہے کہ کیا ہم اس قابل ہیں کہ چودھری صاحب کی اس یادگار کو اسی بہادری اور خوبصورتی سے محفوظ رکھ سکیں۔ جس طرح چودھری صاحب نے رکھی تھی۔

مجھے یقین ہے۔ کہ ترقی پسند تحریک اس سوال کا اعلیٰ اور پائیدار جواب دے سکتی ہے۔ اور چودھری صاحب کی زندگی بھر کی جدوجہد کے اس سہل کو بدستور زندہ رکھ سکتی ہے۔ کیونکہ چودھری صاحب کی جدوجہد کا اعتراف اُن کی موت کا سوگ منانے میں نہیں، بلکہ اُن کے آدرش کو آگے بڑھانے ہی سے کیا جاسکتا ہے۔

(ادب و ادبیات کا بقیہ صفحہ ۹۳)

کے لئے دردناک نہ ہو گا؟

چودھری برکت علی مرحوم دوستوں کے جان نثار دوست اور دشمنوں کے بڑے خوفناک دشمن تھے، وہ زندہ دل، شگفتہ مزاج، ہنسی اور ہنست تھے، صحت مند ادب کی اشاعت کے سلسلے میں ان کی خدمات کبھی فراموش نہیں ہو سکیں گی اور اگر ان کے دو اختیار نے ہمت اور جرأت سے کام لیا تو وہ کتنے کاموں اور ادب لطیف کو جاری رکھ کر اور ان دونوں کے چودھری صاحب مرحوم کی ایک ایسی یادگار قائم کر لیں گے جس کا ذکر شاید مدائمی سرخوں کی تحریروں میں نہ آئے، لیکن ادب، تہذیب اور تمدن کی تاریخ اس کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی۔

میرادوست میرافیق!

اے جب کہ ادب اور کلمہ شدت اختیار کر چکا ہے ایسے وقت میں چودھری برکت علی کی مفارقت ایک روح فرسا سانحہ ہی نہیں بلکہ نئے ادب کے لئے نقصان عظیم بھی ہے۔ اسی وہ پلٹھڑی ہی کہتے جو اس دور کے نمائندہ اور حیثیت بر دار ادب کی اشاعت کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ ترقی پسند اور صحت مند ادب کی اشاعت کے لئے ہاتھ بھر کا کلیجہ چاہئے۔ اور ہاتھ بھر کا کلیجہ چودھری برکت علی کا تھا۔ جنہوں نے سب سے پہلے وقت کی ٹولز کو پہچانا اور ایسے ادب کی اشاعت کو رہداری زندگی سے بہت قریب تھا۔ اشاعت کے سلسلے میں نئی راہیں پیدائیں۔ کتابوں کی گنت آپ کے سلسلے میں ہائی کی کوشش جہاد کا دہرہ رکھتی ہے۔ چودھری صاحب کے سلیقہ اور نفاست پسندی کا ثبوت ہے۔ وہ نئی بوٹی لکیروں پر کبھی چلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ان دنوں جہاں ترقی پسندوں پر رجعت پسندوں کی طرف سے قباب نازل ہو رہا تھا وہاں اس ادب کے ناشر چودھری صاحب پر بھی کثرتِ روایت پسند چلتے اپنی جھلا بٹ کے تیر چھوڑ رہے تھے۔ مگر چودھری برکت علی ایک جملہ مند انسان تھے۔ اپنی دھن کے پکتے تھے۔ عصمت چغتائی اور حادث حسن خٹو پر غماشی کے سلسلے میں مقدمے چلاتے گئے تو چودھری صاحب سرکاری مشینری سے ٹکرائے مگر تکیجے نہ ہٹے۔ مقدموں کے دوران میں ان کا ذہن ایک جگہ سچا ہی کا ساتھ تھا۔ انہوں نے ہمت اور دیادلی کا کئی مرتبہ مظاہر کیا۔ بعض اوقات تو وہ اپنی بساط سے زیادہ چھلانگ لگا دیتے۔ ان دنوں نئی پورہ کے امام بخش ملیح آبادی سمجھے جاتے تھے چودھری صاحب نے جوش کے تمام مچھلوں کے سلسلے میں پانچ سالہ عہدہ کیا یعنی پانچ سال تک وہ کلام جوش چھاپتے رہیں گے اور اس کے عوض میں چودہ ہزار روپے دیئے گئے۔ چودہ ہزار روپے شاید چودھری صاحب کے لئے بھاری رقم نہیں تھے لیکن دوسرے ایہوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ایک ہی مصنف کو اتنی رقم کی ہیکش بہت بڑی بات تھی۔ مگر دوسرے ناشروں کے ہاں کسی تصنیف کے دائمی حق اشاعت لینے کے لئے پچاس روپے سے زیادہ ادا کرنے کی روایت ہی نہ تھی۔ چھٹک ہے کہ کتب خانہ داروں کی گبیاد کے وقت اُسے مضبوط بنانے کے لئے چودھری صاحب نے بھی کچھ مسودے بستے داموں لئے لیکن بعد میں انہوں نے اویہوں اور فنکاروں کو مقبول رائٹنگ دینے کی رسم چلائی۔ اس رواج کی پہل چودھری صاحب ہی نے کی۔ اس پر ان کے ہم عصر ناشروں نے نکل بھول چڑھائی۔ وہ بٹلے اور جھلائے مگر بعد میں نہیں ہی ہرشی آگیا کہ کلدیاد کا صحیح طریقہ وہی تھا جس پر چودھری صاحب چل رہے تھے۔ اور ہندوستان کے اویہوں کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ان کی اویہ ریاضت "نگی کر اور دیا میں ڈال" کے مترادف نہیں۔

چودھری صاحب کی ناشرانہ سرگرمیاں اپنے ہی ادارے تک محدود نہیں تھیں۔ وہ اردو کی ترویج و ترقی کے لئے بھی دوڑ و دوپ کو تھرپے۔ کتابتِ بیا اور گٹ آپ کے اعتبار سے اچھی کتابیں چھاپ کر نئے کلمے والوں کو ادب کے میدان میں آمار کر اور ان کی حوصلہ افزائی کر کے انہوں نے اردو میں نہایت اچھی چیزیں لکھوائیں۔ ایک دفعہ تو انہوں نے عجیب و غریب پروگرام بنایا۔ اویہوں سے زبردستی کچھ نہ کچھ لکھوانے کے لئے، انہوں نے پورے ہندوستان کو دور کیا۔ ہندوستان کے جس کو نے میں بھی کوئی ادیب چھپا ہوا تھا چودھری صاحب چیک بک لے کر اس کے پاس پہنچے۔ کسی کو افسانوں کے لئے، کسی کو ڈراموں کے لئے، کسی کو تنقید و تحقیق کے لئے اور کسی کو ناول لکھنے کے لئے ابھلا۔ اور رائٹنگ پیشگی دے دی۔ یہ اس طوفانی دور کے کا نتیجہ تھا کہ عصمت چغتائی نے ناول "پیر می گبر" لکھا۔ باری نے "کپڑی کی حکومت" لکھا اور جہاد بنایا۔ اختر حسین رائے پوری نے "جنگ اور ادب" کے نام سے تنقیدی مقالے لکھے۔ روشن چند نے

”نئے نئے نامیے کی جلد دوم مرتب کی۔“

پہچان بین، کرید اور تجسس کو چودھری صاحب نے اُدھر چھوڑنا لیا تھا۔ جس کسی سے ملتے شورو کرتے۔ جن لوگوں کا مطالعہ وسیع ہوتا ان سے موضوع بہ شہرہ آفاق کتابوں کی فہرس بنواتے۔ ہر نئے کھنے والے کے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم کرتے۔ اگر کسی کے ہاں کسی نئے ڈھنگ کا گروپش دکھاتا تو اس گروپش والی کتاب کو فوراً منگو لیتے حتیٰ کہ کتابت کو بہتر بنانے کے لئے طویل بحث کو قہر شریف عباسی، اقبال عباسی اور محمد حسین شاہ فرجوان کاہن کی صلاحیت کو منظر عام پر لانے والے بھی چودھری صاحب ہی تھے۔ اور آج جو ہمیں کتابت ایسے فی میں ارتقا کی جھلک نظر آتی ہے وہ چودھری بکت علی کا مہرِ منت ہے۔ جنہوں نے لاہور کو تھیں دلیا کہ اس فن میں رتی کی کافی گنجائش ہے۔ مشوروں کی افادیت تو چودھری صاحب خوب پہانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شام کو وہ ادبوں اور نگاروں کا ایک جلوس لے کر پائے پینے نکلتے تھے۔ اند کی کا نظام ہٹل ادبی مباحثوں کا شام کو اکثر اکھاڑے بنا۔ اور اسی نظام ہٹل کی قدیم منحل شاہی چھتوں کے نیچے ہم فیصلے ہوتے۔ پھر وہی فیصلے چودھری بکت علی کے ہاتھوں مل میں اگر اُدھر وادب کو خوب صحت پہن دیتے۔ چودھری صاحب کو ادبیل اور نگاروں کی محبت بہت پسند آتی تھی۔ رات کو کھانے پر اکثر ان کے ہاں ادبوں کا جگمگا ہوا کرتا۔ ادبوں کی چھوٹی چھوٹی اور جگامی ضرورتیں شاید سب زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ متیر تم کے اور ہر وقت کے نئے نئے مطالبات سے ہرگز تنگ نہ آتے۔ ان کی پیشانی پر کبھی بل نہ پڑتا۔ ایک دلفریب سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر نمودار ہوتی اور ساتھ ہی چودھری صاحب حیب میں ہاتھ ڈال کر دمال نکالتے۔ (کیونکہ اکثر وہ نوٹ دمال میں باندھ کر رکھا کرتے تھے) اور دمال جب کھلتا تو وہ کسی ادیب کے گلے میں گرم کوٹ ہی جاتا۔ کسی کے پاؤں میں جوتی اور کسی کے نئے شام کی بوتل۔

اور اس طرح چودھری صاحب نے اُدھر وادب کی عظیم خدمت کی۔ چودھری صاحب کی موت جس کا یقین نہیں آتا جس پر یقین کرنے کو ہی نہیں ملتا اُدھر کے صحت مند اور حقیقت پسند ادب کی موت معلوم ہوتی ہے۔ سامراجی دیسوں میں بچ کے نائنڈھ ادب کو سیرانا مار جلایا جا رہا ہے۔ اور ایسے ادب کے ناشرین کے کان پکڑوائے جا رہے ہیں۔ وہ نائب ہو کر اپنی زندگی برقرار رکھنے اور حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے، طیش، تجلیل اور نہر بھرا لٹریچر کے دل و دماغ میں شرس رہتے ہیں۔ آج نگلی کہانیاں اور نگلی تصویریں چھاپنا زیادہ آسان ہے۔ بھوٹ کو بے نقاب کرنے والے ادب کی اشاعت جلدی ہو گئی کا کام ہے۔ ایسے وقت میں چودھری صاحب کی جدائی فاشی قوتوں اور ان کے ٹھوکر کی حیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن صحت مند روایت ہمیشہ آگے بڑھی ہے۔ مجھے چودھری صاحب کے واضحی سے پوری توقع ہے کہ وہ اُنسی دل گردے سے کام لے کر حقیقت پسند ادب کی اشاعت کا بیڑا اٹھائیں گے اور اتنے ہی ثابت قدم رہیں گے جتنے کہ چودھری صاحب نے کیونکہ انہیں زندہ رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔



مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں

یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

(اقبال)

سلاہ چلی شہری

ایک باخلوص انسان

”— کاروان، مخزن، ادبی دنیا، نیرنگ خیال اور عالم گیر کاہجہ واقعی“ عروج کا زمانہ تھا تو میں ادبی میدان میں پاؤں پاؤں چل رہا تھا۔ جب ریشا بھارتیہ، ہمایوں، ”ساتی“ اور ادب لطیف کا چہرہ سننے لگا۔ پہلے کے جواہر اب اس تہک کے طور ہی نکلتے تھے۔ بعض نے تو اپنے انداز بھی بدل لئے تھے۔ بے شک میری ادبی زندگی کا آغاز ”نیرنگ خیال“ کے ہاتھوں ہوا لیکن مجھے پران پڑ جانے میں میری کے دور کے ادبی دنیا اور میرزا ادیب کے پہلے دور کے ادب لطیف، حامد علی خاں کے دور کے ہمایوں اور شاہد احمد کے دہلی کے دور کے ”ساتی“ کا بڑا ہاتھ ہے (میں صرف ماہناموں کا ذکر کر رہا ہوں۔) زیارت اللہ انصاری کے شروع کے دور کے ہفتہ وار ”ہندوستان“ نے مجھے کچھ کم تربیت نہیں دی تھی، بلکہ ”ساتی“ نے ادب لطیف کے بعد مجھے بنایا تھا۔

اپنی ادبی زندگی کے آغاز کی یاد دہانی ہے چننا دیہوں، شاعروں، مفکرین اور خاص طور پر ایڈیٹروں اور پیشروں کے بارے میں بڑی سچائی کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا۔ اس لئے کہ میرا یہ دور بڑا پاکیزہ دور تھا، نازک دور تھا، میری ادبی بقا اور موت کا دور تھا۔ اس دور میں کہیں پہلی نکی پہلی خلیت، بلی بھٹی اور پہلی محبت کا فطری طور پر، ضرورت مند ہو سکتا تھا۔ اور آج بھی اسی دور کے نقوش ہی پاکیزگی کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ میں ان نقوش کو بلیوں پر چھو کر نکالا دیتا، انسانی کردار سے گری ہوئی بات سمجھا ہوں۔

اسی رشتے کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں ”مکتبہ دو“ اور ادب لطیف اور ان کے مالکوں اور منتظمین کو ابھی طرح جانتا ہوں اور ان کا احترام کرتا ہوں اس لئے کہ میری نئی زندگی کے ابتدائی دور کو تربیت دینے میں آگے بے جانے میں یہ لوگ ہمیشہ میرے مددگار رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ میری بیشتر تخلیقیں ”ادب لطیف“ ہی میں شائع ہوئی ہیں، یہ بالکل ٹھیک ہے کہ میرا دوسرا محبوب کلام (دستیں) ”مکتبہ دو“ لاہور ہی نے شائع کیا اور میری ادبی زندگی کے لئے یہ بھی ایک غیر فانی حقیقت ہے کہ سب سے پہلے شائع کے رسالوں میں اگر کسی نے مجھے معاوضہ دیا ہے تو وہ ”ادب لطیف“ کے مدیر کی حیثیت سے میرزا ادیب کے شروع کے دور کا ذکر ہے۔

— میں بھی محب ہوں، بھائی میرزا ادیب نے کپتے ہوئے قلم سے اپنے ۱۲ اگست ۱۹۵۷ء کے خط میں مختصر (چودھری) برکت علی کے انتقال پر ہلا کی خبر دی ہے اور میں ہوں کہ دُور غم سے دھڑکتے ہوئے دل اور اشکبار آنکھوں پر غور قابو پانا چاہتا ہوں اور اپنی شاعری کے کچھ نیک پاکیزہ داری کی طرف انکار یا لومہ کے ذمہ ہوں کے سہارے اٹھنے لگا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اس المیہ نے اس دم میری نئی زندگی کے دو خاص منظر بہرے خیالوں میں زندہ کر دیے ہیں۔ میں یونیورسٹی لائبریری، الہ آباد کے شعبہ مشرق (اردو، فارسی اور عربی) کا انچارج ہوں۔ وکٹوریہ ہٹل۔ کٹوا (الہ آباد) میں محمد انور شریف کی گرم چائے ان کی ہنسیا نظروں کی چھاؤں میں چمکے سے پی کر، اور مختصر حسین (جواہر کراچی میں ہیں) کے غضب ناک لیکن محبت بھری اشاروں سے گھبرا کر دس بجے سے پہلے ہی دفتر آ گیا ہوں گھبرا کر اعلیٰ شری ترپاٹھی جی (لاہور میں) اور یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے پروفیسر جواہر دھون سنگھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں، کبڑے کرے کی طرف ان کا حکم پانے کے بعد جانے ہی والا ہوں کہ شکار کوٹ اور کشمیری ٹول میں دو وجہ آدمی آگئے ہیں۔ ایک جوان ہے اور ایک ادھیڑ

لیکن ادھیڑ ہوتے ہوئے بھی کافی تندہست

”آپ مجھے پہچان کیسے تھے؟“

”آپ کی تصویر جو ”ادب لطیف“ میں شائع ہو چکا ہے۔“

آپ کے لئے چائے منگادیں؟

”نہیں حضرت! آج آپ کی تقریر کی مدد سے دلی ہمارے اوپر ہے، جہاں خود میزبان بن رہا تھا لیکن یہ سن کر مجھ پر غصہ اور بے تکلف مزاحمت کی آواز تھی۔ ادب زیادہ باتیں مزاحمتی کر رہے تھے۔ برکت علی صاحب کے چہرے سے خاموشی اور متانت برس رہی تھی۔ البتہ ان کے چوڑے ماتھے کے شکنہ دور دنیا کے دکھ درد و ادنیائی نچائی بھی ہوئی آنکھوں سے ان کی شفقت اور محبت کا ضرور پہ چلتا تھا۔“

”آپ نے اپنے مجموعہ کلام کے لئے مجھے لکھا تھا، اب ہم خود آپ کی پاس آگئے ہیں۔“ بہت دیر کے بعد برکت علی صاحب بولے اور فوراً ڈیڑھ سو کے نوٹ میری میز پر رکھ دئے۔ ”بقیہ مسودہ پانے کے بعد“ انہوں نے ایک تھپے پشیر کی حیثیت سے کہا اور پھر ان کے بجائے مزاحمتی مزاحمتی کر کے کہنے لگے۔
تھوڑی دیر کے لئے چٹائی لے لو۔ ذرا شہر میں تقریر کر آئیں۔“

— شائد دو دن تک یہ دونوں حضرات اہل آباد میں رہے اور ہر جگہ ہر محل میں مجھے اپنے ساتھ گھسیٹے رہے۔ فراق گو رکھپوری اور ڈاکٹر جہاں کو بہانے بعض صحبتیں بڑی دلچسپ رہیں۔

— دوسرا یاد آفریں منظر جو اس وقت میرے تصورات میں ہے، اس کے نقوش یہ ہیں۔

والدین نے مزید تعلیم دلوانے سے انکار کر دیا ہے، میں کچھ سیاسی لیڈر، کچھ انقلابی شاعر اور کچھ ”ڈان جون“ بننا چاہتا ہوں اور کبھی اہل آباد، کبھی فیض آباد، کبھی مکتو اور کبھی دہلی کے ادبی حلقوں کا چکر لگایا کرتا ہوں۔ ایک صاحب (شاید انجم نام تھا) کا غرضاً غرضاً خط پانے کے بعد میں نے لاہور جانے کا قطعی ارادہ کر لیا ہے (یہ میرا لاہور گناہ دوسرا دور تھا، پہلی بار میں میرا جی کے یہاں ٹھہرا تھا)۔
میں لاہور پہنچ گیا ہوں اور ”مکتبہ ابد“ کے سرکار مدد والے دفتر کی بالائی منزل میں مقیم ہوں۔

مجھے نہیں معلوم ہے کہ واقعی ایک شاعر اور ادیب کو اپنے طے والوں اور قدر دانوں سے کس طرح سلوک کرنا چاہیے۔ شہرت کے باوجود مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں Pose نہیں کر پا رہا ہوں۔ — ذرا اسی بات پر چڑھتا ہوں، اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ باتیں کرنا۔ ہر طبعی اور ادبی مسئلے پر بیوقوفانہ بوجھ بول دینا۔ — میرے قدر دانوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے اور میں اپنے اُن پڑھ اور دہقان ہونے پر تڑپ کر رہا ہوں۔
ایک خط اُداس بیٹھا ہوں کہ چودھری برکت علی صاحب اوپر آگئے ہیں۔ — ”وہ جوش“ وہ بھوسہ اور وہ تازگی جو آپ کی نظموں میں ہے، اس کا شائبہ بھی آپ کی روزانہ کی زندگی میں نہیں ملتا۔“

”میں اپنی کمزوریوں اور حرمیوں کو کیسے جھٹکاؤں؟“

کمزوریوں اور حرمیوں کا خاکہ کون نہیں ہے۔ آپ یہ احساس کتری دور کر دیں تو اچھا ہے۔ یہ آپ کے فی اور آپ کی زندگی کے لئے بہت مفید ہے اور ایک بات اور — آپ ہر شخص پر اتنی جلدی بھروسہ کرنے کی عادت چھوڑ دیں! آج پہلی بار یہ خاموشی دینا مجھ سے کھل کر باتیں کر رہا تھا۔ پھر مزاحمتی مزاحمتی اور غیر احمد وغیرہ آگئے اور مجھے قریب کے ایک ہوٹل میں بیٹھ لے گئے (شاید نظام ہوٹل نام تھا) مزاحمتی مزاحمتی طرح سن کر مجھ اور باؤنی تھے۔ فکر شاید میرے المیہ کو اپنے المیہ سے ہم آہنگ کر رہا تھا اور شیر احمد معصوم اور اچھے اچھے سے لگ رہے تھے۔

دن بیتی، چینی گڑے۔ سال رخصت ہوتے رہے اور ایک میل وقت گزرتی۔

اردو کی ادبی دنیا میں ترقی پسندی اور رجعت پسندی کی جنگ چھڑ گئی اور میں نے جانے کیوں رجعت پسند سمجھا جانے لگا۔ میری اپنی کچھ بریاں تھیں اور سب سے زیادہ یہ کہ مجھے اس کا یقین تھا کہ فن کی منزل کے لئے میرا ہی راستہ ٹھیک ہے۔ علاوہ اس کے یہ کہ میں اب بھی بڑا فاضل تھا۔ میں اپنے راستے پر چلتا رہا۔ چتا رہا اور اپنی تکیہ دل رہا ہوں۔ ادب لطیف، اس کا بڑا تاب سے نکلتا رہا۔

اچانک ادب لطیف کے کچھ "ایڈیٹوریل" نظر سے گزرے اور میں چونک سا گیا۔ یہ تو ادب و حیات کے تعلق میرے ہی خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ یہی کہ "ترقی پسند ادب کے معانی صرف کسی سیاسی جماعت کے لئے نہیں بلکہ ہر پارٹی کے لئے ہیں"۔ ادب زندگی کا صرف ایک ہی پہلو پیش نہیں کرتا۔ گویا صبح ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہے تو مجموعی طور پر اسے زندگی کے تمام پہلوؤں کو چھونا چاہئے!!

میں نے اس طوفانی بحر میں بھی چودھری صاحب کی اس تبت اور اس غم کے لئے، انہیں خطوط لکھے اور انہوں نے میرے ہر خط کا تسلی بخش جواب دیا۔ مگر میں پھر بھی "ادب لطیف" میں نہیں لکھ رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری ضد تھی۔ اپنی ایک نظم پر اختلاف رائے کے باعث میں میرزا آدیب سے ناراض بھی ہو گیا تھا۔ میں یہ سوچ رہی نہیں سکتا تھا بلکہ اب بھی میں اس کا خیال ہی نہیں کر سکتا کہ میرزا آپس کا دوست میرزا آدیب کسی بھی معنی میں میرزا آپس کا ہے مگر ایسے میں کہ میں اپنی نظموں کو اپنی اولاد نہیں سمجھتا بلکہ خود ان کے پرچم اڑاتا رہتا ہوں، میں یہ بھی نہیں بدداشت کر سکتا کہ میں جس بات کو اچھا کہوں، میرے قریبی دوست اسے برا کہیں۔

— بہر حال اردو کے نئے اور ترقی پسند ادب کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی، میرا دعویٰ ہے کہ کوئی بھی سمجھا رہا اور باخلوص مصنف مکتبہ اردو اور ادب لطیف کو نظر انداز نہ کر سکے گا۔ ہم اہل قلم ہر کچھ سوچتے ہیں، جو کچھ لکھتے ہیں اسے جتنا کہ سامنے ہی ایڈیٹر اور پبلشری پیش کرتے ہیں، ہم انگریزوں تو یہ اس کے سارے ہم اگر غور میں تو یہ ہمارے پریم مغربی عالم میں جب کسی مصنف کو طوفانی شہرت حاصل ہوتی ہے تو ناقدین سب پہلے اس آدمی اور اس ادارے کی جستجو کرتے ہیں جو ان کی شہرت کی وجہ بنا ہے۔ اچھے اور باخلوص پبلشرز کا مقصد صرف پیسہ کھانا ہی نہیں ہوتا۔ ان کے دل میں زبان و ادب کی ترقی کی گئی رہتی ہے اور وہی مصنفین کی مدد سے قلم ادب کی تعمیر کرتے ہیں۔ اچھے پبلشرز اکھ سے دہی ہوئی چٹکاریاں اور کھڑروں سے جواہر نکالتے ہیں اور پھر ان کے شعلوں اور ان کے جلوؤں سے تمام ادبی دنیا کو جگمگ کر دیتے ہیں۔ یہ بد قسمتی کی بات ہے کہ اردو میں ایسے پبلشرز کم ہی ہیں۔ دل میں یہ لگن ہو مگر اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ایسے پبلشرز سرے سے معذور ہی ہیں۔ میں نے پبلشرز کو سمجھنے کے لئے کچھ ذاتی تجربات کئے ہیں اور مجھے زیادہ مایوسی نہیں ہوئی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ "مدینتی بک ڈپو" لکھنؤ۔ "ساتی بک ڈپو" دہلی (ادرا ب کراچی) اور "مکتبہ اردو" لاہور نے میری چھوٹی سی ادبی زندگی میں میری کب کب اور کس کس طرح مدد کی ہے۔

میرزا آدیب نے مجھے لکھا ہے کہ "آپ چودھری صاحب کے قریبی دوست تھے اس لئے آپ ان کی یاد میں کچھ لکھ دیجئے! جہاں تک عمر کا سوال ہے، میں ان کا دوست نہیں تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں ان سے بہت مانوس تھا۔ وہ میرے بزرگ اور مددگار تھے۔ کس اکیسہ کی عمر ہانے کے بعد میری عادت رونے کی نہیں ہے اور نہ مجھے اپنے ادب سوگ طاری کرنا اچھا لگتا ہے۔ میں ایسے رتوں پر بہت جلد اپنے دل کی دھڑکیں ادا اپنی آنکھوں کے آنسوؤں پر قابو پا لیتا ہوں اور پھر اس آدمی کی اچھائیوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں اور میرے دل میں یہ تمنا پھلتی گھلتی ہے کہ اس آدمی کے جتنے اچھے کام ادا ہوئے رہ گئے ہیں، انہیں کوئی اور آدمی ادا کرے۔ میں موت سے بھی ایک پیغام لینے کا

طوبی ہوں۔

سوال یہ ہے کہ چودھری صاحب کی موت ہم اردو دالوں اور خاص طور پر اردو کے پیشروں کو کون سا پیغام دیتی ہے اور پھر اس سوال کا جواب دالے کے بعد مجموعی طور پر جو پیغام ہمیں ملے۔ میں اس کی روشنی میں اپنے کل اسٹے حقیقت اس باخلاق انسان اور ترقی پسند پیشرو کی یاد میں بیانے چاہتا ہوں۔

آج اور آج سے پہلے اردو کی کیا حالت تھی۔ آج بھی خود پاکستان میں اردو کی کیا حالت ہے، میں اس کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ اگر حقیقتیں گاہیک ٹھیک ہے کہ "ایڈیٹر اور پیشرو نہیں ٹوٹتے ہیں تو پیشرو کا یہ شکوہ بھی بے جا نہیں کہ "ہمارے پاس سرمایہ نہیں ہے عوام میں ابھی زبان کے لئے تڑپ اور لگن نہیں پیدا ہوئی۔ آؤں "مکتبہ اردو" لاہور کو ایک سرمایہ دار ادارہ سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں مگر بگے معلوم ہے کہ یہ غلط ہے۔ میں اس ادارے کی فضاؤں میں رہ چکا ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ چودھری برکت علی اور ان کے اعزاء کس کس شکل سے اردو کی گاڑی چلا رہے تھے اور چلا رہے ہیں۔

میں جذباتی اور ذاتی تعلقات کا بہت قائل ہوں (اور ماسی لئے ابھی تک زندگی میں کایا ب نہیں ہو سکا ہوں) اور اس وقت جبکہ چودھری حرم کی یاد میں کھتے کھتے میرا قلم ہلکا رنگ گیا ہے میں ان کے خطوط، ان کی ملاقاتیں اور ان کی نصیحتیں یاد کر رہا ہوں، میرے کانوں میں ان کی یہ آواز گونج رہی ہے۔

"کمزوریوں اور غریبوں کا شکار کون نہیں۔ آپ یہ احساس کتنی دُور کر دیں تو اچھا ہے۔ یہ آپ کے فن اور آپ کی زندگی کے لئے بہت مفرب ہے۔"



قرار دادِ تعزیت

علقہ ایباب ذوق چودھری برکت علی میرا ہنامہ "ادب لطیف" و "مالک مکتبہ اردو" پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اور اسے اردو کے لئے نقصان عظیم خیال کرتا ہے۔

چودھری برکت علی کی ذات اپنی شرافت، علوم اور قابلیت کے علاوہ بے لوث ادب فواری، علم پروری اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی بے پناہ لگن کی وجہ سے اوچند نامور شخصیتوں میں شمار ہوتی تھی جن کی مثال کم ملتی ہے۔ ان کی اس دائمی مفادقت سے جو غلط پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا اگر نامکن نہیں تو شکل مردہ ہے۔

شہرت بخاری

سیکرٹری علقہ ایباب ذوق

چودھری برکت علی

چودھری مرحوم مرزا حسن کے آدمی تھے ان کا میرے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے۔ ایک ہی کی موت کی خبر کی کہ مجھے دل رنج ہوا اور میں دیر تک سوچا رہا کہ جو شخص اس قدر متواضع اور ہمت فزا ہو گیا وہ کبھی مر سکتا ہے۔ سوچتے سوچتے ایک ذہنی تصویر آنکھوں کے سامنے ابھرائی اور میں محسوس کرنے لگا جیسے وہ غروار ٹہلا اور شہوار پہنے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہوں۔ جب وہ مسکراتے تھے تو آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو جاتی تھی جو ان کی مسکراہٹ کو اور بھی دلخیز بنا دیتی تھی۔

اب ان کا کتابی چہرہ اور کشادہ پیشانی میری نظروں کے سامنے ہے۔ میں کس طرح یقین کر لیں کہ وہ مر گئے۔ نہیں چودھری برکت علی مر نہیں گئے! یہاں نہیں انہیں مسئلہ سے جانتا تھا مگر صرف اتنا کہ وہ ایک خلسہ میں بحیثیت انسان وہ کیا ہیں اتنا جاننے کا موقع مجھے نہیں ملا شاید اس کی وجہ یہ کہ بلا سلسلہ کسی بات میں دخل دینا چودھری صاحب کی عادت نہ تھی۔

جب مسئلہ میں کتابت کے امداد اور دب لطیف کا انتظام چودھری صاحب نے سنبھالا تو میرا ان سے براہ راست واسطہ پڑا۔ اس وقت مجھے ان کی نوع میں بھاگنے اور انہیں بحیثیت ایک انسان کے سمجھنے کا موقع ملا۔ انہی دنوں میں نے ”ادب لطیف“ میں پھر سے لکھنا شروع کیا۔ چودھری صاحب ایک دو محاکاتوں میں ہی تھکے ہو گئے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوسرے آدمی کے جذبات کا احترام کرتے تھے اور بڑی مروت سے پیش آتے تھے اور صاحب کی عقل میں اس قدر مضمون بچوں کی طرح باتیں کرتے تھے اور وہی ان کی زندگی کا خوبصورت پہلو تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ آدمی باتیں کر رہے ہیں اور چودھری صاحب قریب بیٹھے ہیں ان کے بے حس اور شوش چہرے سا گمان ہوتا تھا کہ وہ ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے۔ لیکن بات چیت جب کسی نازک مرحلہ پہنچتی تو وہ جھٹ بول اٹھتے اور ایسی چکی بیٹتے کہ ساری عقل قبضہ زار بن جاتی۔ خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔

شکل کے طور پر ادب لطیف کا مسئلہ کا سالانہ مرتب ہو رہا تھا۔ فکریڈیٹر تھے اور تنازعہ منقہ کہانیوں کا حصہ دیکھتے تھے چودھری صاحب نے مجھے بولایا تھا کہ تمناز منقہ کو میری کہانی ”گڈ وائٹ“ (جو میں نے سانا سے کے بیٹے دی تھی) اعتراض تھا اور وہ اس پر تیار نہ خیال کرنا چاہتے تھے۔ نگر اور منقہ ادب میں آپس میں اس کے متعلق باتیں کر رہے تھے چودھری صاحب پاس بیٹھے تھے جیسے ہماری بات چیت سے انہیں کوئی سروکار نہ ہو۔ میں نہ رہے ہوں۔ تمناز منقہ چاہتے تھے کہ اس کہانی میں کچھ واقعاتی تغیر ہو جائے۔ اس لئے میں اسے طور آگے بڑھاؤں اور یہ دکھاؤں کہ نتیجہ بیمار ہو گیا یا اس کی جگہ ٹوٹ گئی ہے اور وہ چٹا بھول گیا ہے۔ لیکن میں بند تھا کہ افسانہ مکمل ہے۔ میں نے اس میں زندگی کے ارتعاش کو اس کی عملی صورت میں پیش کیا ہے۔ واقعاتی تغیر کہانی کی ذمہ داری میرے پر ہے اس سائنٹفک مرکزی خیال کو تباہ کر دے گا۔ تمناز منقہ مجھ سے متفق نہیں تھے افسانہ اپنی موجودہ صورت میں انہیں محض ایک واقعہ نظر آتا تھا اس میں TURNING POINT ہونا چاہئے تھا اور وہی پیدا کرنے کے لئے وہ مجھے کہہ رہے تھے۔ بحث جب ایسے سگھے پور پہنچ کر رک گئی کہ اس کے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں تھی تو چودھری صاحب جھٹ بول اٹھے: ”اچھا بھئی، افسانہ جیسے ہے ویسے ہی رہنے دو“ اور وہی جانی بوجھی مسکراہٹ اور دکھش چمک آنکھوں میں لاکر کہا: ”آپ بھی ادیب اور بھی ادیب ہر ایک ادیب

اپنے کار کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ طنز میں کریم وگ بھی نہیں پڑے۔ ان کے فیصلے کے مطابق انسانوں کا توں چپا صرف اس نظر کی حفاظت کے
مطابق کا عنوان "دقتا" کر دیا گیا۔

دو تین ماہ بعد لاہور میں مقررہ مارانہ فساد شروع ہو گیا۔ چودھری صاحب کے رشتہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف وہ انسانوں کی اس وحشت سے ناگوار تھے
اور فرقہ پرست جنہوں کی بدالہویوں اور آنکھوں دیکھی حرکتوں کے پچھلے سنایا کرتے تھے۔ آج ہم میں سب باتوں کو یاد کرتے ہیں تو بلا دروغ کہنا چاہتا ہوں کہ
چودھری صاحب ایک نیک طینت انسان تھے وہ ہر نقیب سے بلند ہو کر عمر بھر ادب کی خدمت کرتے رہے۔
آج اپنے صالح عمل اور کردار سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور وہی آنے والی نسلیں کے لئے کثرت میں چھوڑ جاتا ہے۔



پیغام

دو پیغام جو چودھری صاحب نے اپنی موت سے چند روز پیشتر انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری سالانہ کانفرنس کو مقدم پر بھیجا

میں انتہائی مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ کانفرنس اپنے بلکہ مقاصد میں کامیاب ہوگی اور
ملک کے سربراہ اور وہ با شعور و با رغبتہ رائے سے جو منشور منظور کریں گے وہ وقت کے عین تقاضوں کے مطابق ہوگا اور اس کی وجہ
اپنی قلم کی اکثریت انجمن۔۔۔ سے ہم آہنگ ہوگی۔

یہ منشور ان احساسات اور عزم کا پر تو ہونا چاہئے جو پاکستانی عوام کی مادی بہتری و خوشحالی اور روحانی ترقی کے لئے ملک کے
مخلص خدمت گزاروں کے سینوں میں موجزن ہیں۔

اس کے ساتھ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ ترقی پسند اپنی ذہنی جدوجہد میں اردو کو بھی اس مقام پر پہنچا دیں گے جس کی یہ مستحق ہے۔
مجھے اس بات پر فخر ہے کہ کتب خانہ اور ادب لطیف نے ہمیشہ ادب کی ترقی پسند تحریک کا ساتھ دیا ہے اور اکثر اس سلسلے میں گونا گوں
رکاوٹوں اور مصیبتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ہے یہ ضرور ہے کہ پچھلے منشور سے مجھے کچھ اختلاف تھا اور اختلاف کی وجہ بدتمی کہ
میں ادب کو سب سے پہلے ادب سمجھتا ہوں اور اس کے کسی سیاست کا اڑکھ بٹکر صحافت کی سطح پر لانے کے خلاف ہوں، مجوزہ منشور میں نے
دیکھا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ بڑے غور و فکر کا نتیجہ ہے اور اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو میرے نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہو۔

میں آپ کو یقین دلانا ہوں ادب لطیف اور کتب خانہ نے اب تک جس سرگرمی سے اس تحریک کا ساتھ دیا ہے اسی سرگرمی کا مظاہرہ آئندہ قلوب میں بھی
ہونا چاہئے گا۔

میل پر جو میرا ادارہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہے میں ساتھ ہی اور ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔

میں گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ سے صاحب فرائض ہوں چلنا پھرنا تو ہر ایک طرف اس وقت اٹھنے بیٹھنے سے بھی محروم ہوں۔ اگر سفر کرنے
کے ذریعہ قابل ہوتا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی اس کانفرنس میں ضرور شریک ہوتا اور اس کی تمام کاروباریں میں حصہ لیتا۔

(برکت علی چودھری)

لاہور۔ ۹ جولائی ۱۹۵۲ء

ترقی پسند پیشتر

چودھری برکت علی چند ماہ آدھری طویل ہونے کو اس کی اطلاع کسی نے مجھے بھی دی لیکن ہمارے ملک میں کن طویل نہیں ہوتا۔ اس کے بعد میرے بھائی نے لکھا کہ ان کے ہاں زیادہ ہی خواہش ہو گئی ہے۔ یہ بات ابدتہ تغریباً تھی۔ میں نے انہیں خدا کا سامنا نہیں کیا تھا۔ صاحب نے اطلاع دی کہ دعا کا مرحلہ قریب قریب ختم ہے۔ کچھ ہر تو ہو۔ لیکن میں بدنامی پسند ہوں اور جب کراچی آنے والے کچھ ترقی پسند معتمدین نے بتایا کہ وہ ہسپتال میں ان سے ملے تھے۔ بیماری دائمی نہیں ہے لیکن میں رخصت کرتے وقت بھی ان کی زندہ دلی قائم تھی اور ان کی غصوں میں جلیں تھیں۔ انہوں نے انہوں نے ظاہر کیا کہ میں ترقی پسند معتمدین کی کانفرنس میں شریک ہونے کے قابل نہیں لیکن ہمیشہ کی طرح اب کے بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ (اور وہیں پانچ سو روپیہ بھی دیا)۔ تو میں نے سوچا۔ اندیشے غفلت ہیں چودھری برکت علی جیسا زندگی سے بھرپور آدمی یوں نہیں مر سکتا۔ اس میں موت سے لڑنے کی ہمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کی خبر مجھے اچانک غیر متوقعہ اور ناگہانی معلوم ہوئی۔ اور کافی دیر میرے حواس کایقین کرنے سے انکار کرتے رہے۔

چودھری صاحب کی زندگی کسی بھی سب کو معلوم ہے۔ انہوں نے لاکھوں کما سنا اور لاکھوں ہی خرچ کئے۔ کتنے ہی اسکول اور غیراتی ادارے ان کے دھنم سے چل رہے تھے۔ نوجوان معتمدوں سے ان کا سلوک پدرانہ اور مشفقانہ تھا۔ لیکن بات سچیت اور برتاؤ میں وہ اسی بے تکلفی سے کام لیتے تھے جو برابر کے بزرگوں میں ہوتی ہے۔ ان کا تہیہ بے پناہ ہوتا تھا اور وہ ایک جگہ جم کر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی طبیعت سیمائی تھی۔ میں نے انہیں میٹھے بہت کم دیکھا ہے وہ ہمیشہ جاتے نظر آتے تھے جیسے انہیں زندگی میں کام بہت کرنے ہوں اور وقت تھوڑا ہو۔ یہ بات سچ تھی ہماری نئے ادب کی تحریک جس کا ترقی پسند تحریک محض ایک حصہ ہے۔ ۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء کے قریب شروع ہوئی اور قریب قریب اسی زمانے میں مکتبہ اردو اور ادب لطیف کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس کے بعد سے اب تک اس تحریک کا اہل امدادوں سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور انہیں ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ ہمارے اکثر بڑے معتمدین ادب لطیف کی وساطت سے ابھرتے اور بگڑتے ہوئے کی وساطت سے ان کی کتابیں ہمارے سامنے آئیں۔ تداومت پرست عقلموں نے نئے ادب پر ہر پہلو سے ناک تان کر رکھے کئی کئی اس پر خاشی کا الزام لگایا کئی مشترکیت کا میل چسپاں کیا لیکن چودھری صاحب اس ہر ہمارے پودے کو مقدس امانت سمجھتے تھے اور ان محاسنوں سے بے نیاز اپنی انفرادی اور ناشرانہ حیثیت میں ان کی حفاظت کے لئے سینہ سپر رہے۔

میں ان ہزاروں لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے انہیں کبھی دوسرے اور کبھی نزدیک سے دیکھا ہے اور ہر بار ان کے خلوص، ایثار اور زندہ دلی سے متاثر رہے ہیں۔ ان کے انتقال کی خبر کے ساتھ کتنی ہی محنت کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ کتنی ہی محفلیں۔ ذہنی کچھ پروہ سمیں پر نظم کے مناظر کی طرح آتی ہیں اور سٹ جاتی ہیں۔ چودھری برکت علی صاحب ایک انسٹی ٹیوشن تھے اور ادب کے سلسلے میں ان کی خدمات انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ان کی بہترین یادگار مکتبہ اردو اور ادب لطیف ہیں اور یہ قائم رہنے چاہئیں۔ زندہ دلوں کے مزار ان کے دوستوں کے سینوں میں رہ جاتے ہیں۔ اس لئے ہم لوگوں کے لئے وہ اپنے کارنامے بھی نہیں بلکہ خوشگوار یادوں کا سرمایہ بھی ہو کر رخصت ہوتے ہیں۔

چودھری مروم

بھائی میو مریب !

اس کوئی شک نہیں کہ سرت پر کھڑے ہو کر میں نے یہی اس نئی خبر کو بڑے کھلے بالکل تیار تھا۔ میں دوپہر کھانا کھا رہا تھا جب آپ کا خط
 میرے سامنے آیا۔ آپ نے اس بار لکھا ہوا۔ بڑے اشتیاق سے خط کو کھولا۔ یہی فلسفے کی بات کی جگہ ہے۔ چودھری برکت علی کی اچانک موت کی خبر کو بڑھاپا۔
 یکدم منٹ کے لئے پڑھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ اور پھر لاہور کی پانی پانی قاتلوں میں بھاگ کر رہ گیا۔ آج سے بارہویں پہلے کی بات ہے، جب پہلی بار چودھری برکت علی سے
 ملاقات ہوئی۔ اس وقت ان کی دوکان مری دروازے کے باہر تھی۔ چودھری برکت علی اور چودھری میو مریب دونوں اکٹھا کام کرتے تھے۔ چودھری صاحب کا خطوں قلمت اور ہوں
 کو اس ادارے کے کھنڈ کیونچ لایا تھا۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپر داتا سنگھ، غنواں سب ادیبوں سے یہیں ملاقات ہوئی۔ اسی دفتر میں گندھیاں
 پڑھ جاتی تھیں۔ چائے پی جاتی تھیں۔ رنگ بولی کھان جاتی تھیں۔ گیس لگی جاتی تھیں۔ اور ادب لطیف کی نئی پالیسی کا رخ لے کیا جاتا تھا۔ چودھری برکت علی میں ایک
 خیرگی تھی، ان کی باتوں میں ایک وقار تھا جس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ انہیں ادیبوں سے محبت تھی۔ ان کی کتابوں سے دلہانہ عشق تھا۔ وہ ہر شاعر کو نظر عام پر
 لانا چاہتے تھے، اور ترقی پسند ادیب کی ترقی کے لئے ہمیشہ کوشش کرتے رہتے تھے۔ انہی کی کوششوں سے کتب خانہ نے ہندوستان کے اُبھرتے ہوئے افسانہ نگار
 اور شاعروں کی کتابیں چھاپیں۔ اور اردو پبلشنگ کا ایک ایسا میاں قائم کیا۔ آج تک کوئی اور ادارہ اس انداز کی کتابیں چھاپ کر آگے نہیں بڑھ سکا۔ ان میں ابھی
 ادب کو پرکھنے کا ذوق تھا۔ کتابیں چھاپنے کا سلیقہ تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے ادیب مددوں کی عزت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہر چھوٹا ادیب کچھ بڑے
 کے بعد بڑا ادیب بن جاتا ہے، اور اس طرح انہوں نے ہندوستان کے بہتری ادیبوں کی کتابیں چھاپیں۔ اور اردو ادب کو ایک نئی سطح پر پہنچایا۔ یہ دائمی ایک معرکے
 کی بات تھی۔ چودھری برکت علی سے آخری ملاقات پہنائیں ہوئی۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے، جب یہ چودھری صاحب اور چودھری میو مریب ہندوستان کا دورہ
 کرتے ہوئے پٹنہ پہنچے۔ اور کرشن چندر کے پاس ٹھہرے۔ ان دنوں جوش اور ساغر نظامی پونا میں تھے۔ اچھی خاصی غصیل میں تھے۔ چودھری برکت علی پر مخلص تھے۔ گاتے
 رہے۔ لیکن آئندہ کا اشنا حق پر گلام بھی بنایا۔ مجھے یاد ہے کہ برکت علی کا کرتے تھے یہی شمس صاحب، اب کے کتاب ایسی چھاپوں گا کہ وہ ہندوستان میں ایک یادگاری کی
 رہ جائے میں چاہتا ہوں کہ ہر شے اور چھوٹے ادیب کی کتاب میرے ادارہ سے چھپے میں چاہتا ہوں کہ کوئی ادیب جو کاندھلے سے رہے میں بلا بائیں کو ٹاٹھی دے۔
 اور آپ لوگ صرف ادب کی خدمت کریں۔ اور کچھ نہیں۔ اس وقت دہجوش، کرشن چندر، ساغر نظامی، اور میری کتابیں لے گئے۔ اور اسی طرح باقی ہندوستان کا دورہ
 کر کے باہر مسودے لے گئے۔ اور سب کو رائٹ کر دی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کتب خانہ نے چودھری برکت علی کی قیادت میں اردو ادب کو ایک
 نئی سطح پر پہنچایا۔ ترقی پسند ادیبوں کی کتابیں چھاپ کر اس تحریک کی خدمت کی چودھری صاحب کی یہ خدمت قابلِ غور و شکر ہے۔ ان کی اچانک موت کا بے
 بہت رنج ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے ساتھی ادب لطیف کو یادگار برکت علی سمجھ کر اس میں گتے دیں گے۔ اور کتب خانہ اردو اسی طرح ترقی پسند تحریک کا ساتھ
 دیتا رہے گا۔ میں اپنی طرف سے ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں سے اپنے دلی غم کا اظہار کرتا ہوں۔ کاش میں دماغ پہنچ سکتا۔

تغری بیعات

جو ترغیم کے مختلف گوشوں سے اویسوں اور انشوں نے بھیجے

چودھری برکت علی صاحب مرحوم حضور کی ذات گرامی دیناٹے شاعت ادب میں ایک نہایت ہی ممتاز درجہ رکھتی تھی۔
انہوں نے گدست پیداوار اہل نے انہیں ہم سے چھین لیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اس غم میں مجھے اپنا شریک سمجھو۔
چودھری صاحب مرحوم میرے حال پر جو شفقت فرمایا کرتے تھے، اس کا بدلہ اتنا بھرے لئے ناممکن ہے۔ مرث آنا کر سکتا ہوں
کہ اپنی بیعت کے مطابق آپ کے ارشادات گرامی کی تعمیل کو اپنی سعادت سمجھوں۔

(سید ذوالفقار علی بخاری)

آپ کے والد ماجد کی وفات کا حال مجھ کی بہت افسوس ہوا۔ میری دلی ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔ اور میری تمنا ہے
کہ میں کا قائل کیا ہوا کاروبار آپ کی نگرانی میں سرسبز رہتا ہے۔ اس کا تو مجھے یقین ہے کہ آپ کے ارادے نے مرحوم و معذور کی
رہنمائی میں ارادہ آپ کی جو خدمت کی ہے اس میں یقیناً اضافہ ہوتا رہے گا۔ آپ اردو کے ان مخلص حامیوں میں ہیں جن کے اخلاقی
پریشہ ہر دہ کیاجا سکتا ہے۔

(قاضی، محمد عبدالغفار)

چودھری برکت علی صاحب کی وفات کی خبر ایسی غیر متوقع تھی کہ یقین نہیں آتا۔ اب بھی جیسے ان کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھ رہا
ہوں۔ جب وہ آخری بار پیشی میں ہمارے ہاں آئے تھے ان دنوں کی خوشگوار یادیں میرے خاندان میں چمک اٹھیں ہیں۔ موت بھی کیسے کیسے
پرانی ٹھکانی ہے۔ چودھری صاحب کو جہاں اپنی کتابیں شائع کرنے کا جنون تھا وہاں وہ ان اچھی کتابیں لکھنے والے مستفید کی
محیوں اور غلاموں سے بھی کا حقد آشنا ہوتے تھے۔ اور اکثر محفل میں ان کا ذکر بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا کرتے تھے۔ افسوس کہ بارہ
کی محفل سے ایک اچھا دست اٹھ گیا۔ اس کی یادگار اور بے طبع باقی ہے۔ اسے باقی اور زندہ رہنا چاہئے۔

(ذکر شہنشاہ)

چودھری برکت علی مرحوم میرے پرانے دوست اور ہم کتب تھے۔ ان کے انتقال سے مجھے ایسا ہی صدمہ پہنچا جیسا کہ تاثیر
اختر شیرانی باری امیر آج کی وفات سے پہنچا تھا۔ خدا ان سب کی دلوں کو جنت میں جگہ دے۔
آج کل کچھ ایسی تری پڑی ہے کہ اپنی اور دوسروں کی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں رہا۔

(غلام عباس)

چودھری برکت علی مرحوم کی وفات کی خبر اخبار میں دیکھی۔ جو دلی صدمہ پہنچا اس کا اظہار ناقابل بیان ہے۔ یہ کب اور کسے معلوم
تھا کہ ہماری ان کی پہلی ملاقات آخری ملاقات میں جلسے کی مجلس دلی میں لاہور سے کراچی آنے والا تھا اس میں وہ مجھے اور قاسمی کو
ہر کے گھر سے گئے، اور وہاں بڑی دیر تک ٹہل ٹہل کر علی دادی موضوعات اور اشاعتی پروگرام پر باتیں کرتے رہے۔ چونکہ انتظار کا

وقت قریب تھا اور مجھے اسٹیشن بھی پہنچنا تھا۔ اس لئے ہم لوگ قطار سے قبل ہی لوٹ آئے۔ معلوم ہے چونکہ اسی دن ان کا کوئی بکے دودان ہی ہیں درود گروہ کی شکایت ہو گئی۔ یہ خبر تاحی صاحب کراچی لائے خیال یہ تھا کہ کچھ دنوں کے بعد سنبھل جائیں گے۔ لیکن ناترکب کسی کی تو قہات کو پورا کرتا ہے جو اسے پورا کرتا ہے چودھری برکت علی بذات خدا ایک ادارہ تھے، انہوں نے ترقی پسند ادب اور نئے رجحانات کا اس وقت ساتھ دیا جبکہ دوسرے ناشرین اس نام سے بدکتے تھے۔ ادب لطیف کی کامیابی اور شہرت میں اعلیٰ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے کوششیں چند، راجند سنگھ بیدی، فیض احمد فیض، ساحر زیدیم اور بہت سے دوسرے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی۔ ان کا اس سے بھی بڑا کارنامہ بادی مرحوم کے بنانے اور ان کی تحریروں کے ذریعے ترقی پسند خیالات کی تبلیغ و اشاعت کا تھا۔ جہاں تک ادیبوں کے ساتھ لین دین کا تعلق ہے ان سے ہر شخص مطمئن اور آسودہ تھا۔ ایک وہ شخص جس کی ملاقات اتنے قوی سے ہوئی کہ وہی بڑا جگہ سا بقدر کم مہاجروہ اس بات کا متفق نہیں کہ ان کی تمام خوبیوں کا اعلاہ کر کے تاہم اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس تیل طاعت ہی میں یہ چیز عسوس کر لی کہ چودھری برکت علی کو کچھ سے دلچسپی مرت رہے ہے کی خاطر نہیں ہے بلکہ وہ اس لواٹے کے ذریعے ملک و قوم اور ادب کی صحیح معنوں میں خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

ادارے کو ان کا کام آگے بڑھانا چاہئے، کیونکہ زندگی لافانی ہے۔ اگر چودھری صاحب مکتبہ اور ان کی خدمات کا تسلسل زندہ ہے گا تو چودھری برکت علی بھی زندہ رہیں گے۔

(تمنا مسین)

چودھری برکت علی صاحب کی وفات پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ وہ ہمارے لئے قابلِ صدا احترام تھے۔ اور ان کی یاد ہمارے دل و دماغ سے کبھی محو نہ ہوگی۔

اس صدمہ جانکام میں میں آپ کے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔ آپ مکتبہ اردو ادب لطیف اور پنجاب بکلاؤ کے کاروبار کو بڑھا کر ان کی یاد کو زندہ جاوید کر سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ چودھری صاحب نے جو شمع روشن کی تھی آپ اسے روشن رکھیں گے۔ یہی ان کی بہترین یادگار ہے۔

(عبدالسلام خورشید)

چودھری برکت علی کی وفات کی خبر سن کر بے حد صدمہ ہوا مجھے اسوس ہے کہ ان کی بیماری کی خبر کا مجھے علم نہ ہوا۔ اور میں ملاقات محروم رہ گیا۔ چودھری صاحب کی شخصیت سے ہم سب کو محبت تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ آپ ان کے نقش قدم پر چل سکیں۔ اور اس جانکام صدمے کو برداشت کر سکیں۔

(تمنا مفتی)

اللہ تعالیٰ جناب چودھری صاحب مرحوم پر رحمت کے دروازے داکرے! آمین۔ یہ درجہ خبر مجھے آپ کے خط سے ملی۔

آتا اللہ و آتا الیہ راجعون۔

مکتبہ اردو سے میرے ویریز تعلقات ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق دے کہ آپ اپنے والد صاحب کی رہایا خیر حاصل کر جاری قائم اور مستحکم رکھ سکیں۔ انشاء اللہ حسب توفیق میں آپ سے تعاون کرتا رہوں گا۔

(سید اختر امجدی)

چودھری صاحب کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بے حد رنج ہوا۔ مجھے اس سے پہلے ان کی بیماری کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ اور نہ ان کے انتقال کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت نصیب کرے۔ اور آپ حضرات کو صبر کی توفیق دے۔

آپ بڑی خدمت کریں گے مگر ان کے قیمتی ورثہ کو قائم رکھیں گے۔

رشتا ہما محمد ہوی

حقیقت یہ ہے کہ چودھری صاحب کی موت ان کے اعزہ اور اولاد کے علاوہ ان کے وسیع حلقہ احباب کے لئے بھی بہت دردناک ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی اشاعت اور ترویج کا کام اس وقت شروع کیا جب ملک میں غمنا اور پنجاب میں شہوٹا کوئی قابل فکر اشاعتی ادارہ موجود نہ تھا۔ اور بظاہر اشاعت کی زمین اتنی بخر مسموم ہوتی تھی کہ کسی بہادر اور حوصلہ مند شخص کے بغیر اس زمین میں قدم رکھنا کسی دوسرے آدمی کا کام نہ تھا۔ چودھری صاحب نے نقصان اور ضائع کے خوف کے باوجود قدم اٹھایا۔ اور اپنی ہمت اور زیرکی کا بدلت ہست جلد اس بخر زمین کو ادب کا گل و گلزار بنام با۔۔۔ میں چودھری صاحب کو ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے بھی جانتا ہوں۔ اور اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ مجلس احرار کے پر جوش مدکن اور خادم کی حیثیت سے عملی خدمات انجام دے رہے تھے اس حیثیت سے بھی ان کی زندگی اور ان کا عمل نہایت قابل قدر اور قابل تائید تھا۔ میری ناپسندیدہ باتیں میں چودھری صاحب کے انتقال سے خاموشی سے کہتے ہیں ایک بہت بڑا غلام پیدا ہو گیا ہے جس کو آسانی سے پر نہیں کیا جاسکتا۔ خدا تعالیٰ آپ کو اپنے والد مرحوم جیسا حوصلہ و ہمت اور ان جیسی زیرکی اور فراست عطا فرمائے۔ مجھے آپ کی ہمدردی ہے اور میں آپ کو اپنے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

ر سید عبدالرشید

چودھری صاحب مرحوم کے انتقال پر ملال کی خبر سن کر تمام ساتھیوں کو صدمہ ہوا۔ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور اور ہم سب کو اس قابل بنائے کہ اس ادبی تحریک کی خدمت کر سکیں جس کے ساتھ مرحوم تا عمر وابستہ رہے۔

(ڈاکٹر، سلامت اللہ)

چودھری برکت علی مرحوم کی بے وقت وفات حد درجہ افسوس ناک ہے۔ اشاعت ادب کے سلسلہ میں بھی یہ نقصان عظیم ہے۔ اور حلقہ احباب کے لئے شدید صدمہ کا موجب۔

خداوند کریم مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا کرے اور پس ماندگان کو توفیق صبر بخشے۔

(عشرت رحمانی)

چودھری صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر اس سے کچھ عرصے قبل سنی تھی۔ انہوں نے اردو ادب اور زبان کی جو خدمات کی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ادب کی دیوی کے پاس جمال اور حسن تھا۔ مگر اسے وجہ ذہنی اور خوش پوشاکی عطا کرنے میں چودھری صاحب کا بڑا اہم حصہ رہا ہے۔ میری طرف سے تعزیت قبول فرمائیے۔

مجھے سرت ہے کہ آپ نے چودھری صاحب کے عظیم ورثے کو پوری ذمہ داری سے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اپنی طرف سے آپ کو پوری اعانت اور امداد کا یقین دلاتا ہوں۔ میں آپ کی ہر طرح سادنت کرنے میں سرت محسوس کدوں گا۔

(ڈاکٹر، محمد حسن)

چودھری صاحب کو مرحوم کہتے ہوئے کیجئے منہ کو آتا ہے۔ مرحوم کی اشاعتی خدمات کو اردو ادب اگر وہ اپنے محسنوں کو فراموش کرنے کا ذکر نہیں ہے تو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ خدا مرحوم کو فردوس بریں میں جگہ دے اور آپ کو اور دیگر پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ادب عظیم مرحوم کا مدد حافی ورثہ ہے۔ آپ فراموشی میں۔ بنانا خون ہے۔ کام کرنے کی خواہش بھی ہے۔ کوشش کیجئے

کہ ادب لطیف کا معیار اور بلند درجہ اور وہ ایسا بن جائے کہ لوگ ہر لمحہ کی پہلی تاریخ کو اپنی ڈاک میں سب سے پہلے اسے ہی تلاش کریں۔ اور یہ کام آپ کے لئے ہے۔ ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔ آپ کا کاروبار وسیع ہے۔ والد صاحب کے نام کو آپ اسی طرح زندہ رکھتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی مدح کو سکون کا سلطان بھی ہبسا کر لیتے ہیں۔

آپ کا یہ عمل آپ کے عزم کو ظاہر کرتا ہے۔ مکتبہ اردو اور ادب لطیف کو نہ صرف زندہ رکھوں گا بلکہ دونوں پہلے سے بھی بڑھ کر ترقی کریں گے۔ میری طرف سے ہر قسم کا تعاون ان شاء اللہ ہمیشہ آپ کو حاصل رہے گا۔

(جیل جیل)

چودھری صاحب کی وفات کی خبر سنی کر مجھے یقین نہ آیا کہ میں چودھری صاحب کی وفات کی خبر سن رہا ہوں۔ دراصل مجھے کچھ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ میں جب کبھی ادب لطیف کے دفتر میں بیٹھا ہوتا ہوں تو نہ جانے کیوں مجھے ہر گھڑی یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی دروازہ کھلے گا اور ایک مضبوط چوڑے جسم والا انسان سکڑتا ہوا اندر داخل ہوگا اور ٹوپی اتار کر کہے گا۔ "بھئی واہ یہاں تو میلہ لگا ہے۔"

(اسے حمید)

چودھری برکت علی صاحب کے نا وقت انتقال کا انتہائی افسوس ہے۔ انہوں نے اردو کی قلمی خدمت کی ہے اس کی مثال شکل ہی سے مل سکے گی۔ ادب لطیف کو جس طرح سے انہوں نے اتنے روز چلایا ہے وہ تو آپ اپنی مثال ہے۔ چودھری صاحب کی اس یادگار کو زندہ رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ اپنی حد تک میں مکمل اشتراک کا یقین دلاتا ہوں

(غلام ربانی تابان)

چودھری صاحب مرحوم نے علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت کے ذریعے ہندوستان کی جو خدمت انجام دی ہے وہ کسی پوشیدہ نہیں۔ اس وقت ان کی یادگار کو بہترین طرز پر قائم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کے کام کو پوری ہمت سے جاری رکھیں اور انہوں نے جو پودے لگائے ہیں جان و دل سے ان کی آبیاری کریں۔ مجھے یقین ہے اس نیک کام میں آپ کو چودھری صاحب مرحوم کے تمام دوستوں اور رفیقوں کا تعاون حاصل ہوگا۔

(جلال ناٹھ آزار)

آپ کا خط ملا۔ جو بھی اس کی پہلی سطر پر نگاہ ڈری۔ دل کا ایک دھچکا سا لگا اور مجھے ایسے معلوم ہوا جیسے میں کوئی بہت قیمتی شے کھو بیٹھا ہوں۔ چودھری برکت علی کی موت کا یہ صدمہ بہت بڑا صدمہ ہے۔ ابھی میں ان کی رہنمائی کی بڑی ضرورت تھی۔ افسوس کہ حیات نے دانا نہ کی۔

لیکن اس سب کے باوجود دل نہیں مانتا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اچھا ہے اگر دل نہ مانے۔ ورنہ اگر دل کہیں یہ مان گیا تو پھر اردو کچھ نہ مانے گا۔

(مارگن قیوڈر)

چودھری برکت علی صاحب کی قبل از وقت موت کی خبر کو ہر اس شخص نے جس کا اردو ادب و زبان سے تھوڑا سا تعلق ہی ہے دلی صدمہ کے ساتھ سنا ہوگا۔ مرحوم پہلے لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے خالص و معیاری ادبی تصنیفات کو گٹ آپ کی جسدِ بستیوں خوبصورتیوں کے ساتھ چھاپنا شروع کیا۔ اور یوں اردو ادب کے فروغ و قبول میں یادگار حصہ لیا۔

(امید منیر جعفری)

چودھری صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر اخبارات میں پڑھ چکا تھا۔ کیا کہوں دل پر کیا گوری۔ زبانِ قادیان کا ایک ایسا مری ہم سے ہے۔
پہلے جس نے گیسوئے اردو کو صحیح معنوں میں سنوایا۔ میں ادبِ لطیف کا مطالعہ کم پیش بارہ سال سے کر رہا ہوں۔ اور مجھے
بہ اصرار کر کے مسرت ہوتی ہے کہ میں نے اپنے اپنی ذوق کی تربیت اور اپنے شور کو چلا دینے میں ادبِ لطیف سے بڑا فائدہ
اٹھایا ہے۔ ادبِ لطیف ترقی پسند ادیبوں کا ایسا دارِ مار ہے جو باقاعدہ نکلتا رہا ہے۔ اور میں اہتمام قارئین کے ساتھ اس سے کسب
میلے پر چلی کے ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات پیش کی ہیں۔ شاید ہی اس کی مثالی اردو محافت میں مل سکے۔ اگر اردو کے بہترین
مناظروں، نظموں، نثر اور تنقیدی مضامین کا جائزہ لیا جائے تو مجھے پوری توقع ہے کہ اس میں سے بیشتر ایسے نکلیں گے جو
جو پہلے بار ادبِ لطیف کے ذریعہ متعارف ہوئے۔

مکتبہ اردو نے نوجوان ادیبوں کی تخلیقات کو شائع کر کے اشاعت کا جو سرمایہ پیش کیا ہے وہ غلطاً جیسے پہلی پہلی مثال ہے
آج تو خیر بہت سے مکتبے قائم ہو گئے ہیں جو اپنی مطبوعات کو زیادہ سے زیادہ حسین و دلآویز بنانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس
ماہ میں پہلا چراغ مکتبہ اردو ہی نے جلایا ہے جسے اردو ادب و زبان کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ابھی کل ہی کراچی کے رسالہ افکار کا تازہ ترین پرچہ طابع میں چودھری صاحب مرحوم کا وہ پیغام شائع ہوا ہے جو انہوں
نے بہتر حالات سے ترقی پسند مصنفین پاکستان کی کانفرنس کو بھیجا ہے۔ پڑھ کر دل ہیرا آیا۔ ان کا خلوص، ان کا اپنے ادب سے لگاؤ،
نوجوان ادیبوں سے ان کی محبت کے امٹ نقوش ہمارے دلوں کو ہمیشہ گرم رکھیں گے۔

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

امید ہے آپ چودھری صاحب کی اعلیٰ دعائیات کے بہترین وارث ثابت ہو گئے ہیں آپ کو اپنے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔
(خلیل الرحمن اعظمی)

چودھری صاحب کی موت آپ کے لئے جتنی جانکاہ ثابت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ تو ہم لگا نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے لئے
بھی کچھ کم از کم ہناک نہیں ہے۔ لیکن جس نے ادب کی خدمت میں اپنی جان دی اسے ہم مرحوم کہنے کی جرأت کیونکر کر سکتے ہیں۔ اس
کی مدح ہماری تہذیب و ثقافت کی روح ہے۔ اور اس کا ہر نقش قدم ہمارے لئے مشعل راہ بن سکتا ہے۔

آپ نے چودھری صاحب کے قدموں کو پہچان لیا ہے۔ آپ جو کچھ کریں گے انشاء اللہ اس میں کامیاب ہوں گے۔ میں
اردو کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ اگر اس سلسلے میں آپ کی کسی خدمت کے لائق ہوتا تھا اس سے ہرگز گریز نہیں کرتا۔
(راجم اعظمی)

چودھری برکت علی مرحوم کی وفات سے دلی حد مرہوا۔ مرحوم کی ادب دوستی میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ان کی
تمام عمر خدمتِ ادب میں گزری۔ مکتبہ اردو اور ادبِ لطیف کے ذریعے سب سے پہلے انہوں نے نئی پنجاب میں ترقی پسند ادب کی
اشاعت کا پیرا اٹھایا۔ باری مرحوم کی کتاب کپہی کی حکومت انہوں نے اس وقت چھاپی جب کہ اس قسم کی جرأت بہت بھلی پڑتی تھی۔
مرحوم سے ہمارے ذاتی مراسم بھی تھے۔ اس لئے ہمیں انہیں قریب دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ حقیقتاً شعوری طور پر ترقی پسند
واقعہ جو شے تھی ایک تاجو جوتے جوئے بھی ہمیشہ جلبِ زر سے زیادہ مقصدیت کا انہیں خیال رہا۔ وہ چاہتے تو گھٹیا لٹریچر
چھاپ کر پڑاؤں لاکھوں روپے کما سکتے تھے لیکن اپنے نام اور معیار کو ریٹ لگانا انہیں کبھی گوارا نہ ہوا۔

میں امید ہے جو مشعل مکتبہ اردو اور ادبِ لطیف کی صورت میں چودھری صاحب مرحوم روشن کر گئے ہیں وہ کبھی گل نہ بجے گی۔

ہماری ہمدردیاں اور مخصوص عقائد آپ کے ساتھ ہیں۔

(فانی بخاری - رونا ہمدانی)

چودھری صاحب کے انتقال کی خبر سے مجھے دلی رنج اور قلق ہوا۔ مرحوم سے ذاتی طور پر میرے مراسم اگرچہ بہت گہرے نہیں تھے۔ تاہم چند مختصر سی گفتگوں ہی نے مجھے ان کی شریف انسانی اور خلوص نے بے حد متاثر کیا تھا۔ ان کی موت بلاشبہ اردو لکچر کے ایک عظیم اور ناقابل فراموش عین کی موت ہے۔
میں یہ چند سطور انتہائی دکھ سے لکھ رہا ہوں۔

(نریش کمار شکوہ)

اخبارات سے یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ ادب و لطیف کے مالک جناب چودھری برکت علی صاحب کا انتقال ہو گیا۔
منا مرحوم کو جو ارحمت میں جگہ دے امدان کے متعلقین کو نیز آپ سب لوگوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
شکرا سید نور الحسنی اٹھی۔

اخبارات کے ذریعہ آپ کے والد گرامی کی وفات کا پڑھ کر بہت صدمہ ہوا۔ آپ اردو کی اشاعت میں چودھری صاحب نے ایک طرح زو استوار کی تھی جو ان کے زندہ جاوید رہنے کی ضمانت ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ ان کے قابل قدر تر کے کو دفتر قائم رکھیں گے۔ بلکہ اس کی ترقی کا باعث بھی ہوں گے۔ آپ کے عزائم قابل تعریف ہیں۔ خدا آپ کو چودھری صاحب مرحوم کی مدد فرماتا
بقدر رکھنے کی توفیق اندانی فرمائے۔

میری سادہ آپ کے مثالی حال ہے۔

(سید فیض)

کل ہی چودھری صاحب کے انتقال کی خبر "امروز" میں پڑھی۔ کیا بتاؤں؟
کتے عالم گند گئے دل پر

چودھری صاحب کو ہمارے ادب اور زندگی کے ارتقاء پسند نظریات سے جس قدر خلوص تھا۔ وہ ایک حقیقت ہے۔
آئینے کی طرح صاف اور روشن حقیقت۔

چودھری صاحب اٹھ گئے، ہمارے مخلص ساتھیوں میں سے ایک ساتھی کم ہو گیا۔ ہماری دنیا ایک انسان سے محروم ہو گئی۔
ان تمام عزائم سے محروم ہو گئی جو عمل میں ڈھل آنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ کتنا عظیم نقصان ہے۔ کرشن چندر
نے یہ کہا ہے۔ "جب ایک انسان مرتا ہے تو..... ایک دنیا مرجاتی ہے۔"

میں کیا ہندوپاک کے سامنے ادیب، شاعر اور فنکار اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ ادیبوں بھی ان آئینوں کو پہنچنے
کی کوشش کریں گے۔ جو چودھری صاحب کی موت سنستی ہوئی آنکھوں کو ٹپک رہی ہے۔ اور یہ بھی کچ ہے کہ

نوت جب آ کے کوئی شمع بجھا دیتی ہے
زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے

لیکن۔۔۔ اس وسیع و عریض دنیا میں چودھری برکت علی کہاں ملیں گے؟

اک ہی غم ہے، نہیں جس کا علاج کوئی

چودھری صاحب کی وفات سے ادبی اور ثقافتی دنیا کو جو منہ بٹھا ہے وہ مدتوں تک نرا خوش نہیں کیا جاسکے گا۔
 اللہ تعالیٰ کی مدد سے جو عطا فرمائے۔ آمین!
 میں جس سے غلام ہوں اسے آپ کے غم میں شرکت کا اسیا چکے بلند عزائم سے تعاون کا چین دیتا ہوں۔

(فرد مجذوری)

پہلے پاکستان ٹائمز میں چودھری برکت علی صاحب کی وفات کی خبر چھ کر دی کہ انتہائی قلق ہوا۔ افسوس کہ اردو ادب
 اپنے ایک بہت بڑے فن سے محروم ہو گیا ہے۔ مرحوم چودھری صاحب کو ترقی پسند ادب کبھی نرا خوش نہیں کر سکتا۔ وہ نہ صرف
 ادب کے اس کے مرنے اور مہمان رہنے میں بلکہ انہوں نے ترقی پسند ادب کے ہر موڑ پر اس کا غلغلہ اور دالہا ہا طور پر ساتھ
 دیا ہے۔ چودھری صاحب کا نام، ادب لطیف اور مکتبہ امداد کا مقام ادب کی تاریخ میں ہمیشہ مرتبہ واضح، روشن اور زندہ
 رہے گا۔ چودھری صاحب مرحوم نے زندگی کی شریالوں میں چمکتا ہوا گرم خون دوڑانے والے ادب اور تحریک کا چونکہ ہمیشہ
 سے ساتھ رہا ہے لہذا یہی سمجھتا ہوں کہ چودھری صاحب اپنی موت کے باوجود زندہ رہیں گے۔ موت اور وقت کا ہولناک
 چمکاؤ اس کے کارناموں اور نام کے نام اور نمایاں مقام کو کبھی دھندلانے کے لگا۔

(عزیز اثری)

چودھری برکت علی صاحب کی وفات کی خبر پڑھ افسوس ہوا۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اردو ادب کو ایسا
 علم فہم ادیب شناس اور اچھا پبلشر مشکل سے ملے گا۔

(ڈاکٹر وحید قسری)

آفاق اور امر دزمید خبر پڑھ کر افسوس ہوا کہ چودھری برکت علی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ مرحوم نے اردو ادب کی
 نشر و اشاعت میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ سب پر عیاں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ خود مصنف نہ تھے، لیکن جس طرح ایک لائبریرین خود
 مصنف نہیں ہوتا لیکن معتقد کو نئے نئے مشورے دے کر نئی کتابیں لکھانے میں مدد کرتا ہے۔ اسی طرح ایک ناشر بھی یہی
 کام دوسرے طریق پر انجام دیتا ہے۔ چودھری صاحب نے اپنی ہمت سے اپنے لئے ایک نئی راہ پیدا کی۔ اور بہت سے
 نئے لکھنے والوں کو پہلی مرتبہ امداد والی طبقہ سے روشناس کرایا۔ بہر حال مرنے والے میں ہزاروں خوبیاں تھیں۔ اور ان کی
 دائمی ہوائی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ آپ کو اس موقع پر جو رنج ہوا، ہو گا وہ ظاہر ہے۔ مجھ کو بھی اپنے غم میں بڑا بکا شریک
 ہے۔ خدا آپ کو اس رنج کے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(بنی احمد جامعہ ملیہ)

کراچی انجمن کا ایک جلسہ ہوا تھا، اس میں معلوم ہوا کہ آپ کے قابل قدر والد صاحب چودھری برکت علی کا اچھا
 خیال ہو گیا ہے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرمائے۔ اور آپ لوگوں کو اصرار کرنے کی۔ اور ان کے
 حق کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

میں نے اردو ادب کی جتنی بھی خدمت کی ہے لاہور کے کسی ادارہ نے بھی نہیں کی۔ میرے ان سے کچھ سے
 راجسٹریٹ کی بنیاد پر آپ سے عرض کروں گا کہ ان کے کاروبار کو ان سے بھی زیادہ آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔
 دینی شرف (مکتب خانہ علم و ادب)

آپ کا خط آپ کے والد مرحوم کی وفات کی خبر سے بعد بڑا امداد دار العنیں اس بار میں آپ کا خط ملا ہے۔ مرحوم نے اردو زبان کی بڑی گمان تدفین مت انجام دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت و معرت سے سزا دے۔
دار العنیں آپ کے علمی و ادبی خدمات میں ہر طرح تعاون کے لئے ہمیشہ تیار رہے گا۔
میں مدینہ مجددہ دار العنیں

تغزیت کی تشریح و ادب

”انجمن ناشران و تاجران کتب کراچی کا یہ غیر معمولی جلسہ چودھری برکت علی صاحب ملک مکتبہ اردو و پنجاب بک ڈپو کی چھٹک وفات پر اپنے دلی سگ و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اصحاب کے انتقال کو ایک ایسا سانحہ تصور کرتا ہے جسے علم و ادب حضرات کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ انہوں نے اردو علم و ادب کی نشر و اشاعت میں سالہا سال تک جو نمایاں حصہ لیا اور اردو کتابوں کو مقامی انداز پر پیش کرنے میں جو انفرادیت انہوں نے پیدا کی وہ محنت و لگن مرحوم کی یاد کو تازہ رکھے گی۔ یہ جلسہ چودھری صاحب کی وفات کو اردو علم و ادب کے لئے ایک زبردست نقصان تصور کرتا ہے۔ اللہ خدا سے دست بردار ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔“

شریک غم، جناب الدین
سیکرٹری انجمن ناشران و تاجران کتب کراچی

انجمن ترقی پسند مصنفین شائع دہلی اس منجملہ غیر پراپیٹا رٹوس کرتی ہے کہ ادب لطیف کے مالک اور مدیر جناب چودھری برکت علی، راگت کو رحلت فرما گئے ہیں۔ مرحوم کی ادبی خدمات کے سلسلہ میں کوئی ادب دوست ناواقف نہیں۔ مرحوم کو شروع ہی سے ترقی پسند تحریک سے دلی لگاؤ تھا۔ اور انہوں نے دوسرے ناشرین کے مقابلہ میں ہمیشہ ترقی پسند تحریک کی تعانیف شائع کیں۔ ادب لطیف جس بہت اور استقلال سے نکل نکلتا ہے ترقی پسند اور ہوں کی فائزگی کہ وہ اسے یہ موت ہی کا کام تھا۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اردو ادب کی اشاعتی تاریخ میں چودھری صاحب کی یہ وقت موت سے بڑھ کر پیدا ہو گیا ہے وہ بہت دنوں تک پڑ نہیں ہو سکے گا۔

پکاشی وراثت سکریٹری
انجمن ترقی پسند مصنفین دہلی

آٹھ اینڈ لٹریچر سوسائٹی ایبٹ آباد کے تمام ممبرین اور اس اجلاس کے تمام حاضرین و حاضرین کے شہریدہ چودھری برکت علی ملک مکتبہ اردو و ایڈیٹر ادب لطیف کی وفات حسرت آیات پر اظہار غم و غم کرتے ہیں۔ مرحوم نے اردو ادب کی خدمت اور ملک کے نوجوان اور ہوں کی بہت افزائی کا جو اس وقت سنبھالا جسکا یہ بزرگ ایک مسلسل پریشانی کے دور سے گزر رہا تھا یہ غلا ہسانی سے نہ ہو سکے گا۔ دعا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کو جنت فردوس میں جگہ دے اور مرحوم کے لواحقین کو اس غم کا کم کو

پاکستان کی ترقی و ترقی

پیشی کوڑہ۔۔۔ اندر نیم دل، انری پیکر نری، آرت لیٹلر عری، ماسی لیٹ
 قاشیل۔۔۔ نسیم جازی، نگارین تعمیر، روزنامہ رادپنڈی
 مورخہ۔۔۔ ۱۹۵۲ء۔۔۔

ذیوہد ارات۔۔۔ ایس فیاض علی صاحب، ایڈیٹ جنرل پاکستان



ہر اگست کی شام کو ادبی دورہ ہی کتابوں کے شہرہ نامہ شہرہ ترقی پسند ماہنامہ ادب بیٹ کے مالک و مدیر
 چودھری برکت علی دو جینے کی عکالت کے بعد انتقال کر گئے۔ اناجھند وانا الیہ، راجسورن!

چودھری صاحب کی عمر ۷۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ آپ لاہور کے لالائی بلدی کے اہم رکن تھے۔ انہوں نے ابتدائی
 تعلیم سکول میں حاصل کی، اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

بی۔ اے کرنے کے بعد آپ نے درسی کتابوں کا کام شروع کیا اور پنجاب بک ڈپو کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد ۱۹۴۲ء
 میں کتبہ دو کے نام سے ایک ادبی ادارہ قائم کیا، اور اسی زمانے میں میرزا ادیب کی ادارت میں ماہنامہ ادب بیٹ جاری کیا۔

کتبہ دو نے پچھلے سولہ سترہ برس میں اردو ادب کی اشاعت میں اس نیم پر علم میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔
 اور اس سلسلے میں کوئی اور

ادب کتبہ دو سے لگا نہیں کھا سکتا۔ دراصل اس تمام علمی و ادبی کام میں چودھری برکت علی مرحوم کی شخصیت کا اثر تھا۔
 ترقی پسند ادب کی نشر و اشاعت میں اس قدر بھری دھبہ کی وجہ بھی تھی کہ مرحوم شروع ہی سے سامراج دشمنی شروع

کے بہت ہی گہری دھبہ رکھتے تھے۔ گو چودھری صاحب نے علمی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ لیکن وہ ہمیشہ سامراج دشمن
 ماحول سے بہت بڑی ہمدردی رکھتے تھے۔ چنانچہ مجلس احرار سے ان کو اس زمانے میں اس لئے گہری محبت تھی کہ اس دور

میں ان کے ایک سامراج دشمن تحریک تھی۔ غالباً ہی سامراج دشمنی کا جذبہ تھا۔ جس نے چودھری صاحب کو کتبہ اردو کی بنیاد رکھنے
 کی طرف راغب کیا، چنانچہ کتبہ اردو نے ابتدائی برسوں میں جو کتابیں شائع کیں وہ سامراج دشمن ادب میں بہت ہی بلند درجہ رکھتی

تھیں۔ ان کے بارے میں مرحوم کی سرکردہ آزاد شخصیت، کپتن کی حکومت، کتبہ اردو کی طرف سے شائع کی گئی۔ اس وقت اس
 وقت کی کتاب شائع کرنا بڑے مشکل کام تھا۔ اس کے بعد کیونست جی فستو، سٹالین، جمست، نوز، مصطفیٰ اکمل اور

ان کے دیگر سامراج دشمن شخصیتوں کی زندگیاں شائع کیں۔ ان سیاسی موضوعات کے علاوہ جیب ہندوستان کے نیم پر علم
 میں ترقی پسند شخصیتوں کی تحریک اجری تو کتبہ اردو نے ہندوستان بھر کے ترقی پسند مصنفین کی نگاشات کو شائع کرنا شروع

کیا۔ چنانچہ ترقی پسند انصاریوں کی سب سے زیادہ تعلیمات سے کتبہ اردو نے شائع کیں۔
کرشن چندر، فٹو، راجندر سنگھ بیدی، احمد عباس، اختر الہی، حیات اللہ انصاری کے افسانوں کے علاوہ سب سے
پہلے اسی کتبہ سے شائع ہوئے۔

تلم میں بھی فیض اور دانش کے مجھے کتبہ اردو نے شائع کئے۔ فیض اور دانش کے علاوہ مجاز، قرائق، جذبی، اختر
انصاری کے مجھے بھی سب سے پہلے کتبہ اردو سے ہی شائع ہوئے ہیں۔

مروم درسی کتابوں کے کاروبار کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ پچھلے چند برس سے ان کا یہ کاروبار بہت پیش گیا
تھا۔ اور وہ اب اپنی پوری توجہ اردو کے کلاسیکی ادب کی جدید ترتیب و تدوین کی طرف مبذول کرنا چاہ رہے تھے کہ ہیکل جیڈ کا
نے ان پر حملہ کیا۔ مگر اس سیم سرگرم عمل شخصیت کا سلسلہ حیات ختم ہو گیا۔ ہمیں امید ہے کہ مروم کے لواحقین ان صحت مند اور
توانا روایات کو بدستور جاری رکھیں گے، جن سے مروم کو عقیدت کی حد تک محبت تھی۔

رہنما نظر "اسراوت" لاہور

لاہور کے علی دادی حلقوں میں یہ خبر رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی ہوگی کہ چودھری برکت علی مروم طویل علالت کے بعد
انتقال فرما گئے۔ چودھری صاحب نے اپنی زندگی ذاتی محنت اور جدوجہد سے خود بنائی تھی اور صحیح سنوں میں وہ —
PIONEER تھے۔ آپ زندگی بھر ادبی و اشاعتی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ کتبہ اردو اور پنجاب بک ڈپو کے پرنسپل
اور رسالہ ادب لطیف کے مالک و مدیر تھے۔ پنجاب بک ڈپو نے خامی تعداد میں درسی اور ادبی کتابیں شائع کی ہیں۔ اور کتبہ اردو
مشہور مصنفین کی ملک بھگ پانچ کتا ہیں شائع کر چکا ہے۔ آپ محض ایک ناشر اور کامیاب کاروباری ہی نہ تھے بلکہ
ایک سرگرم قومی کارکن اور ایک درد مند دل کے مالک بھی تھے۔ آپ نے کئی قومی تحریکوں میں مالی مدد دی ہے۔ آج مسلم
تعلیمی مجلس کے زیر اہتمام لاہور میں جو تیس باٹی سکول کام کر رہے ہیں انکے منبر بھی تھے۔

مروم خوش اخلاق اور شریف النفس انسان تھے۔ آپ کی وفات سے لاہور ایک عین علم و ادب سے محروم ہو گیا۔
ہم مروم کے پس ماندگان کے منہ و غم میں برابر کے شریک ہیں اور ان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ مروم اپنی
زندگی میں جن طرح نشر و اشاعت کے ذریعہ علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کے صاحبزادے اپنے
والد کے نقش قدم پر چل کر اس مفید کام اور ان کے اداروں کو جاری رکھیں گے۔ ہمیں مصنفین سے بھی توقع ہے کہ وہ اس کام سے
کی حسب معمول سرپرستی فرماتے رہیں گے۔

ہمدردی دعا ہے کہ خدا مروم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اور لواحقین کو صبرِ الہی عطا کرے۔

کتبہ اردو

کتبہ اردو لاہور کے مالک و مدیر چودھری برکت علی مروم کے ساتھ انتقال فرماتے ہیں۔

لکھا ہے۔ چودھری صاحب مرحوم نے ادبی اور شاعری حلقوں میں اردو ادب کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نے
موجودہ پاکستانی کے مشہور آدمی تھے۔ بزرگ و عظیم کے ادبی حلقوں میں آپ کا بڑا احترام تھا۔

آئی ادبی اور شاعری حلقے بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان ایک غفلت اور دوست اور ایک مستعد
ادیب نواز شخصیت سے محروم ہو گیا۔ آپ نے ماہنامہ ”ادب لطیف“ کے ذریعہ ادب اور زندگی کو ہمیشہ چلی دامن کی طرح
جالتے رکھا اور ہمیشہ ان کتابوں کو ملک کے سامنے پیش کیا جو واقعی ملک اور قوم کے لئے ضروری تھیں۔

ہم مکتبہ اردو، ادارہ ادب لطیف اور چودھری صاحب مرحوم کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے
ہیں۔ اللہ عاکرتے ہیں کہ خدا نے بزرگ و بزرگ چودھری صاحب کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین!
”لالہ فراز لائل پور“

چودھری برکت علی مرحوم جو پچھلے دنوں ڈھائی ماہ کی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ اردو زبان کے ان نچے ہمدرد
اور ندر دہن لوگوں میں سے تھے جن کی ٹھوس خدمات اور خاموش ہمدردی کو قوم ہمیشہ یاد رکھے گی۔ چودھری صاحب ادیب تھے۔
ادیب گرتے۔ فنکار نہ سکتے تھے۔ انہوں نے مکتبہ اردو اور ادب لطیف کے ذریعے ۱۵ سال تک اردو زبان اور اردو
کے ادیبوں اور فن کاروں کو بے انتہا فائدہ پہنچایا۔ ایک پبلشر اور کاروباری انسان ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی خود غرضی سے
کلام لے کر محض ذاتی منفعت کو تو نظر نہیں رکھا۔ بلکہ بے سہارا ادیبوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ ادیبوں
کے حقوق غصب کرنا عام پبلشرز کی خصوصیت ہے۔ مگر چودھری صاحب کے ہاتھوں ادیبوں کے حقوق ہمیشہ محفوظ رہے۔ ایسی
شائیں بھی موجود ہیں کہ بعض ادیبوں کی وفات کے بعد تک ان کے اہل و عیال کو چودھری صاحب سے فائدہ پہنچا رہا ہے!
اردو کے مصنفین کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے یہ ایک بہت ہی مناسب قسم کا اقدام تھا۔ گو ممالک غیر میں ادارہ ہائے
اشاعت کا مصنفین سے حسن سلوک کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں جہاں حق تلفی ایک عام عادت ہے۔ چودھری صاحب
کی حق شناس طبیعت بہت بڑا سہارا تھی۔

ان کی وفات پر ہمیں یکم چودھری برکت علی اور ان کے بچوں سے پوری پوری ہمدردی ہے۔
تضاد وہ کو بھی منظور تھا کہ ان کی عمر کا رشتہ اتنی جلد منقطع ہو جائے۔ مگر نیک نیتی کا جو بیج ان کے ہاتھوں آج
سے اس سال پھلے ہو یا گیا تھا۔ اردو میں روایات کے لئے مکتبہ اردو ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ادارے کے منتظین
اس کی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔

”بنتِ راوی لاہور“

چودھری برکت علی اردو کے ان پبلشرز میں تھے جن کا مصنفوں کے دلوں میں بدرجہ اتم احترام موجود ہے۔ آپ
کے مصنفین کی تسلی تھی اور تمام عمر خاموشی سے اردو کی خدمت انجام دیتے رہے۔ چودھری برکت علی اور

کتھا اور وہ درحقیقت ایک ہی بات ہے کہ وہ طبع نام ہے اور آئی لایا آئے ہمارے ہمارے کوئی اور جسے کتبہ اور
کی خصوص اور خاصیت سے نکال نہیں کر سکتا۔

ادب لطیف چار سو سالہ ادب کا ایک ایسا چوراہہ جس کی سڑکوں تک چودھری برکت علی نے آبیاری
کی۔ یہیں یقین ہے کہ ہمارے چودھری صاحب کی زندگی کا ہر لمحہ اور ادب کی ہر خدمت کرتا رہے گا۔
ادانہ آج کل ادب لطیف کے اس غم غم اور بکا شریک ہے، اور مستبد طبقہ کو چودھری صاحب مرحوم
کی جہاں بڑی شعلیں لگتے اور اور ادب لطیف سے دینا ہے ادب میں ہمیشہ روشن رہنا ہی ہے۔

ماہنامہ آج کل



اخبارات سے چودھری برکت علی صاحب کی وفات پر حال کے ستون معلوم ہو چکا تھا۔ حالات کی خبر تو پہلے ہی
معلوم تھی۔ لیکن یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ اچانک یہ سانحہ رونما ہو جائے گا۔ سال گزشتہ جب چودھری صاحب کو شہ
تشریف دے گئے تھے تو حالات بھی یہی خیال ہی نہ آ سکتا تھا کہ یہ پہلے اور آخری ملاقات ہوگی۔
ہم کی بارگاہ رکھنے کا بہترین طریقہ ان کے کام کو جاری رکھنا ہے۔ جسین قائم ہے کہ آپ کے ہاتھوں یہ کام
بجور خوبی جاری رہے گا۔ اور ترقی پر گامزن رہے گا۔ میں کیا اور میرا تعاون کیا۔ ہر حال ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔
یقین ہے کہ آپ کی سرکردگی میں کتبہ اور اور ادب لطیف باہر ترقی کرتے رہیں گے۔

(سید احمد رفیق)

آپ کے والد بزرگوار کی بے وقت موت نے اور ادب کے چند بھاری ناٹھروں کی بنایت ہی مختصر قیامت میں
سے ایک بنایت ہی پیاری شخصیت کو ہم سے چھین لیا ہے۔ خدا آپ کو ان کے ترکے کو سنبھالنے کے لئے اسی فراخ
و منگی سے سر فراز فرمائے جو مرحوم کا گراں پایہ اثاثہ تھا۔

آپ نے ترکہ میں ایک عظیم الشان ادا جائے کے علاوہ چند ایسی روایات بھی باقی ہیں جن کے زندہ رکھنے کی ذمہ داری
دوسری تمام ذمہ داریوں سے کہیں کم نہیں ہے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔
آپ ہم دونوں بھائیوں اور لائیڈ پریس کو ہمیشہ کی طرح اپنا ٹھکانہ اور حامی پائیں گے۔

محمد علی

چودھری صاحب کی وفات جہاں آپ کے لئے دردِ بجا تھا ہے وہاں ہمارے ادب کے لئے ایک ایسا نقصان
بھی ہے جس کی گہنی تلافی نہ ہو سکے گی۔ میری دلی دعا ہے کہ خداوند آپ کو اور دیگر بھائیوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔
مرحوم کے ادبی و علمی کارنامے عالم ادب میں مشعلِ ہدایت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب لطیف مرحوم کے اہل کار

میں نے اس کی نسبت مکتبہ ادب طبع کا اپنی تمام اپنی رعایت کے ساتھ زندہ رہنا ان کی بہترین یادگار ہے۔
 خدا کا ہے کہ آپ نے ادب طبع کو زندہ رکھنے کا عزم کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔
 احمد ظفر

میں چودھری صاحب مرحوم سے مرمت کیس بار ملا تھا۔ جس کی یاد آج پھر تازہ ہو گئی ہے۔ میری تمام تر ہمدردیاں
 آپ صاحب کے ساتھ ہیں۔ خدا آپ کو صبر عطا کرے اور مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین
 چودھری صاحب کے اور داد ادب پر بہت سے احسانات ہیں۔ مجھے یقین ہے ادب طبع کو آپ صاحبی شان
 بھاری رکھیں گے جس شان سے یہ چودھری صاحب کے ہاتھوں پہنچا تھا۔
 انور عنایت اللہ

مرحوم دہخود چودھری صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر میں کہ جو صدر آپ کو، ہمیں ان کے دوستوں اور
 لئے حالہ کہ ہوا ہے اسے بیان کرنا محبت ہے۔ کوئی ہوگا جو مرحوم سے ایک دفعہ مل کر ان کا گریہ نہ ہوا ہوگا۔
 ان کا اس عمر میں ہم لوگوں کو دعا ہے عافیت دینا ایک ایسا مصعب ہے جو کبھی کسی کو نہ بھولے گا۔ یہ یقین کرنا مشکل
 نظر آتا ہے کہ موت کے خوش الحان نے ایک ایسے دوست کو چھین لیا ہے جو محبت اور زندگی کا منظر تھا۔ اور جس کی نظریں
 دوستوں کے لئے بھی اتنی ہی ہمدرد تھیں جتنی کہ عزیزوں کے لئے۔
 چودھری صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں جو محبت اور عنایت ہم پر کی اس کی مثال میں نے کوئی نہیں دیکھی
 اور اس لئے میں ہمیشہ ان کے حق میں دعا گو رہوں گا کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ہر مانتگان
 کو صبر عطا کرے۔

انور

چودھری صاحب محترم کی خفت کا حال اخبارات میں پڑھا۔ بہت صدمہ ہوا۔ مجھے تو ان کی علالت تک کی خبر بھی
 نہ تھی۔ اس چٹاک خبر نے بہت پریشان کیا۔ اقبال صاحب اور دیگر اساتذہ جو چودھری صاحب کے آشنا تھے بہت افسوس
 لہذا کہہ رہے ہیں۔ چودھری صاحب یقیناً ایک بہترین انسان اور ہمدرد دوست تھے۔ ان کی موت ادبی دنیا میں ایک
 ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے۔ اور آپ لوگوں کو توفیق دے کہ چودھری صاحب مرحوم
 کے نقش قدم پر چلیں۔ گویا ہی نام پیدا کریں جیسا انہوں نے پیدا کیا تھا۔

محمد سلطان

جمہوری برکت علی مرحوم ان لوگوں میں سے ہیں کی جو جلد کی برکت کا تصور بھی نہیں آتا کہ آج بھی تریوں کا
 جتا ہے کہ موت کی نہیں ہے۔ ان کی آواز ان کی گھر اسی کے جملہ افعال و اطوار میں زندگی ان کے ہاتھ سے نکلیاں
 تھی کہ ان کے دیکھنے سے پیار کا اچھا ہر جملہ ترین قیاس معلوم ہوتا تھا۔ آزادی کی لگن زندگی کی غربت ہی کا ایک پتہ
 ہے اور اس میں کام نہیں کہ غربت، غم و غریب کی جو جہد میں جو ہری برکت علی مرحوم ایک یادگار مقام رکھتے ہیں۔
 فیض محمد فیض

آپ سے تقریر کرنا چاہتا ہوں، پھر سوچا ہوں کہ آپ کو جتنا بڑا غم پہنچا ہے، وہ الفاظ کے مرہم سے ٹھیک
 نہیں ہوگا۔ لیکن دنیا کی رسم یہی ہے۔ آپ کو یہ غم مرہم دار بھیجا جائے تو اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہیے
 جو مرحوم چھوڑ گئے ہیں۔
 میری دلی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔

رئیس احمد جعفری

میں جب چوہدری صاحب کی وفات اور ہسپتال کے حالات کا تصور کرتا ہوں تو کانپ اٹتا ہوں اور سمجھتی نہیں
 آتا کہ ایسے عالم میں صبر کی تلقین کروں تو کیسے اور اگر نہ کروں تو کیا کروں۔ آپ ہی اگر ممکن ہو تو میرے جذبات
 کا اس کے تمام صاحب زادگان کے آگے اظہار کر دیں۔

شریف کنجاہی

چوہدری صاحب کی وفات حسرت آیات کا بے حد افسوس ہے۔ ان شاء اللہ العزیز فرم کے اراکین چوہدری صاحب
 کو حیات و سلامت جانتے ہوئے آپ کی ہر خدمت اور معاونت کے لئے بدستور حاضر رہیں گے۔
 ملک محمد فاروق
 (ملک دین محمد اینڈ سنز)

ہینگ مین اردو لٹریچر سوسائٹی راولپنڈی کا تعزیتی اجلاس زیر صدارت جناب سید جمال علی شاہ خاتون بخاری
 منعقد ہوا جس میں چوہدری برکت علی مرحوم مدیر ادب لطیف کی وفات حسرت آیات پر اظہار افسوس کیا گیا۔
 اور مرحوم کی ادبی خدمات کو سراہا گیا۔ مرحوم کا ہم سے جدا ہو جانا واقعی ایک ناقابل فراموش صدمہ ہے۔
 سوسائٹی آپ کے ساتھ شریک غم ہے۔

پراگینڈہ سیکرٹری

ہینگ مین اردو لٹریچر سوسائٹی راولپنڈی

(جو ہری اخبار پر چھپوانے دیسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر مکتبہ امجد لاہور سے شائع کیا)

چند نئی کتابیں

افسانہ، ناول	تیسرا آدمی	شوکت صدیقی	تین روپے
جہیل اور کنوں	اے۔ حمید	چار روپے	
خزاں کا گیت	اے۔ حمید	پن روپے آٹھ آنے	
جنگل	میرزا ادیب	تین روپے آٹھ آنے	
بامی	ظہور احسن ڈار	دو روپے	
منزل کی طرف	اور	تین روپے آٹھ آنے	
نئی ہود	تور کیف	تین روپے آٹھ آنے	
ڈریوک	ابو سعید قریشی	نہ روپے آٹھ آنے	
تہمت	ابو سعید قریشی	تین روپے	



تثقید ڈاکٹر سید عبداللہ، ریڈر شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی
کے مقالات

بحث و نظر

(پانچ روپے)

ڈاکٹر عبادت پریلو، پروفیسر اورنٹل کالج
کے مقالات

تنقیدی راوی

(چار روپے)

مکتبہ اردو - لاہور



ج. س.
5/10/53 36-6



لطیف داش

اکتوبر

۱۹۵۴

نیا ادب

تنقید

بحث و نظر ڈاکٹر سید عبداللہ
تنقیدی زاویے ڈاکٹر عبادت بریلوی
ہاچ روپے چار روپے

ناول

جھیل اور کنول اے حمید
ڈرے اے - حمید
نئی ہود مترجمہ: انتظار حسین
ہامبی مترجمہ: ظہور الحسن ڈار
ڈرہوک ابو سعید قریشی
تہمت ابو سعید قریشی
اے - حمید کی تازہ ترین تصنیف
جہاں برف گرتی ہے
(ناولٹ) دو روپے چار آنے

طنز و مزاح

داستان غریب حمزہ
اے - حمید کے فکاہی مضامین
قیمت دو روپے آٹھ آنے

مکتبہ اردو، لاہور

بافچودھری برصت علی مرحوم

ادب لطیف

شماره ۶

جلد ۳۶

منیجنگ ایڈیٹر — افتخار علی چودھری

ایڈیٹر — میرزا ادیب

پاکستان میں

نریسالاہ ، آٹھ روپے

غیر ممالک

نریسالاہ ، بارہ روپے

فی پوچھ ۱۲، آنے

منگ بھاندر لاکھو

ترتیب

ایڈیٹر۔ پیر ایف آئی ۳
جلیل گریز۔ افکار و مسائل ۴

سعید احمد رفیق
اوبسنس کنکٹے اور کیوں ۹
مفسر اچ رہبر
پریم چند کا آخری ناول ۱۶

○
فقید شفا
منزل منزل ۲۱
ش۔ مٹی
غزالہ کے نام ۲۲
حسن اعرافی
نقش ہزار ۲۳
منیونیازی
گیت ۲۴

○
پروفیسر علی حماد عباسی
اقبال جبین ایم، اے ۲۵
فہمیدہ اختر
پتھر لے دیں میں ۳۶

○
صفت۔ ایسا الیٹ رویتسٹین
ترجمہ۔ شفقت تنویر میرزا
پچھاپے کا لڑکپن ۴۶

○
غزل
مادی مچھلی شہری ۶۰
باقی صدیقی ۶۹
ظہور نظر ۷۰
شیخ الہ آبادی ۷۱
کمال احمد صدیقی ۷۲
موج علیگ ۷۳
ضیا اللہ منیا ۷۴

○
نثار عزیز
اشارے ۷۵

○
عظیم مرتضیٰ
منظر و پس منظر ۷۷

○
میدان الالب
جائزے ۷۹

○

پیرائے سنا

گنج ہائے گرانمایہ

آج کے پڑھنے والے رسائل و جرائد کا مطالعہ کرتے وقت بعض اوقات ایسی چیزیں بھی منگڑوں سے گزر جاتی ہیں جو ادبی لحاظ سے بڑی دقیق ہوتی ہیں۔ مگر صریح کر دیتا ہوں کہ گناسم اہل علم کی یہ ذہنی تخلیقات پڑانے والے رسالوں کی انہی جڑسیدہ اوراق میں دفن ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور اردو پڑھنے والوں کی اکثریت ان کے مطالعے سے بدستور محروم رہے گی! ہماری طرح وہ سب کو بھی کمیٹی کمیٹی پر خیل فرود آیا ہو گا۔ اور انہیں بھی گنج ہائے گرانمایہ کے اس اقلات کا مزید افسوس ہوا ہو گا۔ پڑانے والوں کو کون پڑھتا ہے۔ اول تو ان کے نال ہی موجود نہیں ہوتے اور جن کپاس ہوتے ہیں وہ بھی ان کی مدق گردانی صرف اس وقت کرتے ہیں جب کوئی خاص ضرورت پیش آئے ورنہ انہیں بالکل بھی نہیں ملتا جاتا اس صورت میں وہ دقیق مضامین کی طرح محفوظ رہ سکتے ہیں اور کس طرح ان سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟

مجموعہ زیادہ دیر تک نہیں جاتے صرف انہی ادبی رسائل کا ذکر کرتے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد شائع ہوئے ان میں سے نیزنگ خیال، عالمگیر ہمایوں اور ساتی ابھی تک زندہ ہیں۔ ان چاروں پرچوں کی ادبی خدمات ہمارے ادب کا نہایت اہم اثنا بنا کر باقی ہیں۔ ان میں ساتی ایک ایسا پرچہ ہے جس کے شائع شدہ افسانوں کا انتخاب ’ریزہ دنیا‘ کے نام سے چھپ چکا ہے باقی پرچے اس قسم کی کوشش نہیں کر سکے ان میں سے کوئی پرچہ بھی پچیس سال سے کم عمر کا نہیں۔ غصہ کیجئے اس ربح صدی میں کتنی اعلیٰ درجے کی چیزیں ان میں گھپی ہوئی تھیں۔ ادب اب کتنے لوگ آسانی سے ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں یہ صورت حال تو ان پرچوں کے ہر جن کی زندگی کا تسلسل ابھی قائم ہے۔ ہر سکتا ہے ان کے پڑھنے والوں کے پاس ان کے خلیل محفوظ ہوں اور وہ محنت کے اوقات میں پچھلے پرچوں کا مطالعہ بھی کر لیتے ہوں، لیکن اتنا کیفیت تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم ان پرچوں کے بعض شماروں کو دیکھتے ہیں جنہیں بند ہونے سے قبل گزرتے ہوئے ہیں اور جن کا نام بھی ہماری موجودہ نسل کے بعض افراد نے نہیں سنا ہو گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پرچوں میں ایسے لوگ بھی لکھتے رہے ہیں جن کا شمار آج مشاہیر ادب میں ہوتا ہے اور ان کی بیشتر تخلیقات کتابوں میں محفوظ ہو چکی ہیں مگر یہاں صرف ان گناسم اور غیر معروف ادیبوں کا ہے جو غصہ سے غصہ کے لئے ایران ادب میں آئے اور اپنے تخلیقی ذہن کے شعور متوجہ نئے فضاؤں کو مزہ کر کے ہمیشہ کے لئے قاتل ہو گئے۔ مسئلہ صرف ان لوگوں کے انکار محفوظ کرنے کا آگاہ ہم سمجھتے ہیں ادب کے دوسرے اہم مسائل کے ساتھ ساتھ آج اس مسئلے پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل ہمیں نکالنا چاہیے۔

اس وقت کہ ہم یہ سطرین سپردِ قلم کر رہے ہیں ہماری آنکھوں کے سامنے کئی نام ابھرتے ہیں۔ مثلاً ایک نام حنیف لاشمی ہے۔

پھر لیاقت حیات نہیں گزری یہ نہ جہان افسانہ نگاری کا ایک خاص اسلوب اور بڑا شاعرانہ انداز بیان ہے کہ محفل ادب میں آیا تھا۔ اسی نے گفتی کے چند افسانے لکھے مگر یہ افسانے آج بھی پڑھنے والوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ افسانوں کی بات چل نکلی ہے تو ایک اور نام بھی ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے شیخ ضیاء الدین شمس۔ شمس صاحب نے تمام کے تمام طویل افسانے لکھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا ہر افسانہ معرکہ کا

اسٹریگوڈی بڑے معرکت غز گرتے گرانہوں نے چند تنقیدی مضامین بھی لکھے تھے اور یہ کافی اور پختہ وجہ کے تھے۔
چند سال ہونے بمباروں کے صفحات پر محرمین ادب کے تخلیقی اور تنقیدی مقالات شائع ہوتے ہیں یہ مضامین بھی ادبی اہتمام سے
قدر و قیمت کے مستحق ہیں۔

یہ نام تو وہ ہیں جو یونہی یاد آگئے۔ ذہن پر زور دیا جائے تو اور نام بھی یاد آسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی اہل علم ہوں گے جنہوں
نے ادب میں قابل قدر اضافہ کیا اور پھر یا تو دنیا سے رخصت ہو گئے اور یا پھر زندگی کے معاشی تقاضوں نے انہیں اس طرح مجبور کر دیا کہ وہ
ادب کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے! اب یہ کام ہمارا ہے کہ ان کی چیزیں پرکھیں اور انہیں محفوظ کرنے کی تجویزیں سوچیں!
اس راہ میں کتنی وقفیں ہیں۔ یہ بات ہم سے پوشیدہ نہیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اگر اس سلسلے میں ایک باقاعدہ ضابطہ عمل بنا کر پیش کر لیا جائے
تو ناکوش کو تاحی فرد مرتب ہو سکتے ہیں۔ ضرورت ضابطہ عمل کے تعین اعدادی وسائل کی فراہمی کی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی معمری ادارہ
اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے بھی نہیں سکتا اس کے لئے ادبی ضرورت ایک ایسے بورڈ کی ہے جو چھپے رسائل کا تنقیدی نظریے مطالعہ کرے اور
پھر چیزیں چنتے۔

یہ مسئلہ غالباً پہل مرتبہ چھڑا گیا ہے اور اس پر بحث و تمحیص کی بڑی گنجائش ہے۔ مسئلے کے کئی ایسے پہلو ہیں جو صاف نہیں ہیں!

انجمن ترقی اردو کی گولڈن جوبلی

اکتوبر کے وسط میں انجمن ترقی اردو کی گولڈن جوبلی (پچاس سالہ جشن) منائی جا رہی ہے۔ یہ واقعہ ایک تاریخی حیثیت کے لئے ضرور ہے
اور اہل وطن کا فرض ہے کہ وہ اس تقریب کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ انجمن صرف ایک اشاعتی ادارہ ہی نہیں بلکہ
ایک نہایت قیمتی ثقافتی سرمایہ بھی ہے اور اس ادارے نے اپنی پچاس سال کی قوت میں ہماری زبان کی جو خدمات انجام دی ہیں۔ انہیں
کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا!

انجمن کو سب سے پہلے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دہلی میں اس کے وسیع کتب خانے کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا۔ کراچی میں عرصہ تک
کوئی ڈھنگ کی جگہ نہ مل سکی اور ٹھیک طور پر کام نہ ہو سکا۔ یہ مشکلات ایسی نہیں جن پر قابو نہ پایا جاسکے مگر بنیادی وقت سرائے کی کمی ہے
ہمیں توجہ رکھنی چاہیے اور اس کے ہمدرد انجمن کی طرف دست تعاون بڑھائیں گے اور ان کوششوں میں ضرور حصہ لیں گے جو گولڈن جوبلی
کی کامیابی پر منتج ہو سکتی ہیں۔

شکر

والد محترم کے انتقال پر ادیب لطیف کے جن علمی معاونین اور تارین نے تعزیتی خطوط لکھے ان
کا فروغ و شکر یہ ادا کرنا مشکل ہے اس لئے میں ادیب لطیف کے ذریعہ ان تمام محبان گرامی قلوب کی
بے پایاں ہمدردیوں کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں!

میرزا ادیب

افکار و مسائل ترقی پسند ادب

ترقی پسند تحریک امداد ادب کی سب سے بڑی تحریک نہ ہوتی بلکہ اہم تحریک مزدور ہے۔ خود کشی کے بعد جب پرانی سماجی اقدار کی شکست رینت ہوئی اور نئی اقدار نے پاؤں جلانے کی کوشش کی تو ادب میں زندگی کے دو نئے شعبوں کی طرح کان و پیرنگ ایک تذبذب اور جھجک کی کیفیت رہی۔ سیاسی سمجھوتہ بازی کے ساتھ ساتھ ادب میں امداد پسندی کے رجحانات پھٹے رہے۔ سرسید، حالی، امداد مصلح تھے۔ ان کا سیاسی شعور بھی اس سطح پر نہیں پہنچا تھا اور نہ پہنچ سکتا تھا جہاں سمجھوتے کی گنجائش نہیں رہتی اور کلکشن ناگزیر ہو جاتی ہے۔ جہاں ادیب غیر جانبداری کا مفصل لبادہ اٹھ کر خدمت نشین نہیں رہ سکتا۔ جہاں قرآن کو یہ کہنا پڑتا ہے۔

تھوڑی بہت محبت سے کام نہیں جلتا ایسے دوست
یہ معاملہ جس میں باسب کچھ یا کچھ بھی نہیں

اشتراکی مشورہ کے یہ الفاظ "دنیا کے محنت کشوں کو مستحق جو جاؤ" ادب عالم میں نئی انقلابی تحریکوں کا جنم غیمہ ثابت ہوئے۔ روس میں ہلومی انقلاب کے بعد اس غم سے کو ایک واضح سیاسی شکل امداد ادب کی انقلابی تحریکوں کو ایک نیا آدرش ملا۔ ان ادبی تحریکوں کی نوعیت بین الاقوامی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے اپنے ملک کے مزاج کے مطابق پروان چڑھ رہی تھیں۔ انہی میں الا قوامی تحریکوں سے متاثر ہو کر ہندوستان کے چند ذہن افراد نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی اور ادب کا یہ مصلح نظر قرار دیا۔ کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کرے امداد ادب میں سیاسی فعالیت پسندی کو فروغ دے۔ ابتدا میں اس انجمن کو جہاں ٹیگور، پریم چند، سوبھاش اودھیا، کرشنن کی سرپرستی نصیب ہوئی وہاں اس کے پہلے مشورہ پر پولی علی محمد، ڈاکٹر صاحبین اور مولانا نواز فتحپوری کے بھی دستخط تھے۔ اور اس کے ذریعہ قافلے میں نو مشن ادیبوں کی محبت افزائی کے لئے مجوزوں کو رکھپوری اسکا مئی عبدالغفار جیسے چتر کار اور باب بھی شامل تھے۔ ۱۹۳۵ء سے لے کر اب تک ترقی پسند تحریک کا کارواں کئی منزلوں سے گزرا ہے۔ اگرچہ اب اس تحریک میں وہ دست نہیں رہی۔ اور اس قافلے سے بہت سے ایسے فنکار رنگ ہو گئے جن کی حیثیت انجمن کے لئے سرمایہ افتخار سے کم نہیں تھی۔ پھر بھی اس کی اہمیت ہے انکار ممکن نہیں۔ اس مرحلے پر یہ ضروری تھا کہ کوئی ایسا ادیب جو شروع ہی سے اس تحریک سے وابستہ رہا ہو اس منزل بہ منزل ہائیڈرو نے کھوٹے کھوٹے میں تیز کرنی سکھائے۔ اور اس تحریک کو پہلی سی کشادگی اور وسعت نظر عطا کرے۔ علی سردار جعفری نے کامیابی سے کام لیا۔ ترقی پسند ادب میں اپنے ذہن سے یہ ماس کام میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔ یہ مختصر تبصرہ اس کا جواب ہے۔

کچھ لحاظ سے سردار جعفری اس کام کے لئے بڑے مردہ آدمی ہیں۔ وہ نہ صرف ترقی پسند برآمدی کے بڑے ذہین اور پڑھے لکھے فرد ہیں۔ بلکہ انہیں اس جدوجہد میں عملی شرکت کے مواقع بھی ملے ہیں۔ جو آج ایک تاریخی حقیقت ہے۔ بیشتر ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کو طبقاتی

کوشش میں حصہ لینے اور کوئی خدمت برانجام دینے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ تو انہوں نے ذاتی معطلوں کی وجہ سے اس مسئلہ میں اٹھنا نہیں
 کا نتیجہ نکلا کہ وہ کھل کر بات کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ طبعاً جب یہ دماغ پر اس کے اطلاق کا واضح تجربہ نہ کر سکے۔ اور ایک ایسے جذبہ باقی تھا کہ وہ کوشش کر
 جس سے نجات ان کے بس کی بات نہ رہی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا کہ اس کے ساتھ سرکاری محنت کے نزاع کو گذشتہ خلوت سے دیکھنے کے بغیر ایک مسلم
 انسانیت پرستی کے زہر اثران تھا کہ قبول کر لیا۔ اور اپنے فن پاروں میں اس کا ذکر کرنے لگے۔ مگر اس کوشش کی صحیح نوعیت سے آگاہ نہ ہو سکے اور د
 انہوں نے اس کا سائنٹیفک طریقے سے مطالعہ کیا۔ ترقی پسند ادب میں محنت کش طبقہ بھی ویسا ہی دہائی کر رہا بن گیا۔ جیسا کہ اعلیٰ کا کوئی خیالی مہر اور ادب
 میں اس مظلوم طبقے کا ذکر اسی لحاظ میں ہونے لگا جس میں ہمارے کلاسیکی شاعر محبوب کے زلف و رخسار کا ذکر کرتے ہیں۔ سرور و جبریں لہروں کے اس گروہ
 میں شامل نہیں جنہیں آقاوندہ کے نزاع کی لگ میں تپنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ مگر اسی شدت احساس نے انہیں تنقید میں سائنٹیفک نقطہ نظر سے محروم کر دیا۔ کتاب
 کے بعض حصے تو کارپوریشن کی لبرری کے کسی ایسے امیدوار کی الیکشن تقریر معلوم ہوتے ہیں جو دلائل کی کمی میں مخالف کو مطلقاً کر کے پورا کرتا ہے۔ جتنا وہ عسکری کا ذکر
 کرتے ہوئے ان کی زبان تنقید کی زبان نہیں رہتی۔ انہوں نے یہ وجہ معلوم کر سنی کہ کوشش نہیں کی کہ ترقی پسند تحریک جو کامادیں مختلف خیال کے کھنڈوں
 کی تحریک تھی۔ اب ایک محدود طبقے کی میراث ہو کر کیوں رہ گئی ہے۔ حالانکہ پہلے بھی خیالات کے اس تنوع میں مرکزی نقطہ ایک ہی تھا۔ وہ ایک سائنس
 میں کوشش پسند اور معنی کے ساتھ ساتھ نیا زحیر و ہمدی عبد اللہ ملک یعنی ادب و جرح کے نام سے کہ اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ
 انہوں نے اس تحریک سے کٹ جانے والے لوگوں کا بدل ڈھونڈ لیا۔ اور تحریک چل چھل رہی ہے۔ یہی غلط فہمی ان کی تنقید کا لہجہ ہے۔ وہ ایک غلط نقطہ
 سے چلتے ہیں۔ اور اسی لئے بار بار اپنے دلائل میں الجھ جاتے ہیں۔ انہیں جگہ جگہ اپنی تردید خود آپ کوئی پڑتی ہے۔ اور جب وہ اس چکر سے گھبرا جاتے
 ہیں۔ تو دلائل کی کمی کو زور و خطابت سے پورا کر سکی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ٹھیک ہے۔ کہ جب حق و باطل کی جنگ ہو رہی ہو تو ادیب کے لئے
 اس معرکے کا عاثر تاثر ناشانی بنا اور غیر جانبداری کا دعویٰ کرنا بجز غلطی ہے۔ مگر سبب ہم ایسے ادیبوں کے کام پر تنقید کیلئے ظلم اٹھاتے ہیں تو غیر جانبداری
 جرم نہیں بلکہ احسن چیز بن جاتی ہے۔ اس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس ادیب نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ کیسے کہا ہے۔ کیا کہا ہے۔ بڑا اہم مزہ ہے۔ مگر
 کیسے کہا ہے۔ یہی کم اہم نہیں اور ہم ایک ادیب کو محض اس وجہ سے ترقی پسند ادیب نہیں مان لیتے کہ اس نے چند پٹے پٹائے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔
 اس کے علاوہ یہ چیز بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ طبعاً جب وہ جدوجہد کے علاوہ ادبیت سے حقیقتیں بھی بڑی اہم ہیں۔ ان سب سے دست بردار ہو کر
 صرف ایک موضوع کو اپنا لیا زندگی کی کشادگی کو محسوس کر دینا ہے۔ اگر ہم ذہن میں کچھ مخصوص معیار بنا کر تنقید کرنے چلیں تو عملی تنقید میں بڑی الجھن پیدا ہو جاتی ہے
 شعراء ادب کے نوزوں کو جانچنے کے لئے نظریے شعراء ادب کے جانچنے اور پرکھنے کے مدلل ہی میں پیدا ہونے میں کہیں سے ڈھل کر نہیں آتے ترقی
 پسند تحریک کے سرکاری "مقارنوں کی تحریروں میں اسی باعث بڑی پیچیدگی اور ایسا ہوتا ہے۔ اور عملی تنقید ان کی نظریاتی تنقید کے قابو میں نہیں آتی
 ترقی پسند ادب میں بھی عملی تنقید اور نظریاتی تنقید کے درمیانے ایک دوسرے کے پہلو پہلو چلتے ہیں۔ اور قادی ان کے سنگم کی تلاش ہی کرتا رہتا ہے
 وادار چیزیں جنہیں جبریں صاحب نے تنقید کرتے وقت نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ ہیں (۱) اس شاعری کے ادیب کا مزاج جس کے ادیب پر وہ تنقید کرتے ہیں (۲)
 ادب میں ادیب کا عمل ہر ثقافتی گروپ کے سیاسی مزاج کی طرح اس کا ایک ادبی مزاج بھی ہوتا ہے۔ اور وہ ادب کا بھی ایک مخصوص مزاج ہے۔ موضوعات
 اور اصناف کے انتخاب میں اس کا بڑا اہم حصہ ہوتا ہے۔ یہ ایک حلقہ حقیقت ہے۔ کہ ادب کی تخلیق میں سب سے ضروری حصہ ادیب کا عمل ہے۔ اس عمل کی بنیاد
 مادی مقابلی اور مثالی حقائق پر ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں۔ مگر ان حقائق کا یہ عمل مختلف انسانوں میں مختلف ہوتا ہے۔ ادیب بھی انسانی برآمدی کے
 افراد ہونے کی حیثیت سے لازم نہیں کہ یکساں حالات سے ایک سا اثر قبول کریں۔ اور پھر اس اثر کو قبول کرنے کا عمل ایسے اپنی شخصیت کا جزو

بائے کا عمل اور اسے اظہار کا واسطے پانے کا عمل۔ ان میں فرق کی بڑی گنجائش ہے۔ توجہ کے بڑے امکانات ہیں۔ اسی سے ادب میں وسعت اور کشش پیدا ہوتی ہے۔ ادیب مشین نہیں اور نہ ادیب مشین پیداوار۔ ادب کے تخلیقی عمل کی نوعیت جداگذا اور بڑی پیچیدہ ہے۔ اس سلسلے میں پہل کاری سے کام لیتا ہے۔ اپنے ناموروں کو ادیب کی بنیاد بنالینا بڑی ہلک نعلی ہے۔ ادیب کے لئے آزاد خی اظہار اتنی ہی ضروری ہے جتنی زندگی کے لئے رات و دن پڑا ادب ضروری ہے۔ میں میں صالح و باقوت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ نئی زندگی کے قدم قدم چلنے کا دلولہ جو۔ اور نئے حالات کے پیدا کردہ مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا موصوفی کار کوفی کے لئے تقاضوں کے پیش نظر نئے سانچے چلانے اور پرانے سانچوں کو اپنی ضروریات کے مطابق بد نئے کی صلاحیت میں ہرگز جا چکے۔ براد اسلوب اور ہیئت کی بھی نئی ترکیب ترقی پسند ادب کی بنیاد ہے۔ ادب میں نقاد کے لئے بھی حد ہے۔ مدد کسی فیکٹری کے نجرانہ نقاد میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے ؟

جعفری صاحب کی کتاب کا موضوع نظریاتی مباحث اور ترقی پسند تحریک کے محرکات اور جملات ہیں۔ اس میں اس تحریک کا تاریخی اور نظریاتی جائزہ دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے سلسلے کی تین اور کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ جن میں مشہور ترقی پسند ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا جائزہ دیا جائے گا اور ساتھ ہی ان کے ادب کا انتخاب بھی ہوگا۔ جعفری صاحب نے خود اس کتاب کے متعلق لکھا ہے۔

.... میں اپنے تجزیے کو حتی الامکان سائنٹیفک اور علمی رکھنا چاہتا ہوں۔ حقیقتاً میں نے نقاد کے فرائض انجام

نہیں دیئے۔ کہہ کر مجھے نقاد ہونے کا غرور بھی نہیں۔ میں نے خود ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اس تحریک کے بارے میں جو

کچھ محسوس کیا ہے۔ جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اور جس پر شروع سے بہت قریبی تعلق رہا ہے۔ اسے کاغذ پر منتقل کرنا ہے۔

ایک ہی مسئلے پر وہ اپنے تجزیے کو حتی الامکان سائنٹیفک اور علمی رکھنے کا غرور بھی کرتے ہیں۔ اور پھر یہ کہہ کر کہ مجھے نقاد ہونے کا غرور بھی نہیں۔ اسے ہر ذاتی سطح پر لے لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک باب نقطہ نگاہ کے موائے کا بیشتر حصہ تاریخی تنقید کے سوا کچھ نہیں۔ اور سائنٹیفک تنقید اور تاریخی تنقید میں جو فرق ہوتا ہے۔ اس کا جعفری صاحب کو اچھی طرح علم ہوگا۔

حوت اول میں جعفری صاحب نے ترقی پسند ادب کے بنیادی مقاصد انسانیت اور آزادی کی جدوجہد قرار دیئے ہیں۔ ادب کی اس قریب کے بعد اس تحریک میں الگ الگ ادبی نگاہ رکھنے والے ادیبوں کا سنگم منظر نہیں رہتا۔ جعفری صاحب نے بھی لکھا ہے۔ بلکہ مختلف نقطہ ہائے نگاہ اور نظریات کا توجہ ترقی پسند انجمن اور تحریک کی جان ہے۔ انجمن کے متعلق یہ بات آغا دین تو میسج تھی مگر اب جو سنگ نظری تحریک میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے پیش نظر مختلف خیال کے لوگوں کا ترقی پسند تحریک کے یکجہ تعلق انسانیت اور آزادی کی جدوجہد کے نقطے پر جمع ہونا مشکل ہو گیا ہے۔ انجمن اب زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص سیاسی نظام کے نشر و اشاعت کا آلہ کار بن کر رہ گئی ہے۔ اس نظام کے حسن و قبح سے قطع نظر ادب کو چند متعین سیاسی و سماجی یا ادبی اصولوں کا پابند کر دیا کسی طرح بھی سمجھ نہیں۔ اگر ہم سائنٹیفک نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ حقیقت کھلتی ہے۔ کہ موشمردم اور اس کے زیر اثر اصلاحی قوانین نے محنت کش طبقے کی حالت کو اس حد تک نہیں گھسنے دیا۔ جس کا تصور ہر کس نے سرمایہ دارانہ صنعتی نظام کے آغاز میں کیا تھا۔ اس طبقے کی نفسیات میرا بھی وہ تناؤ نہیں پیدا ہوا جس کا اشتراکی تحریکوں میں ذکر ہے۔ تاریخی ارتقائے میں فاشزم ہر حد مارکس کی توقعات سے مطابق نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ جنگ سے میں پہلے فاشزم سے متعلق ہالک پر چھاپی تھی اس کے باوجود اسی بنیادی حقیقت سے اختلاف ممکن نہیں کہ مختلف جماعتوں کا اس عمل ان کے سماجی مذاکرات سے اس قدر مجاہد جو ذرائع پیداوار پر قابض ہوتی ہے۔ جن سے کسی صحت دست برد ہونے پر تیار نہ ہوگی۔ اس کے برعکس جس جماعت کے قبضہ اختیار میں کچھ نہیں وہ ان ذرائع پر قابض ہونے کی سعی کرے گی۔ اس کشمکش میں نامدار جماعت زیادہ سے زیادہ مغلس ہوتی جائے گی اور ذرائع پیداوار پر قابض جماعت

ادب کس کیلئے اور کیوں

ہم کس کے لئے لکھتے ہیں۔ اور کیوں لکھتے ہیں؟ فن تنقید میں یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن کا جواب شعری یا غیر شعری طور پر ہندوانے میں کچھ دیکھ کر حیران و حیران رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں زندگی کی گونا گوں پیچیدگیوں اور زندگی کے بعض شعبوں کی براہ راست ہونی اہمیت کے پیش نظر یہ سوالات اور بھی زیادہ اہم ہو گئے ہیں جن کا مفصل اور واضح جواب دینے بغیر تنقید میں ایک قدم بھی آگے بڑھنا تقریباً ناممکن ہے۔ غلامانہ اور جاگیردارانہ دور میں اگرچہ یہ سوالات کافی اہم تھے۔ لیکن اس زمانے کی زندگی کچھ ایسی سیاٹ تھی کہ ان کے جوابات دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ موجودہ زمانے میں جب ایک پیچیدہ و دور دورہ سکر پیچیدہ تردد کے لئے آہستہ آہستہ جگہ خالی کر رہا ہے۔ اس قسم کے سوالات کا ایسا جواب دینا جو عام طور پر قابل قبول ہو۔ اگر ناممکن نہیں تو کافی مشکل ضرور ہے۔ اور پھر ایک ایسی سر زمین میں جہاں صرف دو روزہ ہی آپس میں برس بیکار نہ ہوں۔ بلکہ ایک تیسرے دور کے دل میں بھی زندگی کی دھن موجود ہو۔ اور وہ زندہ رہتے۔ بلکہ بہتر الفاظ میں دوبارہ زندگی حاصل کرنے کا مستحق ہو۔ زندگی کے ایک ایسے شعبے پر نظر ڈالنا جس میں تمام زندگی کا صرف عکس نظر آئے۔ بلکہ جو اسے پوری طرح پکے کر اسے آگے بڑھانے میں بھی کوشاں ہو۔ اور بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ بہر حال ان سوالات کی اہمیت کے پیش نظر یہ سوالات بار بار اٹھائے گئے ہیں متعدد بار ان کا جواب دیا گیا ہے۔ اور ابھی ان کے متعلق بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔

ہم کس کے لئے لکھتے ہیں؟ اپنے لئے۔ کس قدر سیدھا سادہ اور آسان جواب ہے۔ لیکن حقیقت سے کس قدر دور۔ اور واقعات کے کس قدر خلاف۔ اگر آپ اپنے لئے لکھتے ہیں۔ تو پھر یہ دوسروں کو سناتے، شائع کرنے، نشر کرنے، زیر بحث لانے کا کیا مطلب؟ آپ اپنے متعلق تو کچھ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اپنے لئے نہیں۔ یا کم از کم صرف اپنے لئے نہیں۔ دوسرے ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہتے ہیں۔ ڈاکری اور اعتراضات تک۔ لکھتے ہوئے غیر شعری طور پر دوسرے ہمارے سامنے موجود رہتے ہیں۔ اور اس طرح ہم اپنے متعلق لکھتے ہوئے بھی دوسروں کے لئے ہی لکھتے ہیں۔ لیکن یہ وہ سرے کون ہیں جن کے لئے ہم لکھتے ہیں کبھی ہم نے شہنشاہوں، بادشاہوں، ان کے سرداروں، سپہ سالاروں، آقاؤں، سرداروں۔ بادلوں کے لئے قصیدے لکھے اور کبھی کہا نیاں۔ کبھی ان کی فتوحات کے لئے دعائیں مانگیں۔ اور کبھی ان کی صحت اور زندگی کے لئے ان کے مقام کو برحق ثابت کرنے کے لئے نئے نظریات، ترائے شے، علم کو سلانے کے لئے نئی قسم کی مختلف افیون کی گولیاں تیار کیں۔ مذہب کے نام پر انہیں کٹوا دیا، تہذیب و تمدن کے جھوٹے دیوتاؤں پر ان کی بھینٹ چڑھائی، قومیت اور وطنیت پر انہیں قربان کر لیا۔ جاگیردار کی کو فروغ دیا۔ برصغیر کی کو پران چڑھایا، غرض بعض اوقات ہمارے قلم نے وہ سب کچھ کیا جو زمانے نے اس سے کرایا قلم ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اور ہم کافی حد تک زمانے کے قبضے میں لیکن اس کے برخلاف اکثر ایسا بھی ہوا کہ زمانے کو اپنے قبضے میں لانے۔ عمل تضاد کو برٹھانے۔ زمانے کے صالح اجزاء کو آگے بڑھانے اور نئے دور کو آگے لانے کے لئے ہمارے قلم نے زمانے کے وجود کے خلاف آواز اٹھائی۔ جب کبھی یہ آواز اٹھی تو اسے دبانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ کوشش ہمیشہ رائیگاں ثابت ہوئی۔ دماغ اپنے حقیقی اصول کے ماتحت ہمارے قلم کی حد کو تادم۔ اور ہمارا قلم شعری طور پر زمانے کو بھلائی عمل کی راہ پر آگے بڑھا تا رہا۔ شعری طور پر اس وجہ سے کہ قلم کا یہ عمل غیر شعری جو ہی نہیں سکتا۔ موجودہ زمانے میں حقیقی اصول کے تحت

محل اور شعور دونوں کا تیز رفتار سفر ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں جس کے وجہ سے اصل اور شعور دونوں میں پوشیدہ ہیں۔ لیکن اس کی اصل اور شعور دونوں میں شعور میں عمل اور روح کا اصول ہے۔ ایک دوسرے کو مدد دیتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور ان کے اس آگے بڑھنے کی کامیابی ہے۔ اگر شعور زمانہ کے اس تبدیلیاتی عمل میں اپنا فرض پورا کرے۔ تو یہ تبدیلیاتی عمل بالکل بے وقت ہو کر رہ جائے۔ اور دنیا کی ترقی کی رفتار اس قدر تیز ہو جائے کہ اسے ترقی کہنا بھی صحیح نہ ہو۔ شعور کے جانچنے اور اس کی ترقی کا اندازہ لگانے کے اگرچہ اند بھی پیدا نہیں ہیں۔ لیکن ایک عام اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ صحیح پیمانہ قلم ہے۔ یہ پیمانہ صرف پیمائش دھارم کی ہی کے فرائض انجام نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ شعور میں بھی پیدا کرتا ہے۔ اسے کچھ بڑھاتا ہے۔ اسے صحیح راستے پر لگاتا بھی ہے۔ اور غالباً ہی وجہ ہے کہ وہ بے انقطاع طبقے نے قلم پر ہمیشہ ظلم و ستم قیڈ سے نہ کہ وہ بڑھتے ہوئے شعور کو کسی نہ کسی طرح آگے بڑھنے سے روک سکے اس کے برخلاف قلم اکثر اوقات تبدیلیاتی عمل کو آگے بڑھانے کی جدوجہد میں کوشاں رہا۔ تاکہ اس طرح عالمی رویہ انقطاع طبقے کا خاتمہ کر کے نئے طبقے کو ابھرنے کا موقع دے۔

اس پس منظر کے پیش نظر اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قلم کو کس کی خدمت کے لئے وقف ہونا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں کس کے لئے لکھنا چاہئے۔ یہ سوال جیسا کہ شروع میں عرض کر دیا گیا ہے ہمیشہ سے قابل توجہ رہا ہے۔ لیکن سرمایہ داری کے اس آخری دور میں جب کہ بعض ممالک میں وہ ختم ہو چکی ہے۔ جن میں آخری سانس سے رہی ہے۔ اور بعض میں اپنی غیر طبعی عمر کو بڑھانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ یہ سوال اور زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ سرمایہ داری کے اس دور میں دونوں طبقوں یعنی محنت کش طبقے اور محنت سے فائدہ اٹھانے والے طبقے کا تضاد اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ وہ دونوں ایک کشتی میں سوار ہونا ناممکن ہے۔ اور نہ ہی غیر جانبداری کا دھندلہ رہا جاسکتا ہے۔ متوسط طبقہ اب بھی موجود ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ ختم ہونا چاہا ہے۔ متوسط طبقے کا وجود اصل میں ناممکن حالات کا ایک مجموعہ ہے۔ حالات کے توازن ہونے پر یہ طبقہ قدرتی طور پر ختم ہو جائے گا۔ سرمایہ داری جیسے بیسیاں منطقی تخیل کی طرف بڑھتی رہے گی۔ یہ طبقہ ختم ہوتا جائے گا۔ اور جب یہ وہ سرمایہ داری اپنے نقطہ عروج پر پہنچے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ تو نہ صرف متوسط طبقہ فنا ہو جائے گا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ طبقہ بھی ختم ہو جائے گا۔ جو اس دور سرمایہ داری کا مکمل لالچہ محافظ ہے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ ہمارا قلم یا تو اعلیٰ طبقے کے مفاد کو آگے بڑھانے کے لئے اپنے آپ کو وقف کرے گا۔ یا اس کے برخلاف غریب اور محنت کش طبقے کو بچانے۔ احساس دلانے۔ نئے دور کے خیر مقدم کے لئے تیار کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کرے گا۔ ان دونوں سمتوں کے درمیان کوئی اور راستہ تلاش کرنا۔ یا ان دونوں سمتوں کے علاوہ کوئی اور تیسرا راستہ بنانا سب سے ناممکن ہے۔ اگر ہم ایک بار پر گامزن نہ ہوں گے۔ تو یقیناً دوسری طرف ہوں گے۔ ادب کی ادبی ادبی دائمی دائمی قافلہ کے حامی۔ ادب جو آئے ادب کے پرستار جن وقت کے متولے زندگی کی ناپائیداری کا ادب اپنے دلے۔ من میں ڈوب کر سراخ زندگی پانے کی کوشش کرنے والے۔ لاشعور کی گتھیں کو سلجھانے والے۔ حیات مابعد الحیات کے منہری خواب دکھانے والے نون۔ رنگ کی بنا پر عالم انسانیت کو تقسیم کرنے والے۔ کشمکش حیات سے دور رہنے کی تلقین کرنے والے۔ انفرادیت کے گیت گانے والے اپنی غیر جانبداری کا کس قدر بھی ڈھنڈو نہیں۔ ہر حال ان کی جانبداری میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ وہ ہر حال میں مدد و ایام ہیں۔ اس لئے کہ محنت کش طبقے کی صفوں میں نئے نئے جیس جیس بدل کر انتشار پھیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے ٹکڑوں کی نہ پہلے کی تھی۔ غائب ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ فکارسوں کی اکثریت عموماً متوسط طبقے ہی سے متعلق ہوتی ہے۔ اعلیٰ طبقے کے افراد کو اپنی مصروفیتوں سے اتنی فرصت کہاں۔ کہ ادب کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ اور انہی طبقے کے پاس وہ دفاعی محاذ و درمیان ادب میں شہسبازی کر سکیں۔ متوسط طبقے کے وہ فن کار جن کا شعور پوری طرح بیدار نہیں ہے۔ اور جو تبدیلیاتی عمل کے اصول کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے ہیں۔ اپنے آپ کو اعلیٰ طبقے تک سے جانے کی خواہش میں یا اس طبقے سے کٹاؤ سے

مکمل طور پر اس کے خلاف اس کے لاکھوں نوکر اعلیٰ طبقہ کے مفاد سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ خود شہری یا غیر شہری طور پر ہی چیز پیش کرتے ہیں۔ ہوں
کی اس میں برائے خواہش کو ہمارے۔ یہاں ان فن کاروں کی مجبوری بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ جو سیاسی، مدنی، نفسیاتی اور عام تمدنی حالت کی
بنا ہوا ہے۔ یہ طبقہ بھی جو یا تو حقیقت ملک ان کی نظر پہنچتی ہی نہیں۔ یا اگر پہنچتی بھی ہے۔ تو وہ اس میں دلچسپی محسوس نہیں کر سکتے۔ ہوں تمام
نہ مشروطی کو ان میں جرات منانہ اور بہت ہی مزہ بڑا کر سکے۔ اب آئیے ان مفادوں کی طرف توجہ بن کی عقل پنہ۔ شعور بیدار، مطالعہ وسیع اور وقت
مشابہ ہو سکتا ہے۔ اگرچہ قوتوں کا انہیں پورا اندازہ ہے۔ یہ دیا قی مل اور اصول ترقی کو وہ پوری طرح سمجھتے ہیں۔ ذاتی، طبقاتی یا ایسی مفاد سے
پنہ کر سکتے ہیں۔ ان مفادوں کا کمر سا ہے۔ اور اس لئے جو کچھ وہ پیش کرتے ہیں۔ اس سے ان ترقی پذیر قوتوں کو آگے بڑھنے میں مدد
میتا ہے۔ جن پر دنیا کی طرح موجود، راحت و مسرت اس دلائل کا انحصار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا طبقہ ہے جو ان ترقی پذیر قوتوں کا
حامل ہے۔ یہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے سمجھنے کا اصل مقصد ان قوتوں کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ اور جو طبقہ ان قوتوں کو آگے بڑھانے کا متنی
ہو، ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے لئے نکلیں، اور وہ چیز تخلیق کریں۔ ہوں قوتوں کو آگے بڑھانے میں معاون وہ وہاں ثابت ہو۔

ان کے توسط یا دئے ان ترقی طبقوں میں سے ہم کون سے طبقہ کو ترقی پذیر قوتوں کا حامل قرار دے سکتے ہیں؟ یہاں ملک اعلیٰ طبقے
کا متعلق ہے۔ اسے ان قوتوں کا حامل قرار دیا ہی نہیں جاسکتا۔ وہ اپنے ذاتی اور طبقاتی مفاد کے پیش نظر اس بات میں کوتاہاں رہتا ہے کہ ان آگے
بڑھتی ہوئی قوتوں کو دے کے ختم ہوئے ہوئے نظام کو زندہ رکھنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس کی اپنی زندگی اور اس کے پیش و آرام کا انحصار اس
نظام پر ہی موجود ہے۔ قدامت پسندی کو تقویت دے۔ دوسرے طبقات کے افراد کو اندھیرے میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے تمام دنیا بھر میں
آگے لپھنے نہیں دیتے۔ ترقی پسندی کو برا بھلا کہتے ہوئے قدامت پسندی کی تعریف میں گیت گاتے۔ اور دنیا کو آگے بڑھانے کی بجائے
پچھے لے جانے یا ایسی جگہ جاد رکھنے کی کوشش کرے۔ یہ طبقہ ترقی پذیر قوتوں کا ساتھ دینے کی بجائے ان کی راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش
کرتا ہے۔ ترقی سے گھبر کر اعتدال پسندی کا نام لیتا ہے۔ لیکن حقیقتاً قدامت پسندی کی طرف دنیا کو لے جانا چاہتا ہے۔ کیونکہ صرف اس طرح وہ
اپنے ذاتی اور طبقاتی مفاد کی نگہداشت کر سکتا ہے۔ متوسط طبقہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ ذہنی طور پر وہ حصوں میں منقسم ہے۔ ایک تو وہ جس نے
تاریخی قوتوں کا صحیح اندازہ نہ کر کے اپنے آپ کو اعلیٰ طبقہ کے مفاد سے وابستہ کر لیا ہے۔ اور دوسرا وہ سماجی شعور کا حامل ہے۔ اور آگے بڑھتی
ہوئی قوتوں کا ساتھ دیتا ہے۔ اب ہمارا ذی اطمینانہ طبقہ۔ حقیقتاً یہ وہ طبقہ ہے۔ جو ترقی پذیر قوتوں کا حامل ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس پر عالم ان نیت کی ترقی
فلاح ہو۔ ہمارا مسرت کا دار و مدار ہے۔ لیکن معاشی مشکلات اور تعلیم کی کمی کی بنا پر ابھی اس طبقہ کا سماجی شعور پوری طرح بیدار نہیں ہو سکا۔ بہر حال
بالقوت اس میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ جن کا اظہار بعض ممالک میں کر دیا گیا ہے۔ ہر خوار کا فرض ہے۔ کہ وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے
کے لئے اپنے فکرم کو وقت کر دے۔ ظلم و ستم کے خلاف جہاد کرے۔ غلام کو ان کے صحیح مسائل سے روشناس کرائے۔ ان مسائل کے حل کرنے
کے صحیح طریقے بتائے۔ ان کے دل میں زندگی کی انگ پیدا کرے۔ انہیں روشن مستقبل کا یقین دلائے۔ عمل پر اکائے۔ ترقی کی راہ دکھائے۔ انفرادیت
کے اندھے کوئیں سے نکال کر انہیں اجتماعیت کے روشن میدان میں لائے۔ غرض ان میں سماجی شعور کو اور زیادہ نکھارنے کی کوشش کرے تاکہ یہ
سماجی شعور اصل کو پہنچ سکے۔ اور بہتر ماحول عمل اور عمل کے اصول کے تحت سماجی شعور کو اور زیادہ نکھارے۔ فن کار کے یہ تمام فرائض ہیں۔

جن کے لئے کہہ نہیں پاتا ہے۔ اگر وہ سب کچھ نہیں کرتا۔ تو یقیناً اپنے منہ کی ادائیگی میں کوتاہی برتا ہے۔
یہاں ایک سوال اٹھتا ہے۔ کہ کیا فکار اپنا فرض ماحول دیا پر کھڑے ہو کر اور دنیا کی طرف سیر کر کے ادا کر سکتا ہے۔ یا اسے اس عملی جذبہ

میں خود بھی حصہ لینا چاہیے۔ موبوں کے تھپڑے خود کھاتے چاہئیں۔ گر حباب میں غلطے لگانے چاہئیں۔ بکری طور پر ایسا سلوم تو ہے۔ کسی ایک ٹکڑے کا عملی طور پر جدوجہد زندگی میں حصہ نہ لے۔ اس کے دو چور سے اسے واسطہ نہ پڑا۔ جب تک زمانے کے گرم و سرد تھپڑے اسی نے د کھائے ہوں۔ وہ علوم کے خیالات اور جذبات صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ان کی صحیح راہنمائی نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ ان مشکلات اور مصائب کو خود برداشت نہیں کرتا۔ جن میں عوام گرفتار ہیں۔ اور جن سے نکلنے کے لئے وہ جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس وقت تک وہ ان کا صحیح حل پیش کر ہی نہیں سکتا۔ یہ مکمل کافی صحیح اور پڑن ہیں۔ اس قدر بزدل کہ انہیں اگر کالی طور پر نہیں تو بڑی طور پر ماننا پڑتا ہی ہے۔ لیکن اگر ایک فنکار قلم توڑ کر باسٹیک کر تو لٹاٹھائے شہر کھنے کے بجائے محض لگانا شروع کر دے۔ انسانے اور مضامین پیش کرنے کے بجائے پروپیگنڈے کے انتہاوات کھنا شروع کر دے تو وہ فن کار نہیں رہ جاتا۔ تقسیم عمل کے اصول پر کام کرنا پڑتا ہے۔ ادا کنا چاہئے بھی۔ عملی جدوجہد میں حصہ لینے کی اہمیت سے انکار نہیں۔ لیکن فن اور قلم کی اہمیت بھی تو مسلم ہے۔ یہ وہ نول کام بیک وقت نہیں کئے جا سکتے۔ اور نہ ہی ایک شخص ان دونوں کاموں کو پوری طرح انجام دے سکتا ہے۔

مستقلات کو چھوڑیے۔ عام فنکاروں پر نظر رکھئے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ اس کے علاوہ ہر فنکار صرف اپنے فن ہی سے تو پیٹ نہیں پال سکتا۔ فنکاروں کی ذبردست اکثریت کو اپنی معاشی ذمہ داریاں دوسرے ذرائع سے پوری کرنی پڑتی ہیں۔ ان کی ان تمام ذمہ داریوں کو دیکھئے۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ ان پر ایک ماہ ذبردست ذمہ داری ڈال دی جائے۔ ایک ایسی ذمہ داری۔ جسے پورا کرنے کے لئے انہیں اپنا تمام وقت صرف کرنا پڑے۔ اس ضمن میں ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہئے۔ زندگی کے موجودہ دور کشاکش میں کیا فنکاروں کو اس طرح وہ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ اول وہ جو ساحل دیا پر کھڑے ہو تماشہ ہوں۔ اور دوسرے جو خود موبوں کے تھپڑے کھا رہے ہوں۔ اس قسم کی تقسیم صرف منطقی طور پر غلط بلکہ واقعات کے بھی بالکل خلاف ہے۔ ہر شخص کو چاہئے وہ فنکار ہو یا نہ ہو عملی طور پر گرداب میں پھنسا اور نکلنا پڑتا ہی ہے۔ دیے کا فرق ہو سکتا ہے۔ اور ہوتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ کوئی شخص جو تماشہ ہو بلکہ کبھی کوئی موبوں سے نہ چھوئے۔ اس پر پانی کا کوئی چھینٹا نہ پڑے۔ اس کے کپڑے بالکل خشک رہیں۔ کیا وہ ہمارے میں وہ سانس لے رہا ہے۔ بجاوات سے غلطی ہو سکتی ہے۔ وہ جگہ جہاں وہ کھڑا ہے۔ کیا نہ ہوگی؟ کیا وہ موبوں سے اس قدر دور رہ سکتا ہے۔ کہ کوئی موب اس کے پاس تک نہ آ سکے۔ کشاکش زندگی میں صرف جو تماشہ رہنا مشکل ہی نہیں۔ ممکن بھی ہے عملی حصہ اس میں لینا ہی پڑتا ہے۔ کم یا زیادہ یہ اور بات ہے۔

یہ دیکھنے کے بعد کہ ہم کس کے لئے لکھتے ہیں۔ یا صحیح الفاظ میں ہمیں کس کے لئے لکھنا چاہئے۔ لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کس طرح لکھنا چاہئے ہمیں اپنے خیالات کا اظہار کس طریقے سے کرنا چاہئے۔ یقیناً اس طریقے سے کہ مخاطب اسے سمجھ سکے۔ اور اسی طرح سمجھ سکے۔ بطور ح کہ مخاطب کہنا چاہتا ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے فن کار کو اپنا مطلب نہ صرف صاف اور آسان الفاظ میں ادا کرنا چاہئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ واضح طور پر بھی ادب میں اخاذبیاں کی کافی اہمیت ہے۔ کہ اس کے بغیر ادب اعلیٰ ادب بن ہی نہیں سکتا۔ لیکن یہ اہمیت بالذات نہیں۔ بلکہ بالواسطہ ہے۔ اور اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ اسلوب کا اصل مقصد صرف وضاحت ہے۔ اگر یہ مقصد پورا ہوتا ہے تو اسلوب کا مطلب ہے۔ مگر نہ ادب میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی۔ اسلوب کی اہمیت سے انکار مقصود نہیں۔ لیکن اسلوب پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے کا مطلب ادب کی اعلیٰ قدروں کو قربان کر دینا ہے۔ اصل اہمیت جس چیز کو حاصل ہے۔ وہ مواد ہے۔ ہر مواد اپنے اسلوب کو آپ ہی متین کر لیتا ہے۔ کیا "آپ ہی" کس طرح" کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ توجہ کا اصل مستحق کیا ہے۔ نہ کہ کس طرح۔ نہ کہ کس طرح۔ پر صرف اس وقت زور دیا جا سکتا ہے جب کہنے کو کچھ نہ ہو۔ اگر فنکار کے پاس پیش کرنے کے لئے کوئی اعلیٰ مقصد موجود ہے۔ تو یہ مقصد الفاظ کا جامہ مہیا کر ہی سہے گا۔ اور یہی لباس

نہیں۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں۔ بلکہ اس میں اصل مقصد یہ ہے۔ جسے زندگی کہتے ہیں۔ وہ ادب کو پراپیگنڈا بنانا۔ تو اس بات کو تو یہاں زیر بحث ہی نہیں لایا۔ لکھنا۔ ادب پراپیگنڈا ہے۔ میں کوئی حد نہ مل سکے گی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ادب کے اپنے کچھ مطالبات ہیں۔ جب تک یہ مطالبات پورے نہ ہوں ہم اسے ادب کہہ ہی نہیں سکتے۔ اگر یہ مطالبات پورے نہ ہوں تو وہ پراپیگنڈا اور جس منزل میں سر نہیں پہنچتا۔

غرض ہم کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں۔ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ لیکن مقصد ہوتا کیا چاہئے؟ زندگی اور مرگ۔ زندگی یہاں ہی مقصد زندگی کی تفصیل بحث میں نہیں جاؤں گا۔ صرف اس قدر غرضی کروں گا۔ کہ زندگی جدیدیاتی عمل سے مرکب ہے۔ یہ جدیدیاتی عمل خیال کو غور و خوض میں ڈالتا ہے۔ جیسا کہ ہیکل کا خیال ہے۔ بلکہ اس مادی دنیا میں یہ جدیدیاتی عمل سونا جگہ جگہ مادی ہے۔ جس کے ہم میں ایک پورے ہیں۔ اور تمام تصورات، خیالات، تجلیات بھی مادی کے لحاظ سے گہرا جائے گا۔ انسانی فطرت تک رسوا کئے گا۔ حقیقت کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم حقیقت کو جلد از جلد اپنانے کی کوشش کریں۔ حقیقت کو اپنانے سے یہ نقصان تو ضرور ہوگا کہ آپ کو اپنے بیت سے نہری حوالوں کو خود اپنے اوتاروں و بنی کرنا پڑے گا۔ جنت الحق سے نکل کر حقیقی دنیا میں آنا پڑے گا۔ ان فلاحیوں کی حیالی ریاست کو چھوڑنا پڑے گا۔ لیکن اگر ہم اس موجودہ دنیا ہی کو جنت میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ تو یہ سودا کچھ ایسا مہنگا بھی نہیں۔ یہ مقصد آپ کس طرح پیدا کر سکتے ہیں اس کا صرف ایک طریقہ ہے۔ جدیدیاتی عمل کے اصول کو ہدیٰ طرح سمجھ کر شعوری طور پر اسے آگے بڑھانے ہی سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم یہ مطلب نہیں کہ ہر صاحب قلم اپنی نظروں، افکاروں، افانوں و ڈراموں میں جدیدیاتی عمل کی تشریح شروع کر دے۔ اور اس کے مطالبات ہمارے سامنے پیش کرتے گئے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر اہل قلم کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے فن پارے میں وہ چیز پیش کرے جو جدیدیاتی عمل کے حصول کے موافق ہو۔ علم کے دل میں ترقی کا ذوق و شوق پیدا کرے۔ انہیں مسکن کی بجائے جگہ کی کوشش کرے۔ فرطیت کی بجائے جماعتیت کی تعلیم دے۔ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت سکھائے۔ غم جہاں کی بجائے فیم وہاں کو پیش کرے۔ اور اگر غم جہاں کو بھی پیش کیا جائے۔ تو اس جماعتیت کے ساتھ کہ وہ غم و درداں بن جائے۔ صرف اسے پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کی جائے۔ بلکہ اس کا علاج اور نفع علاج بھی بخیر کیا جائے۔ مرض کی تشخیص علاج کے لئے ضروری ہے۔ لیکن صرف انا ہی تو کافی نہیں۔ اسے دور کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہئے۔ زندگی کے کسی پہلو کو صرف پیش کرنا ہی اہل قلم کا کام نہیں۔ اس پر تنقیدی نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔ تاکہ زندگی کے اس پہلو کو سزا دیا جائے اس طرح میں غور کی حاجت اور جدوجہد کی وقت کو واضح کرنا بھی ادیب کا فرض ہے۔ فن پارے میں وہ عکس شامل کرے کہ نہیں بلکہ واسطہ اس کی تحقیق کرے کہ اس طرح اس طرح کہ جدوجہد شعور کی حاجت ہمارے دہن میں جاگزیں ہو جائے۔ اور اس طرح آگے بڑھنے میں ہماری مدد کرے۔ سوالات کو جگہ آگے جگہ آگے کرنا کہ آوازہ جدید ہو کر آگے بڑھائے۔ کثرت آواز سے نہیں۔ بلکہ شہریں اور مترنم آواز سے۔ ہاں آوازیں اگر کبھی کبھی گونجنے لگیں۔ تو کچھ دیر بعد یہ جانا نہیں۔

مطبوعات مکتبہ لکھنؤ

لاکھنؤ پریس مٹ ایک کارڈنگ کرسٹل کی جاسکتی ہے :

پریم چند کا آخری ناول

ہندوستان

منگل سوتر پریم چند کا آخری ناول ہے۔ انہوں نے یہ ناول بیماری کی حالت میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اور ابھی چار باب ہی لکھنے پائے تھے کہ ان کی اپنی جبین کہانی کا انت ہو گیا۔

کچھ دن پہلے تک ”گودان“ ہی پریم چند کا آخری اور بہترین ناول تصور کیا جاتا تھا۔ اور اس میں مصنف کو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ ہندی کے بعض نقاد اس ناول کو نثر میں لکھا ہوا مہاکاویہ کہتے ہیں۔ اس ناول کا ہیرو ہری اہیر وٹن دھنیا ہمارے ادب کے لافانی کردار بن چکے ہیں۔ اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ طبقاتی جدوجہد ادولٹ کھسوٹ کو اس شدت اور صداقت کے ساتھ پیش کرنے والا اور ہندی میں تو کیا بنگالی میں بھی کوئی ناول موجود نہیں۔

پریم چند کی موت کے دس بارہ سال بعد یہ ادھورا ناول منگل سوتر ہمارے سامنے آیا ہے۔ اور وہ بھی صرف ہندی میں اُسے پڑھنے کے بعد ذہن میں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ”منگل سوتر“ مکمل ہو جاتا تو کیا وہ ”گودان“ سے بہتر ہوتا؟ اگر پریم چند اب واقعی حقیقت پسند بن چکے تھے تو ان کی حقیقت پسندی کی آئندہ سمت کیا ہوتی؟

”گودان“ میں پریم چند آدرش داد (جینیت پسندی) چھوڑ کر حقیقت پرست بن گئے ہیں اس ناول میں انہوں نے سماجی اور سیاسی مسائل کا کوئی غیر قدسی حل پیش نہیں کیا۔ ناول کا ہیرو ہری سماج، دھرم، برادری اور قانون سب کو مان کر چلتا ہے۔ زندگی بھر سخت محنت کرتا ہے۔ لیکن اس کا حشر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ (مورد فی زمین) ٹاٹ کر کسان سے مزدور بنتا ہے۔ اور کام کے بیجا تک بوجھ ستے دب کر مر جاتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی قدامت پسند رسوم — براہمن دیوی دین کے روپ میں — جو براہمن ہی نہیں سہو خور براہمن بھی ہے — ملنے آکھڑی ہوتی ہیں۔ اور خراج طلب کرتی ہیں۔ خراج اس انسان جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

ہری کی کہانی میں پریم چند نے اس خون چوسنے والے طبقہ والی اور بوسیدہ سماج کو ٹٹے دکھایا ہے۔ لیکن بات یہیں پر تو ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر یہ سماج واقعی ٹٹ رہا ہے۔ اور اس کا ٹٹنا ناگزیر ہے۔ تو کیا اُس کے ساتھ ہی انسانی زندگی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا؟ یا کوئی نیا سماج وجود میں آئے گا اور اس نئے سماج کی تعمیر کے عناصر کیا ہیں؟

”منگل سوتر“ میں ہم پریم چند سے ان سوالوں کے جواب کی توقع رکھ سکتے تھے اور وہ جو جواب دیتے ہیں ان کی آئندہ حقیقت پرستی کا معیار ہوتا۔ لیکن اس شک کی بھی گنجائش ہے کہ وہ شاید پھر آدرش دادی بن جاتے کیونکہ ”نظم“ میں بھی وہ حقیقت پرست ہیں۔ لیکن اس کے بعد کے ناولوں پر وہ مجازاً ”چوگان بہت“ اور ”میران عمل“ میں وہ پھر آدرش دادی بن گئے ہیں۔

اس شے کو بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا۔ ”گودان“ میں بھی آدرش داد کے کچھ عناصر موجود ہیں۔ گو وہ بہت کمزور ہیں۔ اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر مزدور ہسپتال کی ناکامی کے بعد جب چند پر کاشش کھنڈ کی تل کو آگ لگتی ہے تو پریم چند اسے مزدوروں پر کئے ہوئے ظلم

کاشی سنگھ سمجھتے ہیں کہ ایسی ہی بات ہے۔ جیسی گاندھی جی بہار کے زلزلہ کو انسان کے پاپ کرموں کا پھل مانتے تھے، اس آگ میں کھڑے ہونے کا سبب کچھ بل جانتا ہے۔ میں نے اس کا ہر دیر پر یونان (تالیف قلب) لکھا ہے۔ دوسرے ہی دن ہم اسے پھر اپنے پرانے مذہب میں دیکھتے ہیں۔ کارخانہ پھر چل رہا ہے، صنعت پھر اپنی طبقاتی بے رنگی کے ساتھ زندہ دل کا خون چوس رہا ہے۔ دیہات ناول میں واقعاتی تسلسل بھی قائم نہیں رہتا، پھر یہ نظمیں بہت لاکر داد بھی عجیب معجون مرکب ہے۔ ان سے جب ہمارا پہلی بار تعارف ہوتا ہے۔ تو وہ ایک خود پسند دانشور سے زیادہ کچھ نہیں۔ انہیں اس وقت کا افسوس ہے۔ کہ فلسفہ پر ان کی نئی تصنیف کی کافی چوچا نہیں ہوئی۔ اس کے بعد وہ بکا ایک بڑے ہی آگوش دہلی اور ایشیا رینسٹا کے حکم کے انسان بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس کے لئے انہیں کسی قسم کی ریاضت نہیں کرنی پڑتی۔ پھر وہی ہمارے اس وقت کے مکمل قیامت پسند بن گئے ہیں۔ جب وہ اپنی بڑی گونیدی کھان کی عظمت کا اپویش دے کر گھروٹ جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ انہیں اس میں کامیابی بھی ہوتی ہے۔

وہ اصل اس جگہ پریم چند نے بہت سے ذریعہ وقت جوڑ دیا سماج اور اس کے بوسیدہ ریم دور وراج سے بھرتہ کر لیا ہے۔ پریم چند نے جب شکل سوتر کھنا شروع کیا تھا۔ اس وقت زمانے کا تقاضا کیا تھا۔ اور ہماری تحریک انفرادی کن منزلوں سے گذر رہی تھی۔ اس بات کا اندازہ لگا کر ہی ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ شکل سوتر اپنی مکمل صورت میں کیا ہوتا؟ کیا وہ واقعی گنواؤں سے بہتر ناول ثابت ہوا؟

اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات سے پریم چند مطمئن نہیں تھے۔ کوئی بھی کھڈا اور ایسا نادر شخص مطمئن نہیں تھا۔ اس لئے پریم چند کی کبھی تصنیفات میں بے چینی اور جدوجہد کا احساس جاری و ساری ہے۔ شکل سوتر میں یہ احساس اور زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ناول پھر دیکھا ہے۔ میں میں ہو تو دنیا کا یہ نظام سرے سے بدل ڈالیں۔ اس ناول میں بھی پریم چند نے انہی چار ابواب میں وہ تمام مسائل پیش کر دیئے ہیں۔ جو وہ اس سے پہلے بھی اپنے ناولوں میں پیش کرتے آئے ہیں۔ اس ناول کے جدید جدید کردار یہ ہیں۔

۱۔ دیوکار۔ شہرت یافتہ اور کہنہ مشق ادیب موجودہ سیاسی اور اقتصادی نظام سے بیزار ہے۔ جو بھر خدوس اور ایسا نڈاری سے اپنی خدمت کرتا رہا ہے۔ متعدد مقبول عام کتابوں کا مصنف ہے لیکن ان سے کوئی معقول آمدنی ہونے کے بجائے وہ بزرگوں کی بھڑکی ہوئی خدمتوں کا شکار بن کر کھا جاتا ہے۔

۲۔ سنت کمار۔ ادیب کا بڑا ارٹا کا۔ انگریزی تعلیم یافتہ اور وکیل ہے۔ جو انتہا درجے کا خود غرض اور خود پسند واقع ہوا ہے۔

۳۔ سادھوکار۔ ادیب کا چھوٹا لڑکا، ایشیا رینسٹا اور بااصل نوجوان ہے۔ سیاسی تحریک میں دوسرے قید کاٹ چکا ہے۔

۴۔ سٹر سنہا۔ سنت کمار کا لنگوٹیا ہار۔ وہ بھی وکیل، خود غرض اور چلتا پڑھ۔

۵۔ گردھرواس۔ نئے نئے لڑکے کا سیٹھ ہے۔ انگریزی تعلیم حاصل کی ہے۔ قانون کو خوب سمجھتا ہے۔ کہنیوں کے حصے جوڑتا ہے اور بار بار اچھا دیکھ کر بچے دیتا ہے۔ اس کے علاوہ کھانڈ کے ایک کارخانے کا بھی مالک ہے۔

۶۔ ششیو یا۔ ادیب کی بیوی، خاندان کے آدرش داد کی قائل ہے۔ سنت کمار کی خود غرضی اور کج روی کو پسند نہیں کرتی۔ بیٹے کے خلاف ہمیشہ مادہ کی طرف مائل رہتی ہے۔

۷۔ پنکھا۔ ادیب کی بیٹی۔ بڑی سیدھی اور خدمت گزار ہے۔

۱۔ پیشہ۔ سنت نگار کی بوری، فراخ دل واقع ہوئی ہے۔ حدت کی آئندہ امید و حق کی علمبردار ہے۔
 ۲۔ طبی۔ سہنج کی بیٹی کا بی بی پڑھتی ہے۔ انتہائی ناممکن پسند ہے۔ چلتے پھرتے کہانی فقر سے دل کرنا محبت کا اظہار کا موجب
 جانتی ہے۔ نئی تہذیب کے مطابق عمل کرنے رہنا پسند کرتی ہے۔ اس کی حکمت و سکانت میں اپنی اس عائلی زندگی اور پرہیزگاروں
 کے حقوق و فرائض کا جذبہ کاربند ہے۔

۳۔ گھور ہے۔ طبی کا بڑا صاف و کر۔ طبی کی خود مری اور ہمزای سے تنگ آکر سوچتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پڑھنے سے عقل آتی ہے
 یہی ہے وہ عقل!

اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین کرنی ضروری ہے۔ کہ ان کرداروں کے ارتقاء اور مسائل کے حل کا ایک واضح خاکہ پریم چند نے اپنے
 ذہن میں یا گاندھ پر ضرور بنالیا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے "ناول کا موضوع" نام اپنے ایک معنون میں لکھا ہے۔ اس کوئی ناول شروع کرتے سے
 پہلے اگر ہم اس کے کرداروں کی ایک ذہنی تصویر بنالیا کریں تو پھر میں ان کا ارتقاء دکھانے میں سہولت ہوگی۔
 ظاہر ہے۔ پریم چند نے اپنے ذہن میں منگل سوئر کے کرداروں کی ایک واضح تصویر بنالی ہوگی۔ اگر ہم "منگل سوئر" کے کرداروں کا پریم چند
 کے پسے کرداروں سے مقابلہ کریں تو بظاہر ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا یہ دوسری بات ہے کہ اس کے حل کرنا لاگتی سوچ گھبراتا۔ مثال کے
 طور پر سنت نگار کے لیے وہ گوشہ عاقبت کے گمان شکر سے مختلف نہیں ہے۔ اس نے بھی انگریزی تعلیم حاصل کی ہے۔ مگر جو اربٹ
 ہے۔ حکمت ہاس نہیں کی۔ لیکن کرتا چاہتا ہے۔ اسے بھی اپنے چچا سے جو اسے اپنی اولاد ہی کی طرح محبت کرتا ہے۔ یہ شکایت ہے۔ کہ
 وقار پرستی کے نام پر وہ بزرگوں کی وراثت میں ملی ہوئی جائداد و ثمن کے بار بار ہے۔ اس کی بوری و دیہی پیشہ کی طرح مرد و مالدار نیک دل
 عدت ہے۔ وہ بھی اپنے خاندان کی خود غرضی کو پسند نہیں کرتی۔ گمان شکر جو روپا سے اس سے بڑھتا ہے کہ وہ لپٹے مالدار باپ سے لپیر
 کیوں نہیں لاتی۔ اور صرف اسی نیت سے سنت نگار و دیہی بوری پیشہ کو مٹانے جاتا ہے۔ وہ اس کی دلیل کو درست نہ سمجھتے ہوئے
 بھی اسے ناراض نہیں کرتا چاہتا۔ لیکن جب وہ اپنے چچا کو روپے بیچنے کے لئے خط لکھنے سے انکار کر دیتی ہے تو سنت نگار کی
 ساری طاقت اور شدافت کا زور ہوجاتی ہے۔ اور وہ پھر اس سے زپڑتا ہے۔ گمان شکر مطلب برآری کے لئے کٹھنی سے
 محبت کا سوا لنگ بھرتا ہے۔ اور سنت نگار اس مطلب برآری کے لئے طبی سے محبت جتانے لگتا ہے۔

لیکن گمان شکر اور دیہی کی پر مدش میں احوال میں ہوتی ہے۔ "منگل سوئر" کا ماحول اس سے مختلف ہے۔ اس لئے ہم دونوں سے
 کہہ سکتے ہیں کہ سنت نگار اور پیشہ کی کہانی کا انتہا وہ نہیں ہوگا۔ جو گمان شکر اور دیہی کی اندہ اچی زندگی کا جواب ہے۔ جو گمان بھی "کے لجا
 ہند" اور ماحول کی اندہ اچی زندگی کی کہانی بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ سندھ بیاہ کی رسم کا بوسیدہ اور نقصان دہ ہوتا۔ بڑا کی کو بیسیج
 کی لائے کچھ کر جس کے ہاتھ چاہے پکا دینا۔ لیکن ماحول اور حالات مختلف ہونے کے باعث اندہ و زوں کہانیوں کا انجام بھی مختلف ہوتا ہے
 گوشہ عاقبت کی دیہی خاندان کی خود غرضی اور نفس پرہی سے تنگ آکر خود کشی کر لیتی ہے۔ اور گمان شکر پنا سب کچھ لئے دیکھنے کے
 لئے زندہ رہتا ہے۔ "چوگان ہستی" کی اندہ اپنے ریاکار خاندان کو چھوڑ کر اپنی آغوش ولوی ماں کے پاس آکر بسنے لگتی ہے۔ ایسا اس کے
 ساتھ خدمتِ خلق میں لگ جاتی ہے۔ جب ہندو گدار اپنے حصارِ بغض کے باعث سو داس کا بت گانا ہے۔ اور خود اس کے پیچھے صبر کر
 جاتا ہے۔ تو انوکھا خاندان کی موت کا مذا بھی افسوس نہیں ہوتا۔

اسی طرح میں بھی اگرچہ تسلیم ہے کہ خود کارخانہ پشپا کو ایک ایسے مو کے پٹے باندھ دیا گیا ہے۔ جہاں کسی غلطی کے باعث اس کی گتلی نہیں ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ پریم چند اس معاملہ میں بھی گوشہ عافیت اور چوگان ہستی کی طرح اس مسئلے کا حل پیش ہی کرتے ہوں۔ بلکہ اس کے لئے اس کی گتلی میں کوئی ہتھ مار کی حکمت سمجھ کر نامہ کے ساتھ بنائے رکھنے کی تلقین کرتا ہوں۔ اس قدامت پسند سماج کے خلاف پریم چند کے دل میں قہر کا جھپٹہ ہے۔ کہیں زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ اس نے ممکن ہے کہ جس طرح کفن میں جنوں نے سماج کے دم ممدراج کا حلقہ اٹا دیا اور اس کی تمام پانچوں گتلیوں کو بے دخل کر دیا ہے۔ یہاں بھی وہ نہ سنے۔

پشپا کو لکڑی کی ٹیڑھی ہے۔ اس کی پورے نئی تہذیب کے مطابق ہوئی ہے۔ وہ دنیا اور اندک کی طرح جائیداد کی سماج سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ "بلوچ" کی گتلی کی طرح پیدا احساس کی ملک ہے۔ عورت کے حقوق اور ذمے داریوں کو سمجھتی ہے۔ اور ان حقوق کے لئے جدوجہد کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ وہ اپنے غلامہ سنت کا۔ سے سات سات کہتی ہے۔ "اگر میں تہا سنی محتاج ہوں تو تم بھی میرے محتاج ہو۔ میں تہا سے گھر میں جتنا کام کرتی ہوں اگر کسی دوسرے گھر میں کروں تو گزارہ کر سکتی ہوں۔ جب سنت کا یہ دہل پیش کرنا چاہتا ہے۔ کہ وہ ان تہا سے وہ عورتیں ہوں۔ تہا سے گھر میں ہوتی ہے۔ تو وہ لیڈی ٹاکر کی شکل پیش کرتی ہے۔ لیکن میں نے مس ٹیل کو تمام عرصہ کی رہ کر عورت سے زندگی بسر کرتے دیکھا ہے اس لڑکھو ملک اور بحث کا یہ رخ ٹھہر کر رہا ہے۔ کہ سنت تہا سے جو بھی سے پریم کا سوا گنا بھرتا ہے۔ اور جو آگے چل کر اس سے بھی زیادہ سنگ بھرتا ہے۔ پشپا کا تہا نہیں ہو گا۔ لیکن یہ بات بھی سنی ہے کہ وہ دنیا کی طرح خود کشی نہیں کرے گی۔ اس کی ذہنی افتادہ دیا ہے مختلف ہے۔ وہ عورت کی آزادی اور خواتین کی راہ کو بخوبی سمجھتی ہے۔ اس نے پشپا کو سب مہاش کا کوئی باعزت ذریعہ اختیار کر کے ملک ہے گی۔ اور سنت کا وہ دکھا دے گی کہ عورت پیٹ بھرتے کے لئے مرد کی محتاج نہیں ہے۔ لیکن ہے پریم چند جو پہلے طلاق کے قائل نہیں تھے۔ اب ہو گئے ہوں۔ اور انہوں نے ان مددگاروں میں طلاق ہی کو دیتے۔

لیجی یعنی تہذیب میں نہیں گزردان کی دہشت کی مشروع اعداؤ زندگی کی جھلک پہلے ہی باب میں مل جاتی ہے۔ وہ نئی تہذیب کی تلی ہے۔ اچھے من پنا ہے۔ اور وہ اپنے سلی علم کی غائش کرنا بھی خوب جانتی ہے۔ لیکن وہ اپنا پسندی جو قبول پریم چند ہرنیک انسان کے دل میں بھی رہتی ہے۔ اس کے دل میں بھی موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بیزار کن اور غائش پسند ماحول سے اوپر اٹھنے کا ذرا بھی موقع ملے تو وہ اسے ہاتھ نہیں جالنے دے گی۔ اس کا ذکر عبور سے ان حالات سے ابھرنے میں اس کی مدد کرے گا۔ جلد و جہد میں اس کے کردار کی تمام کمزوریاں دھو کر نکالے گی۔

جہاں جہاد کا آغاز اس ناول میں بھی ہو گا۔ اپنی چار باب میں پریم چند نے اس کے عنوان پیدا کر دیئے ہیں۔ مگر وہ اس ہا جہا جہاد ہے۔ کہ پریم چند نے اپنے ڈھنگ کا انداز اور انداز ماننے کا ہے۔ "گزردان" کے چند روپ کا ش کھنک کی طرح وہ بھی دس جھلک کھانے اور اپنا کاروبار چکانے کے لئے جہاد میں جہاد ہے۔ کہیں کے تھے جو رہتا ہے۔ اور پھر بھگے داوا بھی دیتا ہے۔ اس کا بھی ایک شوگر مل ہے۔ وہ اپنے آپ کی طرح قدامت پسند نہیں ہے۔ وہ پریم چند کے نام سے پڑتا ہے۔ اور دن خیرات کے خلاف اس نے ایک کتاب بھی لکھ ڈالی ہے۔ اپنے آپ کو ہند اور اہل حق ٹھہر کر کے لئے وہ دیوار کی عزت کرتا ہے۔ اور اس کی کچھ خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ لیکن جب دیوار کا رانی وہ لاکھ کی ہامیداد کو میں ہزار میں ہزار کھانے کی بات پھرتا ہے۔ اور عدالت میں جہنم کے بجائے رشتوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی بات کہتا ہے تو گہر اس کا باہر دت چہرہ یک دم سخت پڑ جاتا ہے۔ جی ہا جہا جہاد اس نے طاعت کی نرم گوی میں چھپا رکھا تھا۔ وہ تیز انداز میں ہر گز باہر نکل آتے ہیں۔

یہ گرد و مراد اس سماج میں نوٹ کھسٹ کا مجسمہ ہے۔ گو دان کا چند پر کاغذ کھنڈ بھی اس گرد و مراد میں گنجانا چاہیے۔ ان لوگوں کی دلچسپی
 طاقت و مشافقت محض دکھا دے کی چیزیں ہیں جس طرح کھنڈ کے شوگر مل میں ہڑتال ہوئی تھی۔ اس طرح گرد و مراد اس کے شوگر مل میں بھی ہڑتال ہوا غرضی ہے
 ۱۹۳۶ء میں جب پریم چند نے ناول لکھ رہے تھے۔ مزدور تحریک اور مزدوروں کی ہڑتالوں کا زہر بڑھتا تھا۔ اس دور مزدور یونینوں میں منظم ہو
 رہے تھے۔ گاندھی جی اچھوت اور عار کا کام سنبھال کر سیاست سے الگ ہو گئے تھے۔ سوشلسٹ انڈیکرینٹ پارٹیاں سرگرم عمل تھیں۔ لاٹووس کی
 باگ ٹھہر چاہر لال نہرو کے ماتھے میں تھی۔ اس وقت وہ سوشلزم کے سب سے بڑے ترجمان بنے ہوئے تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سادہ حوصلہ و سوشلزم ہم
 بخیرہ طبیعت کا نوجوان ہے۔ جو سیاسی تحریکوں میں پہلے بھی دھار قید کاٹ چکا ہے۔ آگے چل کر گرد و مراد اس کے مل کے مزدوروں کی تنظیم کرے گا
 اور نوٹ کھسٹ کے خلاف ان کی ہڑتالوں کی دہائی کرے گا۔ مگر اس جدوجہد میں حصہ لے گی۔ سنت کا رکا سواگ، خود غرضی اور ریاکاری نہ پاویں
 وہیں بھی نہیں رہے گی۔ اور وہ اصلی پریم سادہ حوصلہ رکھے پائگی۔ ملی جدوجہد میں ان دونوں کی جادوں کا ارتقا ہوگا۔ اور میں ممکن ہے مآخو فی ان دونوں
 کی شادی ہو جائے۔ ملی کہتی ہے۔ میں بیاہ کو پریم بندھن کے دوپ میں دیکھ سکتی ہوں۔ دھرم بندھن یا دواج بندھن تو میرے لئے ناقابلِ پراشت ہو
 جائے گا۔ ان کا یہ بیاہ پریم بندھن ہی ہوگا۔ امدائے سماج میں پریم بندھن ہی بیاہ کی ترقی یافتہ صورت امدادِ ابدی سم ہوگی۔ — دیوکار کے متعلق لکھا ہے
 — ”ادبی خدمت کے علاوہ انہیں امد کسی کام سے دلچسپی نہیں تھی۔ امدیاں دھن کہاں؟ نام ضرور پایا ان کے دلِ اطمینان کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔“
 لیکن پراطمینان اس وقت تک ہا جب تک دیوکار بھی ”گو دان“ کے بوری کی طرح آمدش دلاوی بن کر اس سماج امد اس کے رسم و عادات اور قانون
 کا عدوں کو مانتا تھا۔ امد بھی تک اس نے سنت کا رکا کی اس تجویز کی مخالفت کی کہ بزرگوں کی کھوئی جائداد کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے گرد و مراد اس
 دھار و مالش کی جائے۔ دیوکار کو اپنے قول کا پاس تھا۔ وہ اس سے اعزات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب اس سماج کی پابندیوں کے تحت اس کا بصورت
 سر سے اتر گیا تو سوچا۔ بیشک وہ مہاجن کے میں ہزار کا قرضہ ہے۔ اخلاق کا تقاضا ہے۔ کہ اس جائداد کو فروخت کر کے امد کے میں
 ہزار چلا دیئے جائیں۔ باقی اسے مل جائیں۔ اگر قانون قرضہ کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ تو قرضہ دار بھی قانون میں جتنی کھینچ تان ہو سکے اتنا کر
 کے مہاجن سے اپنی جائداد واپس لینے میں کسی براعتی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ”یہ خیال اب کس طرح بھی ذہن سے نہیں نکلتا۔ اگرچہ اس سے ان
 کے پرانے سنسکاروں و رجحانات کی بنیادیں ہل گئی تھیں لیکن وہ اتنے خوش تھے کہ بھولے نہیں سمجھتے تھے۔ گویا انہیں کوئی ”نیا جیونی منتر“
 مل گیا ہو۔“

ہمارا خیال ہے۔ کہ منگل سوتر ”گو دان“ سے چار قدم آگے ہی ہوتا۔ اس میں ”گو دان“ کی وہ کمزوریاں نہ ہوتیں جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر گئے
 ہیں۔ پریم چند کا ذہنی ارتقا برابر جاری تھا۔ وہ اپنے طویل ادبی سفر میں کسی مقام پر ر کے نہیں ”مہاجنی تہذیب“ ان کا آخری مضمون ہے۔ جو ان کی توت
 کے ایک ماہ بعد جنس میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے دھرم کی اس نئی تہذیب کو خوب سراہا ہے جس میں نوٹ کھسٹ ہمیشہ کے
 لئے ختم ہو گئی ہے۔ امد جس نے ایک نئے انسان کو جنم دیا ہے۔ اس کے ذریعہ انہیں انسانی مستقبل روشن نظر آتا تھا۔ یہی عقیدہ وہ ”نیا جیونی
 منتر“ ہے۔ جسے لے کر وہ ”منگل سوتر“ تخلیق کر رہے تھے۔

نیا حق

اردو کے حقیقت پسند فنکار منہراج رہبر کے افسانوں کا مجموعہ • مکتبہ دارالحدیث

منزل منزل

فضاؤں میں سفاک سورج کی مدت
ہواؤں میں تال شمعوں کی آنچ
بڑھتی گئی —

جبینوں پر ستیاں تاروں کے جھڑٹ
نظر تاب چٹکار لیل کی طرح
دھکتے رہے —

نہ بادل، نہ سایہ، نہ ٹھنڈک، نہ راحت
ٹکا ہوں یہ اک حیرتوں کا سراب
پھایا رہا —

بہ این شنگی اپنی روح تجسّس
ابا بیل بن کر افق تا افق
بھٹکتی رہی —

یہ گنگ و بگن میں، یہ نیل و فرات
کہیں تو بڑے گانہ شان حیات

غزالہ کے نام

(سائیت)

مری چشم تما کی نمی تم نے نہیں دیکھی ! !
 بول پر میرے اکثر اک تبسم تم نے دیکھا ہے
 تبسم کے پس پر وہ جو غم کی ایک دنیا ہے
 جھلک اس ایک فُتیا کی ابھی تم نے نہیں دیکھی !
 اندھیروں میں سسکتی روشنی تم نے نہیں دیکھی !
 تمہیں آسودہ آئینہ و شانہ جو پایا ہے
 تمہارے گیسوؤں کی ہی میں نے سوچا ہے
 کہ زلفِ زندگی کی برہی تم نے نہیں دیکھی !

مری لکڑی کی یہ اُٹھی ہوئی تازہ نمی سے لڑا
 تمہارے غنچہ دل کی نئی تشکیل ہو جائے
 ربابِ غم سے میرے آج تم کچھ فٹنگی سے لڑا
 کہ اندازِ تبسم کی فدا تیکمیل ہو جائے
 غزالہ ! زندگی کے گیسوؤں کی برہی سے لڑا
 فدا فطرت کے بھی احکام کی تعمیل ہو جائے

نقشبہ

فقری تہجے سے ہم آہنگ گنگنائی ہوئی فٹاسے طول
 و فذنائی ہوئی وداں سائیکل اور سکڑتا ہوا سٹیک طول
 باد صرصر کے ساز پر دو دل ایک دھن کی الپ میں مشغول

...

زکھن پر پیچ مائل پرواز رہ گزریں اُٹی اُٹی سی دھول
 پھولا پھولا ساز رو پیرا ہن! جیسے جو بن پھل گل میں بھول!
 لہریں کھاتا ہوا گداز بدن بھیل میں جس طرح کنول کا پھول

...

اپنے اپنے خیال میں دونوں جائیں دانستہ جیسے رستہ بھول
 حسنِ نو مید کی خلاف قیاس جیسے ہو جائیں آرزوئیں قبول
 عشقِ مجبور کا دل مایوس بعدِ مدت بنے گی سے پھول
 جیسے شاعر کے ذہن میں بس کہ ایک رنگیں خیال بہرِ زُؤل

توکِ ملکِ رواں پہ آجائے
 نظم بن کہ ورق پہ چھا جائے

گیت

رو پھر سانولی رجنی نے تاروں بھرا اپنل لہرایا

بیٹے ہوئے سب سے پہلے
لگے ہوئے اب گیت پڑانے
آگے دل کا درد بڑھانے

دھیرے دھیرے سونے نگر پر پھیلی دُکھ کی چھپایا

روپ نگر کے رہنے والو
جھوٹے سپنوں کے متوالو
کابل سے آنکھوں کو سنوارو
پھولوں سے بالوں کو سجھاو

بھور ہوئی تو مٹ جائے گی سندرات کی مایا

گئے سے کاسوگ منائیں
چند رماں کی جوت جلا لیں
سندتا کی دھوم مچائیں

ایسی ہی کتنی سوہوں سے جیون کا پھیچ گھبیرایا

انتیاز جمیں ایم لے

اس کی خواب گاہ کے درجوں پھیلی ہوئی بوی کی سیڑیوں میں۔ سے چھن چھن کر آتی ہوئی سورج کی پہلی لڑوں نے جب۔ اپنی نازک انگوٹھوں سے اس کے
تھکن سے چھوٹ کر چھوٹا ہوا ایک۔ طویل انگڑائی لیتی ہوئی اپنے ذمہ سترے اٹھ گئی۔ پھر کمر بند کے وہاں دو ایک جمہوریاں نے کراس نے اپنی خوبصورت
انگوٹھوں کے نیند کے قفسے سے بوجھل پوڑوں کو دو ذیلی تھالیوں سے ملے ہوئے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اس سے یہ سب کچھ دیکھنے والا وہی ہے
سرسبز اتنی ہی پرانی اور جانی پیانی ہے۔ جتنی کل تھی۔ صبح کا پھیلتا ہوا ہلکا سا اجالہ کل کی طرح آج بڑا ملکا اور سو گوار ہے۔ فرش پر نہیں کہیں جھڑے تنگوں اور
پر ساتی کیرے کوڑوں کی خاک بے سرو سامان۔ ہی بے مزہ، پھلکی اور ہزاروں سال پرانی کہانی وہ ہر ادبی تھی جس کا انجام ہمیشہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ کہانی کل اور کل سے
چلے ہیں وہ ہر اُن کی تھی۔ اور بالکل اسی انداز میں یہ سب کچھ وہی ہے۔ یہ سب کچھ وہی ہے۔ کہیں سے بھی تو کچھ بدلا نہیں ہے۔ اور دہائی براہ کرسی چیریں کوئی
رقہ آیا ہے۔

وہ ہر سات کی ایک پھیل ہوئی صبح تھی۔ اس کی خواب گاہ کے باہر راستہ کے کھینچے ہیں چلنے والی آوازیں بنیاد کے تھے یوں بہتی چلی جا رہی تھیں
گراہک بڑی مشقت کے ساتھ۔ لگاؤ کوئی کلاسیکل ناچ سیکھ رہی ہوں۔ جب کبھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا جوسی کی گھیرنی سیوں کو دور دور سے بل دیتا تو اس کی پیوں پر
رات کی بادشہ کے ٹھہرے ہوئے قطرات ڈھلک ڈھلک کر نیچے زمین پر گرنے لگے تو اس وقت ایسا معلوم ہوتا۔ جیسے کسی نے سارے درجوں پر
مختلطی دہکے لئے بندوں کی ہنسی چاہ ڈال دی ہو۔ اور جب کبھی ہوا کا کوئی خدا اور تیز جھونکا اس کی خواب گاہ میں۔ سے جو کچھ ہم دھم کے سروں میں کوئی جھولنا سبرا
گیت گاتا ہوا گزرنے لگتا تو اس کے سارے صحن پر سارے ہلکے کلابی رنگ کے پردے فٹا ہیں۔ اور اٹھتے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی رومان پرست جوان
لڑکی عالم خیال میں اپنے اعلیٰ دیوی تصورات کی منہری بندوں پر کھڑی ہو کر شفق سے نرم، غلوں کو اپنی خوشی میں سمیٹا۔ لینے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے
اتنی کی طرف سے چہرہ پر ہوا۔ ہوا نے جھونکے تانگی بخش، خوشگوار اور ٹھنڈے تھے۔ ان کے سطح پر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی ٹھنڈے پانی کی پھیل
کے ہر فیہ بہت سے سوتے سوتے اٹھ کر اور صرھاگ آئے ہوں۔

اس نے وہ دیکھتے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ سدھی فضا میں ایک۔ طرح کا انوکھا نکھار اور نیا پن کروٹ سے رہا تھا۔ جیسے کسی نے سارے ماحول
اور سامنے مناظر پر چھپتے نیا رنگ۔ پھر دیا ہو۔ ان باہر کی دنیا کتنی نئی سی ہے۔ اور اس کے کمرے کے اندر کی اندر کی چھوٹی سی دنیا کتنی پرانی۔ اس کے دل میں
ہر خیالی یا آسمان بالکل صاف تھا۔ اور اس کے نیچے پھیلی ہوئی نرم اور چھلکی دھوپ میں ہر چیز چمکی دھلائی، صاف اور نکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ درختوں کی پھلکی
پھلکی تھاپیں آئینے کی طرح سورج کی تیز کرنوں کو اور صرھاگ دہی تھیں۔ اس کے درخت کے سامنے شیریں لہو پنچے اور پنچے پیڑوں کی پھلکیوں سے
اور پھلکی ہوئی گھنٹہ گھر کی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ اور جیسے گاج کے گنبد کا منہری کنگورہ آسمان کی نیلی دستروں میں اپنا ننھا سا سرور سرور ٹھہرے فخر سے ساتھ اٹھائے ہوئے کھڑا
تھا۔ یہ سب کچھ ایک ہی گت تھا۔ اس کی بہت سی کمرہ اور بہت سی دیکھنے میں مضبوط ٹہنیاں ٹوٹ کر کھڑکی تھیں۔ اور اس کے نیچے کی ساری
دیں ہر تھیں۔ اور سرخ سرخ چھوڑوں سے ڈھلک گئی تھی۔ بڑی نازک ڈالیاں ہوتی ہیں۔ گل ہر کی!! اس نے اس طرح سوچا گویا ان کے ٹوٹ جانے

اس کو بھی بڑا افسوس ہوا کہ ہر کے اس وقت کو اپنے بہن کے دل سے جانتی تھی۔ جب وہ اسی بھی تھی۔ تب یہ مدت بھی تھا ایک
 پچاس۔ تب ہی سے اس نے اپنے دل میں اس نئے سے پہلے کی ایک بڑی امید افزا تصویر بناد رکھی تھی۔ ایک دن وہ آئے گا۔ جب یہ تھا ماہود
 بڑا کر بون ہوا۔ اس کی شائیں جو ابھی اس قدر چھوٹی تھیں کہ کچھ ہیں۔ بڑا کر ہر طرف پھیل جائیں گی۔ اور ان کے دیکھنے پر سب کو دل مانے اس کے
 مکان کی دوسری منزل کو جس میں وہ رہتی تھی۔ اپنی غنڈی گویں سے میں نے۔ ان میں سرخ رنگ کے پھل آئیں گے۔ بہت نئی شائیں پھولیں گی اور اس طرح
 کلیں ہلکی درخت پر آٹھا۔ پھلتا اور پھولتا رہے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی زندگی کی تپیلوں سے دوچار ہوگی اس کی زندگی کے آئیں میں دومان
 خواہوں کی سین فیروں کی چاندنی اس کو سرست کے نئے امکانات خوشی کے نئے وعدوں کی جھلک دکھائے گی اس نے کتنی بھیں اور پھر یہ لہذا میں
 بہن کی صوم گھڑیوں سے بھر کر اپنی عمر کے پچیسویں سال کے طرکے جا گئے اور سوچے تمنا تک گل ہر کے اس سایہ مدت کے نیچے چھوڑ گئی
 ہیں تنہائی کے اوقات میں اسی مدت کے ساتھ میں اس نے عجب و فریبہ باتیں سوچی ہیں۔ بن کی حقاقت پر کبھی کبھی اس کو بے تابا نہی بھی آگئی ہے
 اس کی پھل شائیں کو پکڑ کر جو تے ہوئے اس نے جیسے جاگتے کتے خوش آئند پسند دیکھے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو نئے نئے چوں کی طرح اس کے تنہا ہونے
 اس نے سرگوشی کے انداز میں کتے ہی پیار سے پیادے گیت گائے ہیں اور اپنے دل کے پوشیدہ بات تک اس سے کہلائے ہیں۔ اور آج وہ مدت اس کے پچیس
 کا ساتھی اس طرح ابھری تھا۔ لیکن وہ کتنی کیا بات کا وہ خان ہی کچھ اس قدر تیز تھا کہ ہر طرف اندھیرا بیت ہی گھر اندھیرا ہوا کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ وہ
 کر یہ گمان ہونے لگا کہ شاید کبھی آئندہ اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہوا نہ چل سکے۔ وہ سو سلا دھار بادشاہ میں ہاتے ہوئے مدتوں کے پھٹا ہوا ہیں
 بڑے زور سے دھند سے دھشت انگیز شیطانی سیلاب جاتی رہی بھی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بڑی طاعونی گرج کے ساتھ آسمان کی اندھیرائی میں ایک بہت ہی تیز بجلی
 اور فوراً منٹ جلنے والی کیر کینج دینی پھلندھیرا کچھ اور گہرا ہو جاتا۔ طوفان کی شدت کچھ اور بڑھ جاتی اور ہوا سے جو تے ہوئے مدتوں کے پتے کچھ اور زور سے پختے
 چھٹنے لگتے۔ اس کی خالک کے روشن اور اندھ بند ہو چلے شیشوں پر بدش کی تیز و چھارستہ اپنی پیٹ مگرتی رہی اور ان پر کچھ سیدھا کچھ آڑے ترچھے اور کچھ
 گول گول چھوڑ کے خاکے بنتے رہے۔ لیکن ابھی شکل ہی سے کوئی ایک خاکہ کھل ہو پانا کہ ہوا کے بے رحم ہاتھ اس کو مٹا دیتے۔ لیکن دوسری طرف گرتے ہوئے
 پانی کی تیز دھار اور مرا خاکہ بنانے لگتی۔ یہ اوصاف خاکے یوں ہی تاثرات بنتے اور ٹکڑے۔ ٹکڑے اور بنتے رہے۔ اور کھڑے کے پوہل کہنے میں ایک طرف
 رکھے ہوئے نیز پر پھل کے لیمپ کے سبز رنگ کے شید سے نکلتی ہوئی دم دم روشنی میں وہ یہ فاشہ دکھیتی رہی اور بہتر میں پڑے پڑے کدوئیں بل بل کر اپنی پکڑا
 آنکھوں سے روشنی ہوئی غیب کو بڑے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن نیند اس طالت نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اس نے تو یوں سوچا تھا۔ یہاں سے وہ بہت دور نیلے
 سمندر کے اُس پار ایک چھوٹا سا خوبصورت جزیرہ ہے۔ جہاں سال بھر چھوڑوں کے ٹکڑے سکراتے رہتے ہیں۔ اسٹاک پھل مر جھلنے نہیں پاتا کہ وہ ہر چھوڑ
 کھل جاتا ہے۔ وہیں چھوڑوں کے ایک چمکتے ہوئے کچھ میں نیند کی آواز مگدھ ہے۔ اور ہوا تو وہ اسی جزیرے سے دن بھر کی محنت سے تھکے ہائے انسانوں کی دنیا
 میں مٹی مٹی وہاں گاتی ہوئی چلی آتی ہے۔ آج کی بھانک بات میں جب کہ ہر طرف طوفان اس طرح بھڑا رہا ہے۔ جنگھاڑ رہا ہے۔ وہ اسے میں کہیں نہ کہیں ضرور
 بٹک گئی ہوگی۔ یہ اور ایسی بہت سی دوسری بے سرسیر کی باتیں اس کے بے چہرے دماغ میں چلکاتی رہیں۔ چھوڑوں کے آخری کھچے میں جب کہ ہوا بدش
 کا طوفان ڈاکھ تھک کر دھما پڑ چکا تھا۔ اس کی نیند سے آچاٹ آنکھیں بجانے کیسے ڈاسا بچک گئیں اور چند بھاگتے ہوئے لمحات کے سٹاکس
 کی آنکھ لگ گئی اور پھر جانے کب سو رہا ہوگا۔

اس نے دستے پکڑے کھڑے دہر نظر دوڑائی۔ بات کی تیز بادش سے خوب اچھی طرح وصل جانے کی وجہ سے کوتاہ کی سیادہ رنگ
 میں چمک رہی تھی۔ جیسے جادو کے لیم میں ہانپنے کے بعد کسی رگی کے کھنچے ہوئے بیگے بھگے بال زمرہ صوب میں سکھاتے ہوئے چمکتے ہیں۔ ماضی وقت

دیکھتے ہیں وہ دنیا بہت دن بڑے آواز تھی: لیکن اب اس کے گھر سے بڑے کھڑکرت اس کی یادوں میں رہ رہتے تھے۔ اس نے دیکھا کہ کتنی بھی
 تھی۔ اس میں رہنے والے کتنے اچھے تھے۔ ان کے خیالات کتنے معصوم تھے۔ بچپن کی اس دنیا میں رہتے ہوئے ایسا لگتا تھا جیسے سانسے لوگ
 اس قریح کے جھوٹے میں مچل رہے ہیں۔ ہوں کتنے دن کتنے ہی دن اس سال اس خوبصورت جھوٹے میں جھوٹے گزرتے تھے۔ اس کو ٹھیک ٹھیک
 یاد نہیں تھا۔ پتا نہ تھا کہ وہ کتنے دن اور خوبصورت راتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ اس کے دل کے
 نہیں خانوں میں اس کے اسکول کے سالانہ جلسوں کی یادوں کی گونج گونج جاتی اور وہ زندگی کے چند لمحات خوشی کے سانسے میں گزرتے تھے۔ اسکول کے کچھ
 کے دن ہی۔ سب لڑکیاں اس کا وہ جلسے کا انتظار بڑی بے چینی کے ساتھ کرتی تھیں۔ اس کو اسکول کے کہا جاتا تھا۔ اس روز تمام لڑکیوں کو بڑی
 مصروفیت کے ساتھ یہ یقین آ جاتا کہ یہ زندگی تمام اور کھیل کود، شہسی ٹھٹھا اور نئی نئی شہسٹا ہے۔ اور جیسے عادی دنیا پر چوں کا راج ہے۔ اس
 کے آگے اور کچھ نہیں۔ یہ تو اسکول کی دنیا کا حال تھا۔ اس کے گھر کی چھوٹی سی دنیا تو اور بھی اچھی تھی۔ ماں باپ، بھائی بہن کا پیار، کتنی بڑی شہسٹا ہیں۔ اس
 کے علاوہ اس کے بڑے بھائی سے بنانے کیے کیسے لوگ ملنے کے آگے کرتے تھے۔ ان سب کی متعلقہ حور پر اسے تھی۔ کہ امتیاز جس بہت اچھی
 لڑکی ہے۔ وہ سب اس کے گھر وہ آتے اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے۔ جو دوسروں کی آنکھیں بھا کر اس کی بڑی آپاس کے پاس نہ جھٹنے کیا کیا تھے
 تعارف بھیجا کرتے۔ آخر کیوں؟ — آخر کیوں؟ وہ اکثر سوچتی لیکن بہت دور تک سوچ نہ پاتی۔ ان سب کے علاوہ اس کے ہاں سنہ یلہ کا ایک دھکا آیا
 کرتا تھا۔ جو اس کا دور کا رشتہ دار بھی ہوتا تھا۔ اس کا ہم عمر تھا۔ یا اس سے عمریں دو ایک سال بڑا۔ شاعر تھا۔ اور تانتا تخلص کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ آئندہ وہ
 ایک بہت بڑا شاعر ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ بہت بڑا شاعر اوقات بڑا کہیں۔ اور وہ ہاتھ اٹھا کر اس کو اس طرح بتاتا کہ بڑا شاعر نہیں بلکہ ایک بڑا
 دو پہل انسان ہونے والا ہے۔ وہ بڑا ہی شہسٹا تھا۔ اور بات بات پر اس کو خوب خوب بھیڑا کرتا۔ یہ کبھی وہ کتاب لے کر پڑھنے بیٹھتا تو وہ بہت بے
 دہی قدم رکھتا تھا اس کے پاس چلے سے آکر کہتا۔

”سولو گڑیا کیا کر رہی ہو؟“

اور وہ اس کے محل جو نے پڑھنے لگا کر جواب دیتی۔

”کیا تیار ہی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ دیکھ تو سہے ہو۔ کاسٹڈی کر رہی ہوں۔“

آپ ادا سنڈی! کیا دماغ پھر گیا ہے آپ کا؟“ وہ اس کو اور پھیرتا۔ تب وہ دھماکہ کر جواب دیتی۔

”نہیں تو ارادہ کیا؟ اس سال میں اپنی کلاس میں ٹکپ کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں، کیا خیال شدہ ہے؟“

”جی ہاں! بڑا ایک خیال ہے۔ لیکن پہلے فدا اپنی شکل تو آئینے میں دیکھ لیجئے۔ یہ منہ اور سہ کی وال؟ وہ جلد ختم کرنے کے بعد اپنی زبان منہ سے باہر
 بجال کر گون دھا بھا دیتا۔

اس پر وہ سچ سچ خفا ہو جاتی اور بچھا کر کہتی۔

”کچھ نہیں! تم سارے لڑکے ہم لڑکیوں کے ٹاپ کرنے سے بچتے ہو۔ اور وہ وہاں بھی ہو جاتی۔ اس پرانے دونوں کے درمیان مرد و عورت کی جھگڑ

بڑا ہے۔ اسے مرد و عورت پر اس قدر زور ہے کہ بڑا بڑا بچہ جاتی اور وہ دونوں اپنے لفظ: مروتات ایک دوسرے کے سامنے اس طرح رکھتے کہ سننے والوں

کو بے حاشہ ہنسی آ جاتی۔

یاد کیا کہ ایک تیرہ بچہ نکا کرے میں شہسٹا تھا اور اس کا ہم عمر وہ بچوں کے سامنے پٹ آپس میں ٹکڑا کر اس طرح پھرنے لگے۔ کہ اسی کے خیالات

ساتھ ساتھ اس کی ایک کمرہ، جس کی طرف سے دانتوں کے ساتھ آئی اور سڑک کا تھام چیرتی، پانی کے چھینٹے اور اسی پانی میں لے جانے کی گئی۔
اس کی طرف سے اس کا پچھلا کمرہ۔ یہ ٹانگہ ہی تیزی کے ساتھ دینس کالج کے موڑ سے گھوم کر وائٹ روڈ کی طرف نکل گئی۔ کار تو نظروں سے اوجھل ہو
گئی۔ لیکن جیسے کہ اس کے پاس اس کی نظریں دینس کالج کے دروازوں سے جا گئیں۔ اسی وقت کامن روم کے بچت پرگے ہونے لگے اور اس کے اریلی کے کار
پاؤں چلنے لگے کہ اس سے اسی پانی بھری ہوئی گئی۔

تہ کیا ایک اس کتاب کا۔ جیسے اس کہ وہ سارے دن ایک ساتھ مل کر آواز دے رہے ہوں۔ جو اس نے وینس فالج میں گزارا ہے۔

یہ ایک عجیب سی دنیا تھی۔۔۔ کالج کی دنیا۔۔۔ اسکول کی دنیا سے کل کالج کی دنیا میں آ جانا، یہاں ہے جیسے کوئی دھندلوں سے نکل کر اچھے
 سنا جیسے، جیسے کوئی انھیں چکا ہوا کر دینے والے سڑاب دیکھتے دیکھتے حقیقت کو پا لے۔ وہ ایک عجیب سی دنیا تھی۔۔۔ جھوٹی سی، محدود سی دنیا۔۔۔
 جس کے چاروں طرف "ہوم کے باس باؤز" نے نیپس کینج رکھی تھیں۔ وہ بنا صرف لڑکیوں کی دنیا تھی۔۔۔ مختلف شکل، رنگ اور ذہن کی لڑکیاں۔ سن لڑکیاں
 نیا لڑکیاں، بلکہ بھی لڑکا تھیں۔ اس کا سایہ بھی نہیں۔

جب وہ پہلے کالج کی اس نئی دنیا میں داخل ہوئی تو وہاں کی سرسبزیز نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ہر چیز سے مسحور ہو گئی۔ عمر کی جس سیر ہو وہاں کے ہر ایک شخص سے مل رہے تھے۔ اور اس کے من میں نئی نئی انگلیوں کی کوئلیں چھوٹ رہی تھیں۔ کالج کی اس خوبصورت سی نرالی دنیا میں رہنے میں تقریباً ہر روز کی ایسی حال تھا۔ وہاں کی ہر روز کی وہی ایک روٹی تھی۔ جس کو احمد عباس نے کئی سال پہلے ایک روٹے سے گھنٹہ گھر کے پاس ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے کیا تھا۔ وہاں کی ہر روز کی یہی ٹیڑھی گبر تھی۔ جس کو عصمت چغتائی نے سجا اور وہ دسڑوں کو سجا بننے کی کوشش کی۔ وہ سب بڑی اچھی روٹیاں تھیں۔ ان کی باتیں بڑی خوبصورت اور خواب بہت مہانے۔ خواب ہی خواب۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم پڑتا۔ کہ وہ کالج نہیں ہے۔ بلکہ ایک بہت بڑی سی خواب گاہ ہے۔ جہاں ہر روز کی کوئی نہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ بہت سی روٹیاں ایسی تھیں۔ جو سوتے جاگتے یہ خواب دیکھ رہی تھیں کہ آئندہ وہ نظم الیکٹریس بن جائیں گی۔ یا خود مینا دلوئی بننا اور مگر یہ بھی تو ان سے پہلے اسی کالج میں رہ کر یہی خواب دیکھ چکی تھیں۔ وہ بھی اسی کالج کی پیداوار ہیں۔ تو ان کے لئے یہ کون سی نا ممکن بات تھی۔ بہت سی روٹیاں ایسی تھیں۔ جو یہ خواب دیکھتی تھیں کہ ان کی شادی کسی بڑے افسر سے ہو جائے گی۔ اور پھر آرام سے وہ اپنی نفیس لادوں میں بیٹھ کر سیر کریں گی۔ کلبوں میں جائیں گی۔ اور چوڑے بڑے جلسوں میں انعامات تقسیم کریں گی۔ اور سوسائٹی میں ہر طرف ان کو لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اور بہت سی روٹیاں یہ خواب دیکھتی تھیں۔ کہ ان کو کوئی نہایت شاندار عہدہ کا بیڑہ ٹاپ لڑا جا رہا ہے۔ اور وہ دن رات حسین خیالوں کے ہلے میں کھوئی رہتی تھیں۔ اور وہ اپنے بابوں کو انٹرویو دینے والیوں کی طرح سب سے بڑی کی شکل میں بنا کر دیکھتی۔ ایک ہی رنگ کا لہذا، ساڑی، سینڈل۔۔۔ اور نئے فیشن کے کپڑے بھی پہنتی جس سے ان کے مایاتی دوست کی نگاہیں ملتی تھیں۔ اور وہ سارے کالج میں بہت ہی فیشن ایبل روٹیاں گنی جاتی تھیں کچھ روٹیاں پرائیویٹ پول بننے کا بھوت مائل تھا۔ وہ مٹی کی مٹی کی کتابیں پڑھتی تھیں۔ لیکن ان میں نہ تو کچھ سیر کر سکتی تھیں۔ تو ان کو یہ دنیا بدلی ہوئی ملے گی۔

ابھی ان ہی لڑکیوں میں سے ایک تھی، اس کے غمی وہی خواب تھے۔ جو ان ساری لڑکیوں کی آنکھوں میں ناچ رہے تھے۔ اس کے خیالات میں یہ لڑکی بھی رونا دکھانے لگی تھی۔ وہ خواب دیکھتی تھی۔ — ان کے نرائے، باگھے اور سنہری خواب

وہ بچہ ہی ایک خواب دیکھ چکی تو دوسرا خواب دیکھنے لگی کبھی وہ خواب دیکھتی کہ وہ چاند تاروں کی دنیا میں پرواز کر رہی ہے۔ لیکن آگے بڑھ کر وہ اپنے آپ کو اسی دنیا میں باقی تو اس کی آنکھوں میں کچھ اسی قسم کے دوسرے خواب جھلکانے لگتے۔
وہ لوں ہی خواب دیکھتی رہی۔

ایک سال بعد سال تین سال، اب وہ بی بی کے آخری سال میں تھی۔ وہ بی بی کے پاس کہنے لگے اس نے مجھ کو کہنا کہ خواب چاہے کتنے ہی حسین ہوں کہتے ہی تابناک ہوں۔ پھر بھی خواب ہیں۔ ان کی حقیقت ایک ماہر سعدیہ ہرگز نہیں جانتی۔ خوابوں کے جال ٹوٹتے ہیں نہیں جتنی کہ جب حقیقت کے چہرے سے پورے سرک جاتا ہے۔ اور انسان خوابوں کی دنیا سے نکل جاتا ہے۔ تو اس کو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

اور جب اس نے حقیقت کی نگاہوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو سچ سچ اس کو بڑی مایوسی ہوئی۔ بات ہی مایوسی کی تھی۔ وہ ساری راتیں جو غلامانہ بنا چاہتی تھیں۔ اور اس کا اٹھتے بیٹھتے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہ بن سکیں۔ ان کو ان کا موتہ ہی بدل سکا کہ وہ اپنی امانت کے جوہر دنیا کو دکھا سکیں۔ وہ ساری راتیں جو ان کی اسے ایسے ایسے افسروں سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے سارے خوابوں کے محل ان کی آن میں زمین پر آئے۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ اسان افسر ہوتے ہی کہتے ہیں۔ اور جو ہوتے ہی ہیں۔ وہ بھلا ان راتوں سے شادی کیوں کرنے لگے۔ اور پھر زندگی سے تنگ آکر وہ دنیا یا تو ۱۵۰ روپے پر بی بی سے لے کر کرنے کے بعد کسی اسکول میں اسانی ہو جاتی ہیں۔ اور جو راتوں سے اپنا دماغ رات ہی میں لودھیکہ بدلتی ہیں یا کسی لوگ باکس تھوڑا کر دیکھ کر سے شادی کر کے زندگی بھر کے لئے بد ہو جاتی ہیں۔ اور وہ راتیں جو فیشن کی دلدل میں تھیں۔ اور اپنے محبوبوں کے لئے سب سے کون کون سے فیشن اختیار کرنے والی تھیں ان کا حال تو اب بھی پرانے پرانے زمانے کو محسوس ہوتا ہے۔ وہ سب فیشن جو اپنی اپنی جگہ تھیں وہ ہر گز ان کی اپنا نہیں تھے۔ اب ان پر وقت راتوں کو کون بتائے کہ یہ سب فیشن کی کدھ ساریاں ساریاں دلدلوں کے مچھلی تھکنڈے ہیں۔ وہی (Consumer's sovereignty) کو کنٹرول کرتا ہے۔ اور ساری انٹیکول راتوں کو یہ معلوم کر کے کتا کہہ جاتا ہے کہ کتا بول کی دنیا کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے۔ بہت لمبی چوڑی اور یہ دنیا بہت مشکل سے بدے گی۔ اسان سے کوئی شادی کرنے کو شام ہی تیار ہو کیوں کہ ان سے شادی کرنا تو اس سے شادی کرنا ہے۔

تو یہ تھیں وہ ساری راتیں اور ان کے ٹوٹے ہوئے بہانے خواب یہ تھیں وہ ساری سہائیں، رہائشیں اور شہنائیں جن کو ان کے خوابوں کی تعبیر نہ مل سکی، جن سے دلوں میں گدگدوں اور تناؤں کا دیا ٹٹا ٹٹا کر بھج گیا۔ اور وہ کچھ بھی نہ کر سکیں۔ وہ ساری راتیں کچھ نہ کر سکیں جو ان کی زندگی میں بنانے کی گئی کرنا چاہتی تھیں۔ وہ بچہ بھی کچھ نہ کر سکی جس کو بوسیتی سے انتہائی شغف تھا۔ وہ شہلا بھی کچھ نہ کر سکی۔ جو سب سے بڑا چاہتی تھی۔ اور کتا جو شاعر بننا چاہتی تھی۔ وہ بھی کچھ نہ بن پائی۔ جس کے ہاتھوں سے ستار چھین کر چھیک دیا گیا۔ شہلا کا برش توڑ دیا گیا۔ اور حالہ کی ساری جوانی نعلین کا لچ کی چھارہ یاری میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ سب مجبور تھیں۔ وہ کیا کرتیں۔ بچہ نے کس شادی کر لی اپنے ماں باپ کی مرضی سے، اور پانچ راتوں کی ماں بن گئی۔ شہلا کا برش ٹوٹ گیا۔ تو اس کا دل بھی ٹوٹ گیا۔ اور وہ بھری جوانی میں اپنی شام کا تصویریں بنائے بغیر اپنی راتوں کو گھر میں رہ گئی۔ حالہ پر چاری نے شاعری چھوڑ دی اور پڑی کوششوں کے بعد ایک معمولی سے راتوں کے مد سے ہی معمولی سی خواہ پر غلام ہو گئی۔ لیکن یہ دنیا کیسی ہے۔ جہاں انسان جو کچھ چاہے وہ نہ کر سکے۔ اس کے غری جو ہر کھینچنے پائیں۔ اس کی آواز دھڑوں کا کتا بدایا جائے، دنیا کیسی ہے؟ وہ دنیا کیوں ایسی ہے کوئی بتائے؟

وہ بھی ان ہی راتوں میں سے ایک تھی۔ اس کی بی بی نے پاس کر خشک کی تمام پونجی غصی جی کیا۔ چند بیکار دن، کچھ اسی سے پہلے

[illegible]

وہ دیکھ کر پاپ ٹکٹ میں ہی کھڑی تھی۔ وہ دیکھ کر اسی ٹکٹ کی کائنات کو دیکھ رہی تھی۔ اور سوچے چلی جا رہی تھی۔ گویا، آج ہی وہ سب کچھ سوچ کر نکدہ ہو گئی۔ اسی کے لئے کچھ بھی سوچنے کو باقی نہیں رہ جائے گا۔ اتنے میں اس کی دکانی دستچم کے نیچے سے گزری وہ بیت بلب بلب کر گاتی رہی جا۔ جیسا تھی۔ جین جین جین پائل باجے۔ کیسے جاؤں پی سے ملن کو۔ لاج کی ماری سروں کوں تین کر۔ دل ماما، بھین بھین..... وہ سوچ کے ناشتہ کے لئے بندھ جانے جا رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کانا گاتی ہوئی وہ نکل گئی۔ دیکھتے دیکھتے لڑکی لڑکی پائل کی بھینکار سے انا خوف لگتا ہے۔ تو اس کو اتار کچوں بین تھی۔ سوچا، وہ پوچھ رہی تھی باناس کی طشت۔ چلی گئی۔

یونہی سنی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کی زندگی کے وہ دو سال اُک فرس کی طرح بچھ گئے جو اس نے وہاں گزارے ہوئے پورسٹی کے سارے بچے اپنے بچے جیسا کہ وہ اپنے کنبوں کی طرف اشارہ کرتی اس کو اپنی طرف جھانک گئی۔ اور اس نے اپنی یونیورسٹی کی زندگی کے متعلق سوچا شروع کیا۔ وہ سب وہ بینس کالج کی چارہ دیوہی سے نکل کر یونیورسٹی میں داخل ہوئی تھی۔ تو اس کو عجیب سا لگا تھا۔ یونیورسٹی کی دنیا بھی اس کے لئے ایک نئی دنیا تھی۔ وہاں صرف ایم اے کے کلاس ہوتے تھے۔ اور ساتھ لڑکے بھی پڑھتے تھے۔ لیکن لڑکیوں کی دنیا میں وہ کہ لڑکیوں کی اس دنیا میں آکر وہ ہر بات میں کافی عجیب محسوس کرتی تھی۔ ہر طرح لڑکے، بہت سارے لڑکے، اور لڑکیاں بس گنتی کی چند اور بھی ہر ہر قدم پر یونیورسٹی کے نافذ کردہ اصولوں کی پابندی میں رہتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہاں علی گھنٹوں میں بیٹھو۔ اس کو یہ قانون اور فاضلہ سخت برے لگتے کیونکہ ان ہی پر چلتے چلتے اس کی زندگی بہت گنی تھی۔ یہیں سے لے کر بی اے پاس کرنے تک ساری ستمیاں اور ڈسپلن اس نے بھیلے تھے۔ اور یہاں یونیورسٹی میں آگے بھی ان کے عجیب گناہیں جیسا کہ وہ پہلے ہی سے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ کیونکہ اس کے سلسلے خواب ٹوٹ چکے تھے۔ لیکن وہ ایک کنگھی می اے کے لئے ایم اے کرنے چلائی تھی۔ جس سے شاید اس کے بڑے ہوئے کام بن جائیں۔ شاید اس کی زندگی کوئی نئی کمر لے اور اس کی ساری زندگی وہاں لے سکیں۔ لیکن یہاں بھی کچھ نہ ہو سکا۔ وہاں جنے لڑکے تھے۔ سب لڑکیوں کے بھوکے۔ تمام استاد صرف چند ایک کو چھوڑ کر، لڑکیوں کے بھوکے ہوئے تھے۔ نئی نئی مہربانیاں چھو رہی ہیں۔ لڑکے کہتے ہیں کہ یہ لڑکیوں سے زیادہ کہتے ہیں کہ اپنے گھر پر بلا کر پڑھ لو بیت سے لوگ جو اس سے بیت پیسے اسی مضمون میں ایم اے کر چکے تھے۔ اور اب اسی مضمون کے سیکرہ ہو گئے تھے۔ اس کے پاس وہ نہ ہی آتے اور نہ ہی بت مہربانی کے ساتھ پیش کرتے۔ اور کہتے کہ ہمارے ایم اے کے سامنے لڑکیوں سے لو۔ تم کو یقیناً فرسٹ کلاس مل جائے گی۔ اور جانے کیا کیا۔ ایسے بھی کیوں سے میں ہم تھا۔ اسے لڑکیوں کا ہم وہ بھی لڑکیوں سے نہیں بتا کر کہہ سکتے۔ کیا ہم نہ بچہ ہیں۔ ہمارے جاننا میں عقل نہیں ہے۔ لیجائیے اپنے لڑکیوں سے مہربانی کر کے۔ وہ اپنا دانت پیس کر کہتے اور سوچتی کہ یہ مرد بھی کہتے غیر ذمہ دار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یوں تو ایک طرف سے فرماتے ہیں۔ کہ عورتیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائیں۔ اور اپنے آپ پر جھوٹ کر دیں۔ اور زندگی کی ہر راہ میں آگے بڑھیں لیکن خود مرد تو ان کو تقریباً کہہ کر دیں گے۔ جنہیں لڑکیوں کو وہ طعنے کی طرح جیسے میں یہاں ان کے کام سے خود بخود کہہ کر سناں کہ کہ سناں میں چھوڑا دیں گے۔ وہ جب اپنے کالج کی میگزین کی آڈیٹر بھئی تھی۔ تو اس کو کوئی بھی کام نہیں کرنا پڑا تھا۔ سدا کام اس کے بھائی کے ایک دوست نے جو یونیورسٹی میں لکچرار تھے کہہ دیا تھا۔ اور نام اس کا وہ تھا۔ اسی وجہ سے وہ مچوں سے سخت خوف کھاتی تھی۔ اور ان سے بچنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ کہ یہ مرد لڑکیوں کو ہر نام کہہ دیتے ہیں۔ اور لڑکیوں کے پاسی مردوں کی باتوں کی باتوں میں بے بس اور لاچار ہوتی ہیں۔

اس نے بوڑھی میں دھلی تک پڑھا اس درمیان میں اس کی زندگی میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی مگر اس کو ایک عرصہ تک اس کو مزہ دیا اس کو صرف سب سے بڑا اگر تا قہر لدا۔ جو اس کے ہاتھ میں آئے کی کوشش کرتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ایک عرصہ تک اس کو اس کی کچھ ساتھی دکھیں ایک ادبی جلسے میں سے نکلتی تھیں۔ جہاں میں کچھ بڑے بڑے ادیبوں سے ملے گا۔ وہ جلسوں کے جلسے کا تھا۔ کبریا وہی ایک جلسہ جس میں وہ نکلتی مدد وہ جلسوں سے بھاگتی تھی۔ اور اس کی اس حرکت پر اس کی ساتھی روکیں کہیں کہ اس کا بھی وہ دن نہ ملے غصی ہوتی جا رہی ہے۔

یہ خود سٹی کے وہ دو بھائی بھی گزرتے۔ کالج کے دنوں میں اس کو جوانی و نیا سے چمکاتی تھی۔ اس کو اس دنیا کی غلطیاں دیکھنے سے نفرت ہوئی تھی وہ اب اب بھی بڑھ گئی تھی۔ اس نے کہ جب وہ ایم اے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کو پوری امید تھی۔ کہ ایم اے کے بعد اس کو کسی اعتبار میں کس کالج میں پڑھیں اور کئی بڑی جگہ مل جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے بیٹ باقی پیراڈیٹ سفارشیں کیں تب جا کر وہ ایک سماجی اسٹریٹ کالج میں ڈپٹی سرپرست ہو گئی۔ اس نے اس کو فہمیت جاکھوں کہ اس کی دوسری ساتھی روکیاں اسی تک بجا رہیں اور اس کا شرم میں تھیں۔ کہ اگر تو کی نہیں ملتی تو کم سے کم شادی کر کے اپنا ساشی مستقبل محفوظ کریں۔

عدست مل جانے کے بعد اس نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ سوچا کہ نہیں ہوا۔ ذاتی ہی کیا کم ہوا کہ آئے دن کی دوسری صاحبہ اطمینان اور بے پیہ کی پریشانی ڈاکم ہوئی۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اب زندگی میں کچھ بڑا پیدا ہوا۔ کچھ سکون نصیب ہوا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑھ کر سب کچھ بڑی نگہیں باتوں کی طرف لپکتے آجی چاہتا ہے۔ ہی تو یوں ہی چاہتا ہے۔ اس کا کام ہی ہے۔ کہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہا ہے جا رہا۔ لیکن یہ کیا مزہ ہے کہ انسان اس کے دھوکے کھاتا ہی ہے اور ابھی کہی تو وہ سوچتی کہ ٹیلی دن کی بچتی ہوئی گھنٹیوں اور یہ دل کی تیزی سے بھاگتی ہوئی گاؤں کی گھنٹیوں اور کانفرنسوں اور پانچ سالہ پانچ کے ملک میں بھلا کس کو فرصت ہے کہ وہ بڑے بڑے مسائل پر غور کرے تو ہمارے ہمارے مذہب پر کھڑے کیا ہیں؟ یہی نا کہ ملک کے بڑے بڑے مسائل پر اتنے ہی بڑے ہمارے پر سوچ بچار۔ تاہم کچھ باتیں ایسی تھیں جن کی طرف اس کا دھیان چلا ہی جاتا۔ ان سب باتوں میں سب سے اہم بات یہ تھی۔ کہ اس کی زندگی کا انجام کیا ہے۔ جو اس قدر بے مصروف تھا۔ جہاں وہ اپنے اصل سے کچھ اس طرح مایوس اور بے یار تھی۔ کہ کبھی کبھی تو اس کے من میں آتا کہ کاش یہ دنیا ایک گیند ہوتی جس کو وہ نندے سے ٹکرائے گا کہ پامال کر دیتی وہ غصی کی تلاش میں تھی۔ جس کا اس کی زندگی کی شاہراہیں کوسوں کو پی پتہ نہیں تھا اس نے اس کو تلاش کرنا شروع کیا۔ اس نے ہر وہ کام کیا جس میں اس کی تھکی ہوئی کٹا کو خوشی مل سکے۔ اس نے ناول پڑھنا شروع کیا۔ گھنٹوں ریڈیو کے پاس بیٹھی رہتی۔ بیکہ کنٹری سنس مینٹا۔ کیجئے جاتی۔ لیکن سب سے تھوڑا۔ اسی مال نے اس سے کہا کہ شادی کو لا۔ لیکن کس سے؟ یہ نہیں معلوم اس کی ماں سمجھتی تھی۔ کہ کوئی نہ کوئی بڑا کام اس کی نگاہ میں مزہ ہو گا۔ لیکن بڑے کام آتے ہی اس کی زبان پر یہ شعر۔

یہ مل رہی ہے۔ مرے ضبط کی سزا مجھ کو!

کہ ایک ذہیر سے بس پر ہے شباب مرا

آ جاتا اور وہ شادی کے منے پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے لگتی۔ وہ شادی کرے۔ لیکن اس سے بڑی ایک بات بھی تو ہے۔ جس کی شادی اس پہلے ہوئی چاہیے۔ لیکن اس کی شادی نہیں ہوتی۔ وہ اس سے عمر میں سال بڑی تھی۔ لیکن جب اس کے ماں باپ اس کی شادی لگتے تو بڑے والے اس قدر کثیر رقیں مانگتے کہ ان کی صحت بھوٹ جاتی۔ دو ایک جگہ کچھ سستے رٹے ملے تو اس کی بہن نے خود انکار کر دیا۔ وہ بھی کہہ کر کہ وہ ایک

نیا وہ معصوم چہرے سے یہ جانپ گیا تھا کہ اس کا نیم کلاسی کا ہے۔ اور اس میں جذبات موجزن ہو ہی نہیں سکتے تاہم وہ اس کو چھڑتا رہا۔ اور اس کو باہیں گھٹا۔

ایک دن امتحان کے زمانے میں وہ اس سے نہ ٹھکرایا۔ اس کو کوئی کتاب لینی تھی۔ وہ پہلے تو بہت گھبراہٹ کا اس کی باتیں کرے گی۔ مگر وہ آیا اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ امتحان کی تیاری کے متعلق اس سے گفتگو کرنا رہا۔ وہ اس دن اس کو بہت اچھا لگا۔ اس سے اس نے کہا کہ وہ دوسرے دن آکر کتاب لے تو اچھا ہو۔ کل تک کتاب۔ فارغ ہو جائے گی۔ وہ دوسرے دن آنے کا وعدہ کرتے چلا گیا۔

دوسرے دن وہ نہیں آیا۔ شام کو آدھی آٹنی تھی۔ وہ آدھی ختم ہونے کے بعد بھی بڑی دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی شام ڈھل گئی رات آگئی۔ لیکن وہ نہیں آیا۔

پھر امتحان کے بعد اس سے ملے نہیں۔ ہر اپنے گھر چلا گیا۔ بنانے کہاں ہو گا۔ بیچارہ اس وقت کس حال اور کن مصیبتوں میں ہو سکتا ہے۔ کہ نہیں کھڑکی کر رہا ہو۔ یا اس کی طرح کسی اسٹیل ہاؤس میں اپنے بیکار دن گزار رہا ہو۔ اور وہ سس کو بھول چکا ہو۔ بین وہ اس کو نہیں بھول سکی۔ وہ آج بھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ کاش ان جھکے ہوئے بادلوں کے سائے میں ان ٹنڈی ٹنڈی ہواؤں کے اوغلوں کے ساتھ وہ آجائے۔ وہ آکر اس کو خوابوں میں پکارنا شروع کرے۔ تو پھر زندگی کی سوکھی ٹہنیوں میں پھرنے کو پنپلیں چوٹ نکلیں اور زندگی کے دریاں واسے پھر سے سوز جائیں۔



اندھیرے اُجالے

منفرد فنکار ہاجرہ مسرور

کے افسانوں کا مجموعہ

تین روپے



چند روز اور

ممتاز افسانہ نگار خدیجہ مستور

کے افسانے

تین روپے

درودیلوار

اردو کے جلیل القدر ادیب

احمد ندیم قاسمی

کے افسانے

ارٹھائی روپے

مکتبہ انکسور لاہور

کاجی گھبرا اٹھتا تھا۔ تیزہ چھت پر چلی جاتی تھی۔ مگر
 وہاں بھی تو اُسے مکوں نہ ملتا تھا۔ وہاں بھی بڑیوں کے اُس
 ڈھانچے کو جب وہ مسلسل کھانتے رہے دیکھتی تھی۔ تو
 اُس کا جی چاہتا تھا۔۔۔ کہ اُس تاریک مکان اور تنگ گلی میں
 سے بھاگتی ہوئی چلی جائے۔ اور درہ خیبر پہنچ کر علی مسجد
 کے قریب کے ریتاے راستے پر سے ہوتی ہوئی۔۔۔ سائے
 کی پہاڑی کو عبور کر کے کمرہ پہنچ جائے۔ اپنی شاداب
 انداز دنیا میں۔۔۔ اے مگر وہ وہاں سے کیوں نہ فوراً
 بھاگ آئی؟ اُس کے دل نے سوال کیا۔ اور پھر سے یوں
 لگا۔۔۔ جیسے وہ پشاور کی اُس تنگ گلی والے تاریک مکان
 کی بالائی چھت پر اُس شکستہ چارپائی پر پڑی ہے۔۔۔ اور
 بڑیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔۔۔ اور مسلسل کھانس رہی ہے
 ۔۔۔ اُس کے ذہن میں دھواں سا اٹھتا۔۔۔ انداز اُس کی
 آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا چھایا گیا۔۔۔ مگر وہ فوراً منہ
 گئی۔۔۔ اُس نے آنکھوں کو روز در سے ملا۔۔۔ کتنی
 عجیب ہیں میں۔۔۔ عجیب عجیب خیال دل میں لاتی ہوں۔۔۔ کیا
 کوئی یہ نہیں کھاتا نہیں کرتا؟ کسی کا رنگ یونہی زرد نہیں پڑ سکتا؟
 زرد سا تیز تازہ گلاب کے پھول کی طرح تھی۔۔۔ گلاب وہ
 کتنی کمزور اور زرد ہو گئی ہے۔۔۔ وہ بیماریہ تھوڑی ہے
 ۔۔۔ اور سیلاب کا مضطرب دل تسکین سے پا گیا۔۔۔
 سامنے کے پہاڑ پر سے سامنے ڈھلنے لگے تھے۔
 وہ اٹھی۔۔۔ اندر سے کوہِ خمی کے ساتھ بازو دھا۔۔۔

اور دھن کنوئیں میں گر دیا۔۔۔ ڈبل تیزی سے پانی کی طرف
 پھینکے لگا۔۔۔ چرخہ لہنے لگی۔۔۔ اور ڈبل پانی میں
 باڈیا اور ڈوب کر پھر اٹھرا۔۔۔ وہ جھک کر کنوئیں میں
 بیٹھنے لگی۔۔۔ اس کی نظریں تاریکیوں سے گزر کر گہریں میں چمکتے
 ہوئے پانی پر جا پڑیں۔۔۔ جس کی سطح پر کئی ہنسور پیدا ہو چکے تھے
 ۔۔۔ ہنسوروں کو غور سے دیکھنے لگی۔۔۔ سب وہ زور۔۔۔
 زور سے کھانسی تھی۔ تو اس کی نظریں کئے سامنے بھی تو رہیں
 قہر کے دائرے پیدا ہوتے ہیں۔۔۔ مگر اب ایسا کیوں
 ہوتا ہے؟ پہلے تو وہ اگر کبھی کھانا کرتی تھی۔ تو ایسا نہیں ہوتا کرتا
 تھا۔ کیا بیمار اور کھانسی والی بیماری میں ایسا ہوتا ہے؟
 اور اس کا چہرہ پھر فکر مند ہو گیا۔۔۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر
 چمکی پڑے تھے۔ اس نے اپنا سر ان کے درمیان رکھ دیا۔
 ۔۔۔ اس کی آنکھوں سے کئی آنسو نکلے۔ اور چرخہ پر چسل گئے۔
 ۔۔۔ سنگلاخ سرزمین کی ہر اکا ایک تیز جھبھونکا آیا۔ اور اس کے
 چہرے اور ہاتھوں کو مس کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔۔۔ اور اس کے
 ہاتھ وہ پٹے کا پلہ لہرایا۔ اور لہرا کر اس کے سر پر زور سے جا پڑا
 ۔۔۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اسے نیچے جھٹک دیا۔۔۔ اور
 اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا۔ کہ اس بیمار کی بیوی کہا کرتی
 تھی کہ اگر اس بیماری کے آغاز میں مریض کو تازہ ہوا اور روشنی میسر
 آجائے۔ تو بیماری جاتی رہتی ہے۔۔۔ اور اسے تازہ ہوا اور
 روشنی میسر ہے۔۔۔ ! اور اس کی بیماری پُرانی بھی نہیں ! اور
 اس کے چہرے پر مسرت کی لہریں چمک اٹھیں۔۔۔ ہڈیوں کا
 ڈھانچہ نہیں سننے لگی۔ اس کی آنکھیں باہر کر نہیں نکلیں گی۔ اس کا رنگ
 بندوں کے پھول کی طرح نمدار نہیں ہو گا۔۔۔ اور وہ چار پائی پر
 پڑے پڑے چوبیس گھنٹے کھانا نہیں کرے گی۔۔۔ اور وہ
 آزاد فضاؤں کی صاف ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگی۔
 اور اپنی گھٹی اور لمبی پلکیں اٹھا کر آزاد فضاؤں میں چمکنے والے سورج

کو اس انداز سے دیکھنے لگی۔ گویا وہ ابھی اس کی ساری روشنی اپنی
 آنکھوں میں جذب کر لے گی۔۔۔ اور جب اس کا ہاتھ چرخہ پر سے
 پھسل کر کنوئیں میں لنگی ہوئی رستی سے جا لگا۔۔۔ تو اسے جیسے کوئی
 بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔۔۔ اس نے گھڑیوں پر نظر ڈالی اور
 جلدی جلدی چرخہ گھومنے لگی۔ رستی چرخہ کے ساتھ لپٹی جانے لگی۔
 اور پانی سے بھرا ہوا ڈبل اٹھلا اٹھلا کر اوپر آنے لگا۔
 جب بیلا نے وہ دونوں گھڑیے پانی سے بھر لئے۔ تو چرخہ
 سے رستی کھول کر ڈول میں ڈال دی۔ اور ایک گھڑیے میں دایاں
 ہاتھ لگا دیا۔ اور اسے اوپر اٹھایا۔ اور دایاں ہاتھ اس کی پُشت پر
 رکھ بیک بھٹکے ساتھ اسے سر پر رکھ لیا۔ مگر اس کی دونوں
 ہاتھوں میں سخت لہجہ نہ رہی۔۔۔ وہ چونک گئی۔ اور اس
 کے چہرے پر سے خوشی کی لہریں غائب ہو گئیں۔ گھڑا اٹھا
 وقت اس کی ہاتھیں کاپنے کیوں لگی ہیں؟ اس میں اتنی کمزوری کیوں
 پیدا ہو گئی ہے؟ کیا اس کی بیماری پُرانی ہو چکی ہے؟
 کیا وہ۔۔۔

سامنے کے پہاڑ پر سائے گرے ہو گئے تھے۔
 وہ اس دل سے ندا جھکی۔ اور دائیں ہاتھ سے دوسرا گھڑا
 اٹھالیا۔ اور دایاں ہاتھ پھیلا کر اسے بائیں نجل میں لے لیا۔ اور دائیں
 ہاتھ میں ڈول اٹھالیا۔۔۔ اور فکر میں ڈوبی ہوئی گھر کی
 طرف جانے لگی۔

چلتے چلتے اس کی نظریں یہاں سامنے اٹھ گئیں۔۔۔ دور
 بل کھاتی ہوئی چمکندہ دیوں پر باغی شاہ تیز تیز قدم اٹھائے چلا جا
 رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھول گئی۔ اس ساری دنیا کو بھول
 گئی۔۔۔ اندہ گنگنا تے ہوئے چشموں کے کنارے۔۔۔ پر کھو
 گئی۔۔۔ اور اس کے خمیدہ اندہ مترخ لبوں پر مسکراہٹیں جاگ
 اٹھیں۔ ان مسکراہٹوں میں گنگنا تے ہوئے میٹھے پانی کے ٹھنڈے
 چشموں کی چمک تھی۔ اس کا جی چاہا۔ کہ وہ زور سے پکارے۔۔۔

بھاری پتھروں کے دامن میں اگا کرتے ہیں۔۔۔ اور جب پتھرینے
دیس پر سنسناتی ہوتی برائیں چلنے لگتی ہیں۔ تو یہ بڑی بڑی چٹانیں
اور بھاری بھاری پتھر اپنی جگہوں سے کھسک جایا کرتے ہیں
اور مسکراتے ہوئے پھول۔۔۔ اُن کے نیچے دب کر مر جاتا
جایا کرتے ہیں۔!!

بیلا نے گھڑا زمین پر رکھ دیا۔ اور خود چپ چاپ زمین پر
بیٹھ گئی۔ اُس کے دل کی دھڑکنوں میں ایک نیا غم بس گیا
تھا۔ اُس نے باغی شاہ کی طرف بالکل نہ دیکھا۔ وہ پتھروں کی
تاب نہ لاسکتی تھی۔ البتہ سبب اُس نے کچھ دیر بعد خیریت پر ایک
نگاہ غلط ڈالی۔ تو اس کے احساسات میں سمندر کے طوفانوں جیسا
اضطراب چھا گیا۔ سمندر کا پانی سبب طوفانوں سے ہمکنار ہوتا
ہے۔ تو اپنی راہ میں حائل بڑی بڑی چٹانوں سے بھی ٹکراتا جاتا ہے
بیلا خیریت سے ٹکڑا جانے کو تیار ہو گئی۔ اُس نے اپنے
ہاتھ پاؤں میں گرمی سی محسوس کی۔ اور ایک دم چا پائی پر سے
اٹھی۔ اور کوٹھڑی کی طرف لپکی۔ اور ایک کمرے میں گئے
ہوئے ڈھیر میں سے حواد کے دانے چھوٹی میں بھر کر لے آئی۔
اور جس کے چھپرتے سفید بکلی میں ڈال کر بکلی زرد زرد سے چلانے
لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے دانے پس گئے۔ اور
بڑے کا ڈھیر ٹگ گیا۔

بیلا کے حلق میں جیونٹیاں رہنے لگیں۔ مگر اُس نے ہونٹ
دانتوں سے دبائے۔ اور لپک کر مٹی کے مٹ میں سے
کٹورہ بھر لائی۔ اور جلدی جلدی آٹا گوندھنے لگی۔ مگر اب کے
وہ باغی شاہ کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی کہ کہیں اُس کی آنکھوں میں
اُنڈے ہوئے آنسوؤں پر اُس کی نظر نہ پڑ جائے۔ اور اُس کی زبان
میں چٹانیں کھڑی ہو جائیں۔

باغی شاہ نے بیلا کو اس پھرتی سے کام کرتے ہوئے پایا
تو کئی بار سیدالہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ گھر ہر بار گھبرا کر

باغی شاہ۔۔۔ گرایا ممکن بھی ہے؟ کوئی سن سے تو ہوا کیا
کہے گا؟ اور مارے شرم کے اُس کی پیشانی پر پسینے کے کئی قطرے
لہڑنے لگے۔۔۔ اور باغی شاہ ادنیٰ نیچی پلڈنڈیوں پر سے ہوتا
ہوا غائب ہونے لگا۔ بیلا کے قدموں کو غیر معمولی طاقت نے
جیسے چھو لیا۔ چکر کھاتی ہوئی پلڈنڈیاں پیچھے کی طرف بھاگنے لگیں۔ اور
وہ تیزی سے گھر کے قریب ہوتی گئی۔

دروازے کے قریب پہنچی۔ اور چاہا۔ کہ دایاں پاؤں اندر
رکھوں۔ کہ اُسے خیریت کی آمان سنائی دی اور اُس کے پاؤں دروازے
کے باہر ہی ٹک گئے۔

خیریت باغی شاہ سے باتیں کر رہی تھی۔ بیلا کی باتیں!! اور
بیلا دروازے کے باہر کھڑی کھینچی رہی۔ اور اُس کے
خمیدہ اور سرخ لبوں پر مسکراہٹیں سرگئیں۔ اور اُسے ہی محسوس
ہونے لگا۔ کہ خیریت اُس کا گلا دبا رہی ہے۔ مارے تکلیف کے
اس کا جسم زور سے کانپا۔ اور سر پر دھرا ہوا گھڑا زور سے لرزا
اور لرز کر زمین پر آ رہا۔ اور ٹوٹے ٹکڑے ہو گیا۔

باغی شاہ جلدی سے دروازے کے قریب آ گیا۔ بیلا نے
اُس کی طرف دیکھا۔ اور ایک بار پھر وہ اس سفاری کافات
کو بھول گئی۔ اور اپنی جنت میں داخل ہو گئی۔ اور باغی شاہ
کے قدموں میں مسکراہٹوں کے پھول برسانے لگی۔ "تم"۔ باغی شاہ
نے ایک پتھر بھینکا۔ اور اندر لوٹ گیا۔

وہ کتنی نادان ہے۔۔۔ وہ سوچنے لگی۔ اور مایوسی کے
ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر سنہری پھیل گئی۔ اس ہنسی میں اپنی
نا بھئی کا احساس رچا ہوا تھا۔

بیلا نے سچ مچ بڑی نادانی کی تھی۔ وہ جان گئی تھی۔ کہ
باغی شاہ سب کچھ جان چکا ہے۔ اور پھر بھی اُس نے اُس کی
راہ میں پھول برسائے!! شاید پتھر بیٹھ بیس کی عمرت یہ
بھول گئی تھی۔ کہ اُس کے بیس میں پھول بڑی بڑی چٹانوں اور بھاری

نظر پر اتنی رہی۔

بیلہ آٹا کو زندہ رکھی۔ تو تنور کی طرف گئی۔ اُس وقت اُس نے ٹھیکوں سے خیریت کی طرف دیکھا وہ ٹھیکہ سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور بیلہ کا جی چاہا کہ وہ طنز سے

بیلہ نے تنور کے منہ پر پڑا ہوا مٹی کا گھڑا اٹھا کر زمین پر رکھ دیا اور تنور میں اُسے ڈالنے لگی۔ اور ماچس جلا کر تیلی تنور میں پھینک دی۔ تنور میں دھواں مٹا بھر گیا۔ اور پچھلے حصے میں اناری بک کا ایک تیز دیا بل ٹٹھا۔ اور پھر اُس کی ٹک لگی۔ جب تو گرم ہو گیا۔ اور آگ بجھ گئی۔ تو وہ روٹیاں بنا بنا کر نکالنے لگی۔ روٹیاں لگاتے لگاتے اس کے حلق میں عارش سی ہونے لگی۔ اُس نے ہرنٹ بھیجے۔ اور اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔

صوبہ غریب ہونے لگا۔ اور آسمان پر سرخیاں پھیل گئیں۔ اور رندہ کی لڑج اس کے سر میں دوہرنے لگا۔ اور اُس کا جسم گرم ہونے لگا۔ مگر طوفان تو بھاری بھاری تپھروں کو بھی بہا کر لے جاتے ہیں۔ فوراً ہی اُس کے ہاتھ پھر حرکت کرنے لگے۔ جب روٹیاں پک چکیں۔ تو اُس نے پانی کا بھرا ہوا کلوڑہ بھی روٹیوں اور پیاز کے ٹکڑے کے ساتھ چمگی میں رکھ دیا۔ اور چنگیر بنی شاہ کے آگے لاکر رکھ دی۔ اور خیریت سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اور جوار کی روٹی کے ساتھ پیاز کھانے لگی۔ ایک دم اُس کے حلق میں سوئیاں چھپنے لگیں۔ اُس نے جھٹ پیالہ اٹھایا۔ اور پانی کے کئی گھونٹ پیئے۔ مگر اُس کے حلق میں سوئیاں براہِ جہت رہیں۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اُس کے لب دیا ہو گئے۔ اور وہ زور زور سے کھانے لگی۔

خیریت نے جوار کی روٹی سے ذرا لقمہ تے توڑتے باغی شاہ کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ اور بیلہ نے جو گھبرا کر

باغی شاہ پر نگاہ ڈالی۔ تو اُس کی آنکھوں کی چمک میں بڑی بڑی چٹانوں کے سایوں کو بدستور موجود پایا۔

”فل احمد کھائے تھے۔“ اُس نے چٹانوں کو اپنی راہ سے ہٹانے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ باغی شاہ نے کہا۔ اور اُس کے ہاتھ کی طرف دیکھنے لگا۔ بڑھی خیریت کے چہرے پر طنز بھری مسی پھیل گئی۔

آسمان بھلا تھا۔ اور شہر تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ تمام رات جاگتی سی۔ اُس کے حلق میں چیرہ نیاں رنگنی رہیں۔ پھر وہ ہرنٹ پھینچنے لگی۔ اُس نے باکل اچھی ہوں۔ میں باکل اچھی ہوں۔ باغی شاہ میرا ہے۔ مگر وہ سرے ہی غصے سے حسرت سے بھری ہوئی نظریں اپنے اند کو ڈالنے لگی۔ مایوسی اور رخ نے اُس کے محرمات کو بالکل بے قابو کر دیا تھا۔

”تم پانی بھر کر لاسکوٹی؟“ دو سرے دن خیریت نے طنز سے کہا۔

”ہاں۔“ بیلہ کے بچے میں ایک شکست خوردہ انسان کی ضد کی سی کیفیت تھی۔ اور اُس نے فوراً ایک کھڑا کھڑا کہ سر پر رکھا۔ اور دو سرانجل میں دبا۔ اور دائیں ہاتھ میں ڈول اور دھکی اٹھالی۔

”دیکھنا کہیں بھر گھڑا توڑ نہ دو۔ میرے بیٹے کی حرام کی کمائی نہیں ہے۔ خیریت نے جیسے بیلہ کے مستقبل کے متعلق ایک پہیلی کہی۔ اور بیلہ کا جی چاہا۔ کہ وہ کہے۔ کہ یہ پہیلی میں جانتی ہوں۔ تم بہت ظالم ہو۔ مگر اُس کے حلق میں عارش ہوئے۔ لگی۔ اور وہ ہرنٹ دانتوں سے دبا کر گھر سے نکل گئی۔

”تھہر میں بھی آتی ہوں۔“ گل کے بائیں طرف کے ایک دروازے میں سے جڑا نہ بھانکتے ہوئے بولی۔

بیلہ روک گئی۔

”ڈول اور دھکی تو ہوگی۔ تمہارے پاس؟“ سوئے گھڑے اٹھا

دروازے میں سے بولی۔

”ہاں“

”مربانہ گل میں آگئی۔ اور وہ دروں گل سے نکل کر اونچی نیچی پگڑندہوں سے ہوتی ہوئی چپ چاپ کنوئیں کی طرف جانے لگی۔“

”میں پشاد دربار میں ہوں۔“ مربانہ نے سکرت توڑتے ہوئے کہا۔ اُس کا ہجر سرت اُگیز تھا۔

”بھائی کے ہاں“

”ہاں“

”نہ جاؤ تم۔“ بیلا نے مضطرب ہو کر بولی۔

”کیوں؟“ اُس نے تعجب سے پوچھا۔

”مہاں بیماری ہے۔ لوگوں کو بخار ہوتا ہے۔ وہ کھاتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔“ وہ آہستہ سے کھانسی کر بولی۔

”میرا بھائی تو دہاں مدت سے رہتا ہے۔ وہ تو بیمار نہ ہوا۔“

”کیا کرتا ہے۔ تمہارا بھائی دہاں؟“

”آئیے کے ملاقاتی میں کبابوں کی دکان ہے اُس کی“

”جانتی ہوں۔ پشاد کی گلیاں تنگ تنگ سی ہیں۔ اور ان میں ایک مکان ہیں۔ دہاں سانس مُدبنا رہتا ہے ہر وقت۔ کہتے ہیں۔ اس لئے وہ بیمار ہوتی ہے۔“ لوگوں کو

”مہاں۔“ میرا بھائی تو شہر سے باہر ایک بڑی سی سرائے میں رہتا ہے۔ اور پشاد میں تو بڑے بڑے بازاری ہیں۔ اُدھے اپنے اُدھے کھلے کھلے مکان ہیں۔“

اور بیلا نے کہ اپنے بھائی سے شکایت نہ کرنے کی۔ وہ کیرا ایک تنگ سی گلی کے تاریک مکان میں رہتا ہے۔ اور اس نے اُسے بڑے بڑے بازار اور ادھے ادھے کھلے کھلے مکان کیوں نہ دکھائے۔“

تمہارے بھائی کی پشاد میں تہہ کے کی دکان ہے۔“

”ہاں گنج کے علاقے میں۔“

”تم بھی تو گنتی تھیں نا کچھیلے دنوں شاید اپنی ماس کے ساتھ۔“

”مربانہ کو جیسے ایک بھولی ہوئی اہم بات یاد آئی۔“

”ہاں بیلا نے گوریر آواز میں کہا۔“

”تمہارا بھائی دہاں تنگ گلی میں رہتا ہے۔ تاریک سے مکان میں۔ دہاں بیماری ہے۔“

”نہیں تو“ بیلا نے اس طرح ہنسنے کی کہ شش کو تے ہوتے

کہا۔ گویا میرا تہہ۔ کوئی عجیب بات کہہ رہی ہو۔“

”تو پھر؟“

”میں نے سنا ہے کہ تمہارا بھائی تنگ گلی اور اندھیرے مکان

میں رہتا ہے۔ وہ بچے میں سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے بولی۔

”کون کہتا ہے یہ؟“ مربانہ نے تعجب سے پوچھا۔

اور بیلا نے کا حلق خشک ہونے لگا۔ اور اُس نے ہر منٹ جیسے سی لئے۔ وہ کنوئیں کے قریب پہنچ گئیں۔

بیلا نے کا حلق بالکل خشک ہو گیا۔ اور اُس کے ہر منٹ خود بخود کھل گئے۔ اور وہ زور زور سے کھانسنے لگی۔

”تم کھانستی کیوں ہو؟“ مربانہ نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

بیلا نے برابر کھانستی رہی۔ اور کوئی جواب نہ دے سکی۔

مربانہ نے اب غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے سرخ رنگ میں اُسے زبردستی گھٹتی ہوئی نظر آئی۔ اور وہ اُسے پہلے سے کچھ کمزور سی دکھائی دی۔ مربانہ نے اُس کی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔

”تمہیں تو بخار ہے۔“ وہ بولی

اور بیلا نے کاجی چاوا۔ کہ وہ تو ڈکلی۔ جائے گی اور کرنے کے تمام حصوں میں یہ بات پھیلا دے۔ کہ وہ بیمار ہے۔ اُسے بخار ہوتا ہے۔ کھانسی ہوتی ہے۔ یہ بیماری وہ پشاد سے لائی ہے اس بیماری سے وہ جلد مر جائے گی۔ ہاں اس طرح بھی تو خیریت کی

تم باغی شاہ ایک ملک

کے دربارے

”تو پھر وہ بھی کاتلا ہوا تھا۔“

”بھیکو ہی بل جائے۔ مگر کتنے سے ایسے ہمارے ہوتے۔“

”کتنے کے لئے ایک تڑپ بیتا کہ برتن پر پھٹنے کی۔“

”باغی شاہ بچے بچے قدم اٹھا ہوا گل غمیر کے جیسے کی

دھڑ مڑ گیا۔“

”گل غمیر اپنے جیسے میں کیا چلم ہی ملا تھا۔“

”سُنگول غمیر۔“ باغی شاہ نے کندھے پر سے بندھن اتار

کر چارپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک غمیری کام کے لئے

آیا ہوں۔“

”غیر تو ہے۔۔۔ وہ دھواں چھوڑتے ہوئے ہوا۔“

”غیر ہی ہے۔۔۔ مجھے بیتا کہ متعلق بات کرنی ہے

تم سے۔“

”بیتا کہ متعلق بات؟“ گل غمیر کچھ گھبرا کر بولا۔

”ہاں۔۔۔ میں اُسے پہنا چاہتا ہوں۔“

”اور۔۔۔ یہ بات ہے۔۔۔ وہ مطمئن ہو کر بولا۔ مگر کیرا

۔۔۔ اُس نے چلم کا ایک دبا کش لیتے ہوئے کہا۔

”مجھے پسند نہیں۔“

”وہ مال تک پسند ہی۔۔۔ اب ایک دم کیسے ناپسند

ہو گئی۔“ گل غمیر تعجب سے بولا۔ ”اور چلم باغی شاہ کے

آگے کر دی۔“

”یہ غلط ہے۔۔۔ وہ مجھے کبھی بھی پسند نہ تھی۔“ باغی شاہ نے

چلم کا کش لیتے ہوئے کہا۔

”تو پھر۔“

”تم یہ بات کو تھے میں پھیلا دو۔“

”سنا ہے۔۔۔ لالہ داد کوئی عورت غمیر ناچا ہوتا ہے۔“

”اُس کی ایک بیوی مر گئی ہے۔“

”ہاں۔“

”تو اُس سے بات کرو۔“

”ابا اُس سے پتلا رو کو نہیں دیکھا ہوا۔“

”وہ ہر روز سر پہ کھانی جھرتے ہوتے۔“

”اُس سے کہو کہ کہیں چپ کر گیا ہے۔“

”اب وہ سر سے دن سر پہ کر جب بیتا دہلی جھرتے۔“

”خود کُل کے بھڑوں کی گھنٹی گھنٹی اُس کی بی بی شاموں میں سے ہے۔“

”اُنھیں جھانکتی ہوئی مسکس ہوئیں۔۔۔ اُس کے قدم ڈکھانے۔“

”اُس کا سنس اکھڑ گیا۔۔۔ وہ ایک دم رنگ گئی۔“

”طرح گھور کر دیکھنے کی۔“ سہو سہو خود کُل سے بھری ہوئی گھنٹیاں

شامیں زود زود سے کانپیں۔ ادا ان میں سے جھانکی ہوئی گھنٹیاں

غائب ہو گئیں۔

”بیتا نہ گھڑتے دین پر رکھ دیتے۔ اور غمیر کی گھڑتے

کان سے بیٹھے گئی۔“ مگر کیا یہ کوئی بھڑا تھا؟

”جب گل نے اُسے اپنا کر لیا؟“ اور اُس کا دم تھا؟

”مگر اُس نے اُس کی طرح گھور کر کیوں دیکھا؟“ وہ بھڑا گئی۔

”اس نے کیا کر دیا؟“ یہ بھی انکار کر کے تو؟“ اور اُسے غمیر پرستان

اور تیراہ کے ملا قریں کا خیال آ گیا۔۔۔ اور اُس کی آنکھوں کے

سانے چمکیے قطرے جا رہے تھے۔ اور ہر ایک چمک

اُس کے کان سے وہ پھری جذب ہوئے تھے۔

”مگر اتنے تیز چلتے کی۔“ سہو سہو خود کُل سے بھری ہوئی گھنٹیاں

آہیں میں مگر اسنے گئیں۔ اور خود شاموں سے اُٹھ کر

نیچے گر گئے تھے۔

”جب سہو سہو دائیں طرف کے کونے آئے۔“

”مجھے جاننے لگا کہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔“ اور گھور کر

”پانی نہیں لائی ہوا ہے۔“ غیر تیز سے تیریاں پھیل گئیں۔

دس سیرگئی اور میں گڑو دیا تھا۔

”ہمیں۔۔۔ باغی شاہانہ پریشان ہو گیا۔

”اندراں۔۔۔ شادی پر اس کی نانی۔ ماں اور مدد ملی بہنوں

کو جوڑے دیتے تھے۔۔۔ اندراں کے ساموں نے پچاسویں دہریہ

اگ نقیلا تھا۔ اندر خستی کے وقت چھاپنے پائیس نہ سپہ

معداے پر لے لیتے۔

ادتے۔۔۔ یہ تین ہزار روپے بنتے ہیں۔۔۔ باغی شاہ

تین ہزار پرندہ سے کربلا۔

”تین ہزار روپے؟

”اندراں کی نانی ہمیشہ کہتی رہتی ہے کہ میرے لئے چلیاں

خمینی ابھی باقی ہیں۔ باغی شاہ بولا۔

”اچھا ہوا۔ ابھی تک نہیں بے کردیں۔ خیرتہ نے فطالینا

لا سانس پیتے ہوئے کہا۔

”تم گھر جاؤ۔ ادتے۔۔۔ میں گل خمیرے بات کر کے

آئوں۔

”میں ایک بار پھر کہتی ہوں کہ وہ کافی کڑوا ہو گئی ہے بیٹا سانس کا

جسم بہت بھاری ہے۔ اس لئے کمزوری کا خاص پتہ نہیں۔ حقیقت

میں بہت بیمار ہے۔ ہر وقت کھانسی رہتی ہے۔ اندر ہر روز اسے

بخار ہوتا ہے۔ وہ ایک دم سے گرے گی۔ اس لئے جلدی کرو۔

۔۔۔ یہ کہہ کر خیرتہ اٹھی۔ اور گھر کی طرف جانے لگی۔

دیس ساخت کی بندوق سرٹانے رکھے گل خمیر اپنے حجرے

میں سرد ہا تھا۔ باغی شاہ نے اُسے آمانا دی۔ گل خمیرا

۔۔۔ اگل خمیر نے گھبرا کر آنکھیں کھل دیں۔ اور فوراً دایاں ہاتھ

بندوق پر رکھ دیا۔

”میں ہوں۔ بندوق کو کیا کرتے ہو؟ باغی شاہ بولا۔

”میں بھلا۔۔۔ قاتل خاں ہو۔۔۔ سنا ہے کہ وہ تجھے قتل

کرنا چاہتا ہے۔

”میں نے یہ سنا ہے کہ تم نے کھانسی کا شفا

کے لئے کھانسی کے شفا کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی کے لئے کھانسی

”تو جب ہی تم آزادی سے مجھ سے ملو گے۔“
 گھر کے اندر سے ہر تے۔ اچھا تو لال داد کے متعلق کوئی
 اچھی خبر نہ آئی۔

لال داد آج صبح مجھ سے ملا تھا۔ کی جب بیلا لہ پانی بھرے
 گئی۔ تو اُس نے اخرو لڑکے کے دستوں میں چپ کر اُسے دیکھ لیا۔
 وہ اُس کے سن کی بہت تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے۔ بڑی محنت
 محنت ہے۔

باغی شاہ کے چہرے پر پراسرار منہ چھا گئی۔ ”ہوں۔“
 خریدے گا بھی۔“

”ہاں۔“ کہتا ہے۔ ”دو ہزار روپے دوں گا“
 باغی شاہ کے نگر مند دل کو ستر توں نے گھیر لیا۔
 ”دو سائی ہزار پر معاملہ چکاڑ۔“ باغی شاہ کی آواز خوشی
 سے لہڑ رہی تھی۔

”دو سائی ہزار نہیں دے گا وہ۔“ اقدار کی لڑکی تو کہنے
 دیکھی ہو گی۔ کتنی خوبصورت ہے وہ۔ فقیر گل نے اُسے دو
 ہزار میں خریدا ہے۔ اور پھر بیلا کہ حدت ہے۔ تمہیں تو اس کی یاد
 قیمت مل رہی ہے۔“
 باغی شاہ چپ ہو گیا۔

”چپ کیوں ہو گئے ہو۔“ کہوں لال داد سے۔ کہ
 معاملہ سٹے ہے۔“ گل خمیر بولا۔
 ”کہہ دو۔“ تمہاری مرضی۔“

وہ ایک مرد صبح تھی۔ کالے کالے بادلوں نے نیلگوں آسمان
 کو چھپا رکھا تھا۔ اور درخت خیر کے قریب کے قبائلی علاقے۔
 فضا خیل اور آخریدوں کے دیس کو تینے پر چھٹکے ہوئے تھے۔
 اندازہ گرو کے پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھپتے ہوئے گزر رہے
 تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں سے کالا کالا دھواں
 بل کھا کھا کر پٹ رہا ہے۔

”لال داد کسی کام کی وجہ سے پیشہ جا رہا ہے۔“
 بیوی کے لئے بالیاں بھی ملاؤں گا۔ اس نے تمہاری بالیاں تمہارے
 کے لئے مانگی ہیں۔“ باغی شاہ نے بیلا کے اُسے دیکھا
 ہوئے کہا۔

بیلا نے باغی شاہ کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ حیرت کے
 چشمہ بالکل خشک ہو چکے تھے۔ میں بالکل اچھی ہوں۔ زندگی کی راہ
 پر مجھ سے دو بچہ ہو۔ فریاد بیلا کے ہونٹوں میں غرغر کر رہی گئی۔
 ”اُس نے جب چاہا بالیاں آکر کہ باغی شاہ کے پیسے ہوتے
 ہاتھوں پر رکھ دیں۔“

باغی شاہ اندر خیرتہ کے چہروں پر خوشی کی لہریں ناصح اٹھیں۔
 ”لال داد کی کاسے بیمار ہے۔ دو دھ نہیں دے رہا وہ۔“
 آج ایک کٹہرہ بھر کر اُس کے ہاں دے آؤ۔“ تھوڑی دیر بعد
 باغی شاہ نے بیلا سے کہا۔

پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے کالے کالے دھوئیں سے تیزی
 بڑھ کر جیسے بیلا کے گرد دوار سا بنا دیا۔ اور اُس کا بس گھٹنے
 لگا۔ اور آنکھیں جھپک جانے لگیں۔

خیرتہ نے کٹہرہ اٹھایا۔ اور مٹی کی ڈنڈی میں سے اُس میں دھو
 ڈالا۔ اور لاکر بیلا کے بے جان ہاتھوں میں تھما دیا۔

”مجھ سے نہیں جایا جاتا۔“ بیلا نے دھوئی ہوئی آواز میں
 کہا۔

”تو بیٹا میں جاؤں؟ کل سے میرے گھٹنوں میں دھو ہے۔“
 خیرتہ نے محنت سے کہا۔ اور منہ موڑ کر دانت چینی لگی۔
 ”انہیں ایسی ہی ضرورت ہوئی۔ تو کسی کو بھیج دیں گے۔“ بیلا کی
 آواز میں دھو تھا۔

”میں کہہ کر گیا ہوں۔ کہ ہم خود ہی بھیج دیں گے۔ میں ہی مسجد
 جا رہا ہوں۔ اب تمہیں جانا ہی پڑے گا۔“ باغی شاہ نے ہنسنا
 دیا کہ دھو سے بولا۔

محبت کا کوئی گھر نہیں ہو سکتا۔ بیلا لہ کا دل دوسرے پکارا اٹھا۔
 اہائیں کے سلی میں حیرتیاں رہ گئیں گئیں۔ اور وہ پہلی بار بے فکر
 ہو کر کھانسنے لگی۔ ایک دم اُسے دوسرے انہماک نے قبائلی طلعت
 تیرا اور اندر پرستان کا خیال آگیا۔ اور اُس نے فیما ہرنٹ
 جیسے سی نے۔

شاید سپر کا وقت ہو گا۔ گل نمبر زون کا بنڈل سے کرباخی شاہ
 کے گھر گیا۔

پہ خیر ماٹھے گل نمبر (خوش آمد) خیریت کی نظریں اُس پر پڑیں اور
 وہ مست سے چلا اٹھی۔

پہ خیر ماٹھے سے اوتے "دعیریت سے رہو" گل نمبر نے کہا۔
 "بیلا لہ گئی۔" اُس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" باغی شاہ نے کہا۔

"طلاتی کس وقت دی تم نے؟"

"آج رات۔" گل بادشاہ کے گھر سے میں۔ تمہارا بہت انتظار
 کیا۔ مگر تم نہ آئے۔"

"میں سمجھا۔ دوپہر کو دو گئے۔" ہاں تو گواہ کون کون تھا؟
 "حکیم خان اور خیال سید۔"

"لالی داد نے تمہیں اُسی وقت روپے کیوں نہ دیئے؟"
 "خدا جانے۔" کہنے لگا۔ دوپہر تک بھیج دوں گا۔"

"یہ ابھی مجھے دے کر گیا ہے۔" بہت جلدی میں تھا؟
 میں اُس سے کچھ پوچھ ہی نہ سکا۔ گل نمبر نے فریاد کو باغی شاہ کی
 کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"چائے پیو گے؟" خیریت خیریت سے بے قرار ہو کر بولی۔ اُس
 کا نظریں فریاد کے بنڈل پر جمی ہوئی تھیں۔

"نہیں اوتے۔" میں ابھی بی کر آیا ہوں۔"

باغی شاہ روپے کہنے لگا۔

"فدا آہستہ آہستہ گزرتا ہے۔" وہ چوہے کے پاس سے اٹھ

اوپر اب تو اس ہاوی چہرے کا۔ بیلا لہ کے دل سے
 ہنس کے گئے تھے۔ اور بھاری بھاری قدم اٹھاتے وہ
 کمر بستہ ہو کر گئی۔ کچھ عرصہ جانے کے بعد اُس نے پت کر دیا
 کیا۔ خیریت خیریت سے میں گھر کی تھی۔ اہائیں کے مجزوں مانے
 ہوئے۔ شہادت تھی۔ بیلا لہ کی جوانی آنکھوں سے چھائے ہوئے
 تھے اور گھسے ہوئے۔

اوتے کاسے بادل۔ اور جھک اوتے۔ اور اوتے
 اوتے چاند کے دامن تک پہنچ گئے اور غفلت آفریدیوں کی
 سرور میں ایک سیاہ چادر بچھ گئی۔

بیلا لہ لالہ داد کے گھر کے قریب پہنچی گئی۔ اُس کا دم اندر تیزی
 سے گھٹنے لگا۔ اہائیں بھپک جانے لگیں۔ وہ پت چاہے روک
 کے قریب کھڑی ہو گئی۔

اوتے میں باہر سے لالہ داد کا بھلا لہ کا آگیا۔ بیلا لہ کی طرف
 اُس نے دیکھا۔ اور اندر بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد لالہ داد کی ماں دروازہ
 پر آئی۔

"اندرا آ جاؤ۔" وہ بولی۔

بیلا لہ اندر چلی گئی۔ لالہ داد کی ماں نے دودھ کا کٹورہ اُس کے
 ہاتھوں سے لے لیا۔ "بیٹہ جاؤ۔" وہ کہنے لگی۔

بیلا لہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ اُس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور
 اوتے چہرہ کا سہ روپے میں چھپا ہوا تھا۔

لالہ داد نے جا کر دروازے کو کٹدی لگا دی۔
 "بیٹہ میں جاؤ۔" لالہ داد کی ماں پیار سے بولی۔

بیلا لہ چارپائی پر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

"اب یہی تمہارا گھر ہے۔" وہ اپنی طرف سے بیلا لہ کو
 حقیقت حال سے باخبر کرتے ہوئے کہنے لگی۔ خانہ بان اور لالہ داد
 تاسے کہتے تھے۔

"تاسے یہ گھر پرایاں ہائے؟" وہ پتھر سے کہیں نہیں کہیں

کراں کے قریب بیٹھ کر کے دیں۔

بیلا اور عید کے بعد ہی قلعہ دار سے برگزیدہ کسکوں
کی طلاق کرتیں اور عید سے برگزیدہ کسکوں۔
"میں کل بھی تھان سے سید تھی کہ کسکوں۔ وہ قلعہ دار ہزار
مہینے میں رخصت ہو جائے گا۔"

"موتنا، سید تھی کی پٹھو پٹھا ہے؟
"ہاں"

"وہ بہت فتنہ پرور عورت ہے۔ تو برا۔۔۔ بھتیجی بھی دیکھی
ہو گی۔"

"وہ کیسے؟ غیرتہ حیران ہو کر رہی۔
لال ناد کو اس نے بتایا تھا۔ کہ بیلا کو بیمار اور کھانسی والی
بیماری ہے۔"

"باغی شاہ اور غیرتہ نے دوسرے کو تعجب سے دیکھا۔
"تو پھر۔۔۔؟" غیرتہ نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ مجھے کہنے لگا۔ کہ میں نے بیلا کو خود دیکھا ہے۔ وہ
صحت مند عورت ہے۔"

باغی شاہ اور غیرتہ کے چہرے پر حیرت کی سی جھلک

"اُسے مرنے کی بات پر غصہ بھی آیا۔۔۔ کہنا تھا کہ کسکوں بھانا
ہوں، کہ مجھ سے روٹن میں گھراؤں کا پتہ نہ ہو۔۔۔ اور کسکوں
نے تو مشہور کیا تھا کہ قلعہ دار اپنے بھائی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔
تاکہ اس کی زمین پر قبضہ کر سکے۔ اور اس کی بیوی سے نکاح کر سکے۔
ملا کر میرے ذہن میں کبھی ایسا خیال بھی نہیں آیا۔
"ہوں۔۔۔ اور تم نے کیا کہا۔۔۔ بیلا کے پاس ہے۔
باغی شاہ نے پوچھا۔"

مجھے تو کچھ کہنا ہی نہ پڑا!! موتنا، اور اس کے گھونٹنے کو وہ
ہی پڑا بھلا کہنے لگ پڑا۔ میں نے بھی کہا۔ کہ اگر وہ بیمار ہو گئی، تو کیا
مجھے علم دہرتا؟ اور اگر بالآخر وہ بیمار ہی رہی۔ تو کیا ہے۔ ہی خود
اُسے مدد پرستان سے جاؤں گا۔ تیار ہے جاؤں گا۔ اور بیلا کو نکال
کوئی شکل کام تو وہ پیش نہیں کر سکتا۔"

پتھر پتھر دسین پر ایک دھماکا ہوا۔۔۔ کاسے کاسے ہاتھوں
میں پتھر کی باریک سی سنہری کیر لہرائی۔ اور ہوا کے غائب ہو گئی۔
اور کاسے کاسے ہاتھوں سے پتھر پتھر۔

بہترین ادب ۵۲

ادب کے تاریخی تسلسل کی نئی کڑی
پر عظیم کے عظیم فنکاروں کے شاہکار
ایک جلد میں

*

ایک ایسا مجموعہ

جو نشان منزل بھی ہے اور مشعل راہ بھی

پتھر پتھر

مکتبہ اردو لاہور

*

جنگل روتے ہیں

اے۔۔۔ عید

کا

نیا ناول

(چار جلدیں)

بڑھاپے کا لکھن

تمثل ایک باب میں،

کتاب

10

4

سکول کا سابق طالب علم
سکول کا طالب علم
سکول کا ریٹائرڈ استاد

۱۔ ایک سنگول کے بازو اس کے معانے کا کہ۔ ہاتھیں حرکت کھلی ہوئی کر کے یہ خوبصورت حیاتی باغ کا سحر نفازا ہے۔ کڑک کے ساتھ آفتل مان
 ۲۔ ایک سنگول کے بازو اس کے معانے کا کہ۔ ہاتھیں حرکت کھلی ہوئی کر کے یہ خوبصورت حیاتی باغ کا سحر نفازا ہے۔ کڑک کے ساتھ آفتل مان
 ۳۔ ایک سنگول کے بازو اس کے معانے کا کہ۔ ہاتھیں حرکت کھلی ہوئی کر کے یہ خوبصورت حیاتی باغ کا سحر نفازا ہے۔ کڑک کے ساتھ آفتل مان

جب سولہ دن کو گزریں تو اندھا نہیں رہا۔ اقل عرصہ میں کان آگ بول رہے تھے۔

اس شخص کے لئے دعا ہے کہ وہ جانی فرماؤ استاد فرمودہ ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے تابشِ انجیل نورِ جہاں (مکملی صحت پرست
اس شخص کی دعا ہے)۔ (جہاں کی دعا میں برس کے فریاد ہوگی)

آفتاب - میرزا علی قاسم کو بے حاشیہ ہو۔

..... میں تو اس کے چتے چتے سے واقف ہوں، خدا ٹھہرے مجھے غم سے دیکھنے دیجئے (سائنسدان کے
پورے دل پر لکھا ہے)۔ — وہی کتابیں ہیں — (کہاں کو غم سے دیکھتا ہے) — میں تو ان کے کام تک بتاتا ہوں —

۱۰۰ ————— (قریباً یک سو) ————— اورجینا کلاک

[Handwritten signature]

یہ سبب کے درخت دیکھتے ہو درخت ہمیشہ سے اسی جگہ پر کھڑے ہی! — بڑی اعلیٰ بات ہے مگر تمہارا اسی کہ درخت کا لاشعور
 کہ جہاں وہ دیکھتا تھا وہ لاشعور جہاں وہ لگا ہے کہ اس درخت کی اس جگہ پر لگا — اور پھر یہ کھڑکی! ابراہیم اسٹر — درخت کی جگہ پر لگا ہے۔

..... اس کا وہ دیکھ کر کے غریب ذہن کے پاس ہلکا اور یہ دیکھ کر ہم نے اب کے ٹینس کرٹ کے اندر گزرا دیا ہے۔
 فریڈم - جی اور میں دیکھ رہا ہوں کیا کہنے اس کے !! (پھر پتے غباروں کو مٹاتا ہے) یہ کو اس کا یہ ٹھکانہ یہ گری
 کتنی اثر انگیز ہے یہی وہ چیز ہے جو انسان کو سکول چھوڑنے کے بعد بشر نہیں آتی نہ کوئی رنگ ہے نہ آواز نہ سادہ
 میرا خیال ہے کہ اب بڑے لڑکوں کو اچھے اچھے کرے دیتا کہ تا تو قریباً ناممکن ہو گا ؟ کیونکہ وہ تو ہیں ہی سرسبز شادابی
 کے لئے اس قسم کے مادہ ادب بے رنگ کرے ہی مناسب ہیں لیکن بننا مجھے اسکول کے دنوں میں ایک اچھے بچے سے یاد ہے
 کرے میں رہنے سے بے انتہا خوشی ہوتی تھی - ادب تائیں پر کھڑے ہو کر ایک آدمی کر می - وہ اس پر دے ۹۹۹ (پھر پتے مٹاتا ہے)
 اسے اس پر دے کر چھپے کیا ہے ؟ یہ میرے لئے ہمیشہ ایک راز ہی رہا ! -

۱۰۔ (پرسے کو تھام رہا ہے) بیٹ اور کوٹ!

فرحان :- (خندے دیکھتا ہے) اسے یہاں تو صرف کپ ہنڈ ہے ۔ مجھے تو اس کا سان گمان بھی نہیں تھا یہاں ٹوکس ہوا ہے جیسے میں نے قطب شمالی صیانت کر لیا ہے ۔ (پوچھ رہا ہے) کہئے آپ اب بھی سزا دینے کے لئے چھڑی استعمال کرتے ہیں ۔ (ایک کہنے میں دیکھتا ہے) استاد :- ان دنوں تم چھڑی کو اس کو نے میں نہیں پاؤ گے کیونکہ مجھے ایک دفعہ بڑا برا تجربہ ہوا تھا ۔

نوحیان۔۔ جی ہاں! جی ہاں!! میں نے بھی سنا تھا!!!

استاذانہ :۔ اس گہن کی کتاب "سلطنتِ ہدایا کا مروجہ دزدان" سے تو چھڑی کا خاص تعلق ہے۔ اس کتاب کو پڑھاتے ہوئے اس کا استعمال ضروری ہے۔
چھڑی کی یاد بھی خوب آئی۔ تو میں اسے نکالتا ہوں۔ (چھڑی نکالتے ہیں) آج سکل کے بد مروتے ہی ایک لڑکے کو مزار بھی دینی ہے۔

نوجوان ۱۔ (حیرت زدہ) جی میں یہ پٹری دیکھ سکتا ہوں؟ (پٹری پکڑتا ہے) ارے اس میں تو خدا بھی تبدیلی نہیں آئی!

اکٹاؤ۔ (ہنستا ہے) افسوس نہیں غلطی تھی۔ میاں تمہارے جانے کے بعد میں اب تک تیرے چھڑیاں لے چکا ہوں۔

نوجوان :- (سادگی سے) سب کی سب ٹوٹ گئیں؟

استاد :- ان سب کی سب زوال کے پہلی قانون کی تندہ ہو گئیں !

نوجوان ۱۔ (پھڑکی کو دسے دیکھتا ہے) یہ یہ تو بالکل ایسی ہی تفراتی ہے۔ (پھڑکی کو گھماتا ہے) یہ تو بالکل ایسی طرح گھومتی ہے۔
ایسے گھماتا ہے جیسے کل ہی (پھر خیالات میں مرقن ہو جاتا ہے)۔

استاد۔ اس وقت بیتے دڑوں کی کرنسی یا دنازہ کر رہے ہو؟

تو جوان وہ (چمک کر) جی!..... انا! انا!! مجھ پر بھی تو ایسے کئی حادثے گذرے ہیں! میں بھی کیا امت، خلیفہ احمد فیصل تھا..... دیکھنا ان دنوں میں کتنا پیشہ ہوتا تھا۔ منقذات بکا کرتا تھا۔ اور میری زبان انتہائی گندی بڑا کرتی تھی..... کتنا سست تھا۔ عام خیال تھا کہ میں ناقابل اصلاح ہوں۔ ان سب باتوں کی یادیں عجیب سی گھم رہی ہے..... میں آپ کو کہیں کس دھب سے تنگ کیا کرتا تھا!.....

انسان کے لیے حلق کا سوتے رہتے ہوں گے ۱۱

استاد۔ میرے دوست !

نوجوان۔ اے استاد میرے دوست سے قابل احترام استاد جی میں سٹریٹاؤٹن تھے کافی پاٹ اے پنڈت لٹرنے تھے ۔ اے وہ کہیں سال

استاد وہی میٹر صاحب میں تا ؟

استاد۔ بڑے میٹر صاحب کتنے اچھے تھے ! میرا خیال ہے تم نے ان کی سبکدوشی کی خبر تو سن ہی لی ہوگی۔

نوجوان۔ جی ہاں کیا وہ کٹن ڈیل سے چلے گئے ہیں ؟

استاد۔ انہوں نے کالج کی ملازمت چھوڑ دی ہے دراصل ان کا اپریشن ہوتا تھا جس کی وجہ سے ان کی صحت گر گئی تھی اس لئے انہوں نے

خدمت ترک کر دی دیکھو وہ یہیں شہر میں مقیم ہیں تم انہیں اکثر کالج کے میدانوں میں گھومتے پھرتے دیکھو گے وہ اب

بھی کالج کے کئی کاموں میں برابر دلچسپی لیتے ہیں گپ بازی کے لئے تو وہ اکثر تشریف لیا کرتے ہیں۔

نوجوان۔ (متاثر ساہم) بڑے اچھے انسان تھے وہ ! دراصل وہ فلسفی تھے فلسفی آپ کا کیا خیال ہے ؟ مجھے یاد ہے کہ وہ اکثر یونانی

ادب کا لڑی زبان کے ترجمے کا کام کراتے کراتے درمیان میں ہی مارتھک کے فہم کی کٹن کی زندگی اور کہیں مالی کے متعلق باتیں بتا کرتے تھے۔

استاد۔ میٹر صاحب بڑے بڑے قزاقانہ غیور نظر آتے ہیں۔ میں تو دن دن ان کا شاگرد رہ چکا ہوں جب ابھی تم نے میرے جنم

جی نہیں دیا ہوگا۔

نوجوان۔ اے آپ بھی ان کے شاگرد ہیں ؟ خوب خوب مگر اب تو وہ بڑے بڑے ہوش سے ہوں گے وہ کتنے بلند نظر انسان

تھے اور کتنی جلدی انسان کے دل کی گہرائیوں تک جا پہنچتے تھے۔ اور کیسے آپ کے مارے حالات جان پیا کرتے تھے۔ مجھے

وہ دن تو کبھی نہیں بھولے گا جس دن ہم ان سے آخری بار سب سے بڑے تھے۔ میری مرتزہ چودہ سال کی ہوگی وہ ہر ایک کو

باس کرتے تھے اور اس کی سال بھر کی سرگرمیوں پر خیالات کا اظہار کر کے پھر اس کو رخصت کر دیتے تھے جب میری ماری آئی تو انہوں نے

میری انگلیوں میں آنکھیں ڈال کر بہت آہستہ اور بڑے موثر انداز میں کہا۔ " ٹیمپسٹ تم جب تک زندہ رہو گے تمہیں یہ افسوس ہی رہے گا کہ تم نے

یہ ضائع کر دیا۔ " اس فقرے نے میری تمام تعلیمات کا ستیاہاس کر دیا۔

استاد۔ (بے تاب ہرک) کیا ان کی پیشین گوئی صحیح نکلے ؟

نوجوان۔ میں تو اسے سزاؤں کر چکا ہوتا لیکن دماغ مر رہا نہیں گدا جب میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کروں۔

میرے دل میں کوئی شے تخلیق کرنے کا جذبہ جاگ اٹھا۔ خبر نہیں میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے آپ سمجھ بھی رہے ہیں کہ نہیں۔

پھر کھٹ میری یہ خواہش کسی سنسنی خیز چیز کی دریافت میں میری رہ نائی کہنے لگی مگر افسوس کہ میں اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکا

کیونکہ مجھے نثر لکھنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں آتا تھا میں کوئی اسلوب ہی نہیں جانتا تھا !

استاد۔ اچھا !

نوجوان۔ جی ہاں مجھے صرف ایک شے تحریر کا اسلوب بخش سکتی تھی اور وہ تھی لاطینی زبان سے واقفیت اور صرف ایک انسان

میرے مجھے لاطینی زبان پڑھا سکتا تھا لیکن جس سال مجھے اس انسان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا وہ سال میں نے یونانی ضائع کر دیا

اب اس کے بعد مجھے کوئی موقع نہ ملا..... جس کی وجہ سے میں پہلے رہ گیا۔ میں اپنا نام ردش نہ کر سکا۔ اب میں کیا ہوں۔ وہاں کسی کو ایک نو۔ اب کچھ بھی نہیں... مجھے میرا اس چیز کا افسوس رہے گا۔ (دقت)

استاد: ہم میں سے کونسا انسان ایسا ہے جس نے اپنی زندگی — خصوصاً ابتدائی زندگی — میں کوئی دکھائی شے نہیں کھائی۔ جس کا اسے افسوس نہ ہو؟..... جب مجھے اپنے سکول کے دن یاد آتے ہیں تو.....

نوجوان: سکول کی زندگی کتنی عجیب — کتنی دلچسپ ہوتی ہے!..... یہ وہاں..... یہ ٹائیاں..... یہ جگڑے۔ یہ سب کتنی سنجیدگی سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔..... ان دنوں کی تلخ ترین یادوں میں بھی کتنی لذت کتنی کشش ادھکتا مزا ہوتا ہے..... وہ یہاں پھڑی..... اور یہ اس کی ہمزاد پھڑی.....

استاد: (سکراتے ہوئے) میرا خیال ہے تم اس پھڑی دلا مضمون چھوڑ دو گے نہیں! نوجوان: جی ہاں! سکول کی تمام زندگی سٹ مٹا اس میں ہی تو آجاتی ہے..... ادھ دیکھئے نا پھڑی سے انسان کو ہمیشہ ضرب ہی پہنچتی ہے نا استاد! مجھے ان باتوں سے بڑی خوشی ملتی ہے۔

استاد: جی سر اس سے یہ مطلب نہیں کریں سزاوے تمام قصوں کا تذکرہ کرنے لگا ہوں..... نہیں بلکہ میں خدا ان ابتدائی تیاریوں کا ذکر کروں گا جو سزا سے پہلے کی جاتی تھیں..... اس وقت میرے سامنے تمام منظر آ رہا ہے..... میں ڈٹے ڈٹتے دھادے پر ہنگ دیا کرتا تھا..... اندھے آواز آتی تھی..... آواز..... پھر ایک مختصر کن وقفہ آتا..... اس کے بعد میں خاموشی کو ڈھاتا..... مجھے آپ نے طلب فرمایا ہے؟..... ٹیسٹ تم جانتے ہو میں نے نہیں کیوں بلایا ہے؟..... اس کے بعد پھر وقفہ آتا..... ٹیسٹ تمہیں یاد ہے پچھلی مرتبہ میں نے تم سے کیا کہا تھا..... یاد ہے نا؟..... جی ہاں..... تو پھر کیا تم نے ٹیک نہ ہونے کی قسم کھا رکھی ہے..... ٹیسٹ تم کبھی بھی دست نہیں ہو گے؟..... ادھ پھر میں کہا کرتا: پتہ نہیں جناب! استاد: (ہنستے ہوئے) یہی کچھ ہوتا تھا۔ بھئی سب استاد ہی کچھ کیا کرتے ہیں۔

نوجوان: پھر آپ ہونٹ بکڑ پیتے، ادھ کہتے 'اچھا یہ بات ہے تم اسی چیز کی توقع کرتے ہو۔ تو پھر پاؤ سزا' — آپ چھڑی نکالتے اور کہتے 'اب کے نہیں چار بیداروں کا اور اگر آئندہ ایسی حرکت کی تو چھ..... اس کرسی پر جھک جاؤ'..... اس کرسی پر (کھڑکی کے پاس پڑی ہوئی کرسی کے باوجود کپڑا کشا کہتے ہوئے)..... یہی کرسی تھی نا؟ کیوں جی دست کہہ رہا ہوں نا؟ (استاد سر ہلاتے) پھر میں اس پر جھک جاتا (کرسی پر جھک جاتا ہے)..... ایک اور وقفہ آتا..... یہ دقت اتھائی خوفناک ادھ..... اور طویل نظر آتا..... اور پھر.....

استاد: بھئی میرا خیال ہے ادھ مناسب یہی ہے کہ یہ ذکر نہیں رہنے دو۔

نوجوان: جی ہاں یہ دقت اتھائی نازک، ادھ مشکل ہوتا تھا..... ادھ اس کے بعد جب یہ کام ختم ہو جاتا..... تو میں باہر چلا جاتا..... باہر خدیوہ سر ادھ زندہ دل لڑکوں کا ہجوم موجود ہوتا..... میں آپ کے کمرے سے نکلے ہی ان کا بیروں جاتا کیونکہ جو لڑکا بغیر دستے لٹنے بید کا بیا کرتا تھا وہ قتی طہ پر لڑکوں کا بیروں جایا کرتا تھا۔ ادھ خوش قسمتی سے اس مار کے نشان دوسری صبح تک موجود رہنے اور اس وقت نہانے کے دوران نظر آتے..... مارٹر صاحب یہ اعزاز بھی کوئی معمولی اعزاز نہ تھا (اس کے چہرے سے خوشی کے آثار مٹ جاتے ہیں ادھ وہ

بے لگہ ماسے دیتے ہیں (بھٹہ جاتا ہے) — Blue Fugates

اُستاد۔۔۔ میں نہیں اتنی ہی اطمینان آتی ہے!

نوجوان۔۔۔ (متحیر ہے) یہ دن میری زندگی کے حسین ترین دن تھے اور اب یہ کبھی بھی واپس نہیں آئیں گے (اُستاد اپنی گھڑی نکالتا ہے)۔۔۔
میری باتوں سے آپ پریشان تو نہیں ہو رہے؟

اُستاد۔۔۔ نہیں بالکل نہیں..... بات مرث اتنی ہے کہ ابھی چند لمحوں میں میری اس چھڑی کا شمار آنے والا ہے اس وقت تمہیں ذرا باہر جانا پڑے گا
نوجوان۔۔۔ گراس نے کیا گناہ کیا ہے؟

اُستاد۔۔۔ وہی گناہ جس کے تم مرکب ہو کر تے تھے۔

نوجوان۔۔۔ دوسرے اُستادوں کی رہنمائی؟

اُستاد۔۔۔ اہ..... اس لڑکے کا یہ پانچواں سال ہے بے انتہا شرم ہے۔ بالکل بند کی طرح۔۔۔ مجھے سخت تنگ کر رکھا ہے۔

نوجوان۔۔۔ آپ اسے کتنے بیدار کریں گے؟

اُستاد۔۔۔ تم سمجھتے ہو گے کہ میت سے بیداروں گا..... ہیں..... دیکھو تم ذرا کھانے والے کمرے میں ٹھہرو..... ہیں..... مادنا اب
..... ماسے تو تم جانتے ہی ہو!

(جانے کے لئے اندرونی حصے میں کھلے دروازے کی طرف جاتا ہے)

نوجوان۔۔۔ (متحیرانہ) دیکھئے مجھے اس پردے کے پیچھے چھپ جانے دیجئے۔

اُستاد۔۔۔ کیا؟

نوجوان۔۔۔ مجھے یہ تمام منظر دیکھنے دیجئے۔ کاش آپ جانتے کہ میں اس سے کیا سبق حاصل کروں گا..... آپ اجازت دے دیجئے نا.....
میں اس کے حوض ہرچیز دینے کے لئے تیار ہوں۔

اُستاد۔۔۔ لیکن یہ اچھی بات نہ ہوگی؟

نوجوان۔۔۔ اس کو کیا علم..... اسے کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا اور اگر اس نے دیکھ بھی یا..... تو..... تو..... غیر کوئی بات
نہیں..... یہ بھی تو ایک معرکہ ہوگا!..... میں اپنے ماضی کو دوبارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا..... میں آپ سے
مدد خواست کرتا ہوں۔

اُستاد۔۔۔ بھیجی یہ بہت بُری بات ہے.....

نوجوان۔۔۔ لیکن اگر آپ نے اجازت نہ دی تو میں رو دوں گا۔

اُستاد۔۔۔ (پچھانے ہوئے) ٹیسٹ تم ہی بتاؤ اب میں کیا کروں؟..... (دعا مانگے پر دستک ہوتی ہے) میں..... میں..... دیے
مجھے یہ بات پسند نہیں ہے.....

نوجوان۔۔۔ لیکن آپ مجھے اجازت تو دے دیں؟ (اُستاد اثبات میں سر ہلاتا ہے) اہ..... شکریہ..... بہت بہت شکریہ ماسٹر صاحب
میں آپ کا یہ احسان کبھی فراموش نہ کروں گا۔ (جلبی سے اسی جگہ جا کر چھپ جاتا ہے)

استاد۔ اعدا ہاؤ۔

(باہر کی طرف کھٹے دل سے دعا ہے کہ گنگرے ہاؤں میں ایک پھرنا ماسٹر رنگ کار کا داخل ہوتا ہے۔ اس کا رادھوٹ سخت گندا ہے۔ چہرہ ادا اٹھکایاں سپاہ ہیں۔ جروان قیو مال کے قریب ہنگ۔)

لڑکا۔ (ریاڑ ماسٹر سمیت ہے) جناب آپ نے مجھے بایا ہے؟

استاد۔ (سجیدگی سے) تم فردر میرا خیال ہے تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے (لڑکا اپنا سر دکھاتا ہے) مجھے مشرڈ ٹینٹکٹن کی طرف سے ابھی ابھی ایک رپورٹ پہنچی ہے (لڑکا بڑی کوفت محسوس کرتا ہے) تم فردر جانتے ہو میں نے تم سے کھلی مار کیا کہا تھا؟ (کوئی جواب نہیں کیوں تم فردر؟)

لڑکا۔ (قرینا سرگوشی میں) جی ہاں جناب!

استاد۔ (ایک لمبی مائن لے کر) تم فردر کیا تم کبھی نہیں سمجھو گے؟ بدو؟

لڑکا۔ پتہ نہیں جناب!

استاد۔ اچھا..... اب تم جانتے ہو کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں..... میں تمہیں تنبیہ کرتا ہوں۔ کہ اب کے تو تم کو سزا کے طور پر چارید رسید کر دل گا مگر آئندہ ایسی حرکت کی سزا چھ بید کی ہوگی۔ (دو اپنی پھڑی اٹھاتا ہے)..... ادھر جھک جاؤ۔

(لڑکا کہہ اس انداز سے کرسی کے پاس مار جھک جاتا ہے جیسے اس کا روزمرہ کا کام ہے..... فوجوان کا سر ہڈے کے پیچھے سے نمودر ہوتا ہے۔ استاد اپنا گلا صاف کر کے پید اٹھاتا ہے۔ فوجوان چیخ مکر اپنی پناہ گاہ سے نکل آتا ہے۔ اور لڑکے کے آگے کھڑا ہو جاتا ہے)

فوجوان۔ (ایکال جذبات میں) میاں صاحبزادے..... تم خوش قسمت ہو..... بڑے خوش قسمت۔ مجھے تم پر رشک آتا ہے..... کاش میں تمہاری جگہ لے سکتا۔

(استاد بڑے فتنے سے اس کی طرف ڈھکتا ہے۔ لڑکا بھی جروان ماہر فوجوان کی طرف آتا ہے)

تمہارا کیا نام ہے؟..... تم فردر..... ارے تم کتنے گندے، غلیظ اور نالائق ہو۔ (استاد سے) حضور! میں اپنی اس مافلت کی معافی چاہتا ہوں (پھر لڑکے سے) بے وقوف! احمق!! تم نہیں جانتے کہ تم کتنے خوش نصیب ہو..... میرے بے الفاؤل پر نقش کر لو..... میں بھی انہی مابروں سے گندا ہوں جن سے تم آج کل گد رہے ہو..... میں اس سکول کا پانا طالب علم ہوں..... میں یہاں ساٹ سال تک پڑھتا رہا ہوں اور یہاں مجھے فٹ بال کا اچھا کھلاڑی ہونے کے اعزاز میں انعام بھی ملا تھا۔ مجھ پر بھی سیکڑوں بار وہی کیفیت گدی ہے جو آج تم پر گدی رہی ہے۔ میں بھی اس کرسی کے اوپر دل میں دعا لے جھکا ہوں کہ کاش زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں..... آہ کتنے پڑھتے..... کتنے حسین تھے وہو تم نے فاؤسٹ کی کہانی سن رکھی ہے نا؟ نہیں سنی..... خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ سوئٹرو فاؤسٹ اپنی روح شیطان کے اٹھوں ذوق سے کہتا ہے۔ ادا اس کے عوض اپنی کھوئی ہوئی جوانی حاصل کرتا ہے..... اگر مجھے بھی کوئی ایسا موقع پیش آیا تو میں بھی فاؤسٹ کے نقش قدم پر چلوں گا۔ میں بھی اپنی نوجوانی کے عوض مانی کے حسین ترین دن خریداؤں گا۔ سن رہے ہو نا؟..... میں پھر یہاں واپس آ جاؤں گا اور تمہارے ساتھ ڈیسکوں پر بیٹھ کر سوالوں کے جواب دیا کروں گا..... اور سکول میں چھٹی ہفتے ہی اتھائی وحشیانہ انداز میں گھرھاگ ہا کر دوں گا اور پھر اپنا غیبتل کا پا جا رہیں کہ گندی مٹایاں کھا کر دوں گا۔ اور سچائی کہانی

پشیمان ہو گا۔ اہل چرم سال بھر یہی کھڑے ہو کر اپنے کلمے کی سزا پا کر رہے گا۔ میں بڑی خوشی سے اس سزا کو قبول
گا۔ دیکھو میں ابھی اس کرسی پر جھک رہا ہوں اور تم جتنا جاؤ مجھے مارو۔ اپنی ہمدی طاقت سے مجھے مارو۔ لیکن
مجھے صوفیوں کی احساسات کی ٹکی سی ازگشت کسویں دے۔ مجھے جان لیو دے کہ اس وقت احساسات کی نہ کس طرف پہنچتی ہے۔
جب ہم شہر میں اس کرسی پر جھک جاتے ہیں تاکہ استاد حضرات کی چھڑیوں کا نشانہ بنیں۔ لیکن لیکن میں اب ان
احساسات سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ وہ گندگے ہیں وہ ماضی کا دبا ہوا کر رہ گئے ہیں وہ لمحے واپس نہیں لائے جاسکتے
..... میرے خوش قسمت دوست! تم بے انتہا خوش نصیب ہو یقیناً مازو تم بڑے خوش قسمت ہو۔

ان کا حال نہ ہو کر ایک کرسی پر کر جاتا ہے۔ (کلمہ منہ فہم سے اسے نکالتا ہے)۔ استاد اس صحن میں بالکل مکت و مادر ہوتا ہے۔
استاد۔ تم فائدہ لب تم جانتے ہو۔

لڑکا۔ (اپنے کان پر ہیکل اٹھا کر کہتا ہے) اوروہ شکر ہے جناب!

(وہ بڑی خاموشی سے باہر نکل جاتا ہے پھر ایک وقفہ)

نوجوان۔ (سزا سناتے ہوئے) میں معافی کا خواستگار ہوں جناب۔ افسوس میں ضبط نہ کر سکا۔ میں نے جو کچھ کیا ہے مجھ اس کا احساس ہے۔
میں سب سے بہتر تہی حرکت کی ہے۔ لیکن میں عید تھا۔ میرے جذبات اس قدر مشتعل ہو چکے تھے کہ میں ان پر قابو نہ پاسکا۔ کیا آپ مجھے کبھی
معاف نہیں فرمائیں گے؟

استاد۔ (بڑی سنجیدگی سے وہ اپنے اوپر مضبوط کر کے) میاں میں بڑی کشادہ دل سے تمہیں معاف کرتا ہوں۔ آخر تم نوجوان ہو تمہارے!

نوجوان۔ (زخم خندہ) نوجوان؟

استاد۔ اے نوجوان! بالکل نوجوان!!

نوجوان۔ (حیران سا ہو کر) آپ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں (استاد اثبات میں سر ہٹاتا ہے) تو پھر معاف کیجئے۔ مجھے اس شرط پر معافی نہیں چاہیے۔
وہ اصل آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میں مدح و تحسین کی عمر کی منزل سے گزر چکا ہوں (اقتراں و گھٹنوں میں بے ہوش ہے) ہا ہا ہا ہا ہا ہا!!
آپ کے اس خیال کے پیچھے بے پناہ طنز و استہزاء لکھی ہوئی ہے جسے میں نہیں نکل سکتا۔ میں جانتا ہوں میں یہ بڑی گھٹیا سی جذباتی تقریر کر رہا تھا۔ مگر
کم از کم اس میں غلوں حرد تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کا آپ جناب بھی میں نے واضح کر دیا تھا۔
استاد۔ ٹھیک ہے تم نے اپنا مقصد واضح کر دیا تھا۔ میں بھی یہی کہہ سکتا ہوں نا۔

نوجوان۔ تو پھر؟ کیا آپ اس کی شدت سے متاثر نہیں ہوئے؟ آپ اس آپ جیسے مدرسے لوگ؟ وہ اصل ایک
اسکول ماسٹر ہیں رہتا ہے کہ تمام عمارتیں اس میں گزار دے جہاں قدم قدم پر دونوں کے فیض چکنا چد ہو جاتے ہیں۔ اگر میں یہاں رہوں
تو میں ہر وقت گزرتے ہوئے ٹہانے دفن کو یاد کرتے کرتے ہانگ ہو جاؤں گا۔

استاد۔ (بے ہوش) ٹھیک ہے تم نے مجھے پہلے بھی یہی کہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سکول ماسٹر بڑے قدامت پسند اور بے دماغ ہوتے ہیں۔
مگر تم ہم سکول ماسٹروں میں سے کسی ایک بھی کو اپنے ماضی کے ٹھکانے دفن کو یاد کرتے ہوئے انسان کا حال دیکھتے ہوئے سن رہے ہو
تمہارے افسانوں کا ماضی پر چڑھنے کے لئے بھی تیار ہوں۔

نوجوان۔ (خندے) ماضی کو یاد کرنا قدرت پسندی اور بے وفائی تو ہو سکتی ہے مگر یہ ہے تو حقیقت۔
استاد۔ !!!

نوجوان۔ آپ کہتے ہیں شاید آپ اسکول کے ایام ہی خوش نہیں تھے؟
استاد۔ ان دنوں مجھے انتہائی خوشی حاصل تھی۔

نوجوان۔ ادب؟ اب آپ کیسے ہیں؟ ادھر ٹیک میں کبہ گیا عدل آپ کو اپنے موجودہ ماحول سے کوئی گہرا کوئی شکایت نہیں آپ
قلمی مطلق ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب میں آپ کی مرتبہ پہنچ جاؤں گا تو میں بھی مطلق ہر جاؤں گا۔ لیکن کہیں آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ
کو ان دنوں بھی اتنی ہی خوشی حاصل ہے۔ جتنی سکول کے دنوں میں تھی؟

استاد۔ تم بتاؤ کہ تم کو اس وقت ان دنوں والی خوشی نہیں حاصل جو تم نے سکول میں گزارے ہیں؟

نوجوان۔ نہیں بالکل نہیں کاش آپ جانتے کہ
استاد۔ اگر میں جانتا ہوتا تو مجھے بڑی حیرت ہوتی
نوجوان۔ میں بعض اوقات حیران رہ جاتا ہوں کہ دنیا میں کوئی انسان ایسا بھی ہے جو میری طرح قفل کی دنیا میں اس درجہ بلند پرواز ہے؟ لیکن

اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ میں غیر معمولی انسان نہیں ہوں۔ یقیناً دوسرے لوگ بھی احساس خواہشات اور مقاصد رکھتے ہیں۔ مگر شاید
میں اس معاملے میں ان سے کمزور ہوں۔ مجھے تو ہمیشہ ایسے گناہ جیسے میں سول پر چڑھا ہوا ہوں اللہ سولی کی یہ تکلیف اگر انسان
کی بندی نہیں تو کبھی کی اور نچائی مزدور ہے یہ دیکھ اے مصیبت ایک جہنم ہے جہنم۔ اس سے زیادہ خوفناک اللہ کوئی تکلیف
نہیں ہو سکتی۔

استاد۔ بھئی میں سگریٹ پی رہا ہوں تو نہیں مانو گے؟ (ایک سگریٹ نکالتا ہے)

نوجوان۔ انسان سکول کو چھوڑ کر کتنی سادگی، خلوص اور اعتماد، کتنے شوق اور مصروفیت سے اس عظیم دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ پہلے اسے
یہ دنیا بڑی خوبصورت اور خوشیوں کا گہوارہ نظر آتی ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ اس میں قدم دھرتا ہے اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس کا عین
خواب پریشان ہو جاتا ہے اور تار تار ہر کر بھیاں سراب کا روپ بھر لیتا ہے۔ میں بھی پہلے پہل اسی طرح سوچا کرتا تھا۔ مجھے یوں محسوس
ہوتا تھا جیسے ہر چیز حیرت کی قدرت کے احاطے میں ہے۔ لیکن مجھے اب یہ پتہ چلا ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں دنیا کہ
میری کوئی ضرورت نہیں میں تو صرف رومی کا غذا کا ایک پردہ ہوں بد وضع اور بے ضرورت مجھے اپنی زندگی کا کوئی
جواز نظر نہیں آتا اور کج حیرت سے ہر امید کا ماس چھوٹ چکا ہے۔ یقیناً اور اعتماد چھین گئے ہیں دغہ رہنے کی تحریک ختم ہو
چکی ہے دیکھا آپ نے دنیا نے مجھے کیا کچھ کر دیا دنیا نے میرے لئے کیا کچھ کیا آہ یہ بدکار ورنہ صفت دنیا!
مجھے اس دنیا سے نفرت ہے! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے!! مجھے ہر انسان سے اور ہر شے سے نفرت ہے!!!
استاد۔ ماضی
نوجوان۔ میرا خیال ہے کہ میرا یہ انداز یہ رویہ آپ کو پریشان کر رہا ہوگا۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ لیکن وہ حقیقت ان پچھلے دنوں
میں زندگی نے مجھ پر ہر راہ بند کر دی ہے صرف یہی ایک رات بچا ہے صرف یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے جس سے میرے مشکل مسائل

شکلیں پلنے لگتی ہیں..... مجھے امید تھی کہ میں دنیا سے دور..... بہت دور کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں صرف یہانی یادوں کے
ہلکے زندگی کے دن پر سے کر دوں گا..... اور پھر میں ان تلخ تند تیز اور بے رحم یادوں کو فراموش کر دوں گا۔ جو سایوں کی طرح میرا چھپا
کد ہی ہیں..... میں ان یادوں سے ہی دامن بچانے کے لئے یہ معمولی باتیں اس انداز میں آپ سے بیان کر رہا ہوں۔
استاد۔ شک ہے... شک ہے۔

نوجوان۔ میں زندگی سے قطعی طور پر یابوس ہو گیا تھا..... اس صبح میں نے ایسی ایسی جگہوں کا سفر کیا جن کو دیکھنے کی خواہش مجھے بچپن سے تھی۔
شکلیں میرے درد کا دواں کہیں نہ ملا۔ بلکہ تکلیف اور بڑھ گئی..... جیسے ہی میں ان مقلات کو دیکھتا میرے خیالوں کا طوفان اور آتش فز
ہو جاتا..... اور جب ایک خاص انسان سے دور وہ کر زندگی کے تسلسل کو برقرار رکھنا ناممکن نظر آتا تو میرا سر شدت سے رستا اور درد
کی نہ تھکنے والی ٹہنی جاگ اٹھتیں.....

استاد۔ پھر.....

نوجوان۔ میں نے کبہ تو دیا..... کہہ دیا ہے نا؟..... میں جانتا ہوں کہ میں..... (رکتا ہے۔ اس کے چہرے پر کربناک سائبے لہر جاتے ہیں
اندول میں ناقابل بیان درد جاگ اٹھتا ہے)

استاد۔ اور پھر تمہیں ایسے وقت میں اپنے پرانے سکول کا خیال آیا؟

نوجوان۔ جی ہاں..... چانک مجھے الہام سا ہوا..... اور مجھے یوں لگا جیسے میں نے ایک چھوٹے سے خوبصورت گھر کا خوبصورت
باغیچہ دریافت کر لیا ہے۔ جہاں انسان سنہری دھوپ اور قدرت کی نیرنگیوں میں کھو کر دنیا بھر کو فراموش کر دیتا ہے۔

استاد۔ مگر وہ انسان؟

نوجوان۔ وہ..... وہ تو میرے احاطہ اختیار سے باہر ہو گیا۔

استاد۔ (سنجیدگی سے) ادھر..... بڑا افسوس ہے۔

نوجوان۔ لیکن میرے یہاں آنے سے بھی میرا مقصد پھٹا نہیں ہوا!

استاد۔ جی..... نہیں ہوا..... مگر باز تو.....

نوجوان۔ جی ہاں میں بھی یہی کہہ رہا تھا کہ میں اس باغیچے میں آ تو گیا ہوں مگر آگ بھی میں دنیا کو بھول نہیں سکا۔ اس سے تو میرا زخم اند بھی گہرا ہو گیا
ہے..... میں جب ان خوش فکر اور غم حیات سے بے نیاز لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ وقت یاد آ جاتا ہے جب میں بھی ان جیسا تھا
..... (اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپاتا ہے)

(استاد ایک ہلکا سا اشارہ کرتا ہے جس سے اس کی بے تکی کا اظہار ہوتا ہے)

نوجوان۔ (چہرے سے ہاتھوں کو ہٹاتے ہوئے) مجھے تو کبھی ایسا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ دنیا انسان کو اتنی بے مددی سے کھل دیتی ہے اور اس کی
آخری میں غم و کام کے تھنے ڈال کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ میں نے سمجھ میں اپنی آئندہ زندگی کی بڑی خوشگوار اور چمکیلے رنگوں والی تصویریں کھینچی
تھیں (دیر ب ہنسے) جب مجھے اس بات کا خیال آتا ہے تو کتنا عجیب سا لگتا ہے!..... افسوس! میری ان باتوں
کا پورا تو نہیں مان رہے؟..... دراصل ذہن کو اس طرح خالی کرنے سے بڑا آرام اور بڑا سکون ملتا ہے..... یقین کیجئے میں نے

استاد۔ اپنی چھٹی آنکھوں سے اُسے گھورتے ہوئے، تم حیران ہو کہ میں پھر بھی تمہاری زندگی پر رشک کرتا ہوں..... دیکھو بھی تم آج لاچار اور
 تمہارے سامنے مستقبل کے اقتدار امکانات پھیلے ہوئے ہیں..... لیکن میں!..... میں جو ایک غلام ہوں..... اپنی زندگی کے
 دن بھر کے کرچا ہوں اعدا اب آخری منزل کے دروازے تک پہنچ چکا ہوں..... میں نے اپنی آدمی زندگی سوتے سوتے گزار دی اور
 باقی ماندہ آدمی زندگی کو لٹو کے بیل کی طرح ایک ہی جہ رنگ و بواہ تیر و تار سانسے پر گناہ دوں گا..... میرے دل میں ہمیشہ آنے والے
 گل کی تانہ کی دھڑکنی رہی..... میں ہمیشہ گل گل کرتا رہا..... دن بہ دن..... بہتوں پر بختے ادھ سائل پر سائل گزرتے رہے ادھ میں اس پرانی
 ڈگر پر اپنی پرانی کنپٹیوں میں گڑھا..... ایک ہی قسم کے طاعنوں سے الجھتا..... ایک ہی قسم کی مشکلات، کامیابیوں اور ناکامیوں
 کا مسلسل شکر ہوتا سالہا سال تک چلتا رہا اعدا اب ایک منزل پر پہنچ گیا ہوں جہاں مجھے ہر چیز سے نفرت ہے..... مگر میرے اس
 مقصد کے لئے کہ کون سا ملتا تھا؟ میں نے ابتداء میں کوشش بھی کی مگر وہ تھک چکی تھی اور گزرتی..... میں قاسم بادشاہ کا کھیل کھیل رہا تھا
 جو کتنا بے پرواہی سے کھینچ کر سمجھتی ہو جوں کو اپنی طاقت کا علم دیا کرتا تھا ادھ جب مجھ میں اس کو گھبراہٹ یا کڑواہٹ تو وہ اپنے دباؤوں سے کہا کرتا کہ
 مجھ میں اسے سلام کرنے کے لئے آتی ہیں.....

ادھ اب تمہارے ذہنی کی اختراعی قوت بھی ختم ہو رہی ہے۔ اب تم بھی ایک دھڑے پر آ جاؤ گے..... یہاں میری یہ بات کھڑو کہ یہ
 حالت مرث ایک سکول ماسٹر ہی کی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ تو کم دیش ہر انسان پر گزرتی ہے۔ ادھ یہ حالت تم پر بھی گزرے گی..... سنو.....
 خود سے سنو۔ کہیں کوئی غلطی نہ کر بیٹھنا..... اب تو تم اپنی حالت کا خیال کر کے خود کشی کا ارادہ کرتے ہو مگر تم ان خیالات سے بڑی
 آسانی سے واسطہ پکارتے ہو..... اس معاملے کو ہمیں چھوڑ دو سن رہے ہو نا..... تم جانتے ہو کہ کونسی چیز ہم مر رہیدہ لوگوں کو خود کشی
 سے روکتی ہے؟..... مرث یہی کہ اس سے محنت تکلیف ہوتی ہے..... یہ تکلیف ہم سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ ہم ہیں اتنی
 طاقت نہیں کہ ہم اس کو برداشت کر سکیں اور ہم جو آہستہ آہستہ موت کا شکار ہو رہے ہیں فیوں ذایک ہی دفنا اپنے آپ کو اس کے
 سامنے پیش کر دیں۔ مگر ہم ہیں اس کی ہمت نہیں..... میری ان باتوں کو پتے بانہ رواہ پھر اپنی تکلیفوں کا مقابلہ دوسرے لوگوں کے مصائب
 سے کر دو..... یہاں مجھے بھی ہمدردی کی ضرورت ہے..... مجھے اس بڑی دنیا میں اپنے ہمدرد کی تلاش ہے..... میں رہے ہونا مجھ
 ایسے بڑے..... گناہ گار کو ہمدردی کی ضرورت ہے!

نوجوان۔ میں..... میں نہیں جانتا کہ اب کیا کروں..... مجھے کچھ خبر نہیں..... مجھے تو اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ.....

(اندلی جانب ٹھٹھٹے دھڑے دھڑک رہی ہے۔ رٹھا مشیر داخل ہوتا ہے۔ اس کی دھڑکی سینہ ہے۔ اس کے چہرے پر گہری کیرم کا
 جال بچا ہوا ہے..... وہ اگر دینے پر کھڑا ہو جاتا ہے)

استاد۔ (دھڑکیوں کو ادھ مشیر صاحب)

مشیر۔ بھئی۔ میں آ جاؤں کوئی حرج تو نہیں؟ مگر چہ مجھے اجازت باہر سے طلب کرنی چاہئے تھی..... کہتے کوئی خاص بات تو نہیں ہوتی۔
 (اگر نوجوان کے پاس اگر کھڑا ہو جاتا ہے) تمہارا چہرہ مجھے کچھ افسوس ماد کھائی دیتا ہے۔

نوجوان۔ (استاد سے) انہیں میرا نام نہیں بتائیے گا (ادھ مدد دیتا ہے) مجھے کچھ شرم محسوس ہو رہی ہے۔

مشیر۔ (سکڑتے ہوئے) ادھ..... جی۔ ایف۔ ایس۔ ٹیچٹ.....

فرمان: یہی انا وہی امین ہوں جس نے کلمہ پڑھا تھا۔

استاد: (خوش ہوئے) اور میرا صاحب اب وہی فرمان شامی کرتا ہے۔

مشیر: یہی شامی اڑ گیا اس نے آپ کو کچھ سنا بھی ہے؟

استاد: ہاں فرشتہ ہی تھا۔ وہ ہر بات شری کر رہا ہے۔

مشیر: یہ بات ہے!

استاد: (مرکبہ پر) اس نے تو میری رشک کی آگ بھڑکادی ہے۔

مشیر: جندہ رشک کی آگ؟

استاد: صاف کیسے گامیں بھی مزدت ہے زیادہ جذباتی ہو گیا ہوں۔

مشیر: آخر کس لئے؟

استاد: اپنی صحبتوں کے لئے۔

مشیر: (چل کر) آپ..... ارے آپ کب سے اوکھیڑوں میں اُٹھنے لگے؟

استاد: دیکھئے میرا صاحب کم از کم آپ تو اس معاملہ میں میری تائید کریں گے ہی..... میں اپنے اس دوست و نصیب العمری کے متعلق کچھ بتاؤں

تھا کہ بڑے ہو کر انسان کی کس قسم کی حالت ہو جاتی ہے۔

مشیر: (عجب بیت خوب) (بہ تماشہ قہقہہ لگاتے)

استاد: آپ نہیں رہے ہیں؟..... ٹھیک ہے آپ تو ہمیشہ ہنستے ہی رہتے ہیں..... آپ کا تو زندگی کے متعلق ایک مخصوص نظریہ ہے۔

اور یہی ہے کہ جب انسان کا زندگی کے متعلق ایک مخصوص نظریہ ہو جاتا ہے پھر اس کے لئے زندگی مشکل نہیں رہتی اور نہ ہی اسے بڑھاپا

پر لگتا ہے۔

مشیر: (نقرو) اسے سنت بھیجئے اس پر..... ہاں یہ بتائیے کہ آپ بھی اپنے آپ کو بڑھا چاہتے ہیں؟

استاد: ہاں میں احراٹ کرتا ہوں کہ میں.....

مشیر: (پھر یہ تماشہ قہقہہ لگاتے) ٹھیک ہے..... مگر آپ اپنے آپ کو بڑھا کر کتنا عرصہ زیادتی اور انتہائی تعجب کی بات ہے اور صاحب

اگر آپ اپنے آپ کو بڑھا چاہتے ہیں تو بتائیے میں اپنے آپ کو کیا کہوں؟

استاد: (قد سے دھت ہو کر) آپ؟..... آپ؟

مشیر: میرے دوست مجھ سے سنئے کہ آپ دراصل کون سی منزل میں ہیں؟ میرے ایسے عرصہ سیدہ اور کہیں سال انسان کی بات پلے بازہ لیجئے

کہ آپ..... یعنی آپ انتہائی خوش بخت انسان ہیں!

استاد: لیکن اس سے..... اس سے آپ کا مطلب؟

مشیر: دیکھئے اگر دنیا میں انسان کے لئے کوئی تسلی اور اطمینان کی منزل آتی ہے تو وہ منزل ہے جس میں ان دنوں آپ کا قیام ہے..... مگر

آپ پر یہ بات کبھی مدش نہیں ہوئی کہ آپ زندگی کی دریاں اور انتہائی پرسترت نفاؤں میں سانس لے رہے ہیں۔ آپ کی تسکین و

راحت کے لئے ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ آپ اس وقت پوری طرح مطمئن ہو سکتے ہیں۔
 استاد: مگر میں تو زندگی کی اتنی تکلیف دہ منزل تک پہنچ گیا ہوں۔ میرے مصائب کا پیارا لبریز ہر لمحہ چمک رہا ہے۔
 مشیر: کیا کہتے ہیں آپ کے!

استاد: مجھے آپ کہیں کوئی ایسا رویہ یا کئی ایسی عادت بتائیے۔

مشیر: پہلے میں آپ کو آپ کی ذات ہی سے روشناس کرواؤں گا۔ احساس کے بعد جب آپ مطمئن ہو جائیں گے تو پھر میں آپ کو اپنا حقیقی وجود دکھلاؤں گا۔ جو واقعی مطمئن ہو۔۔۔۔۔ لیکن آپ کہہ کر رہے تھے؟۔۔۔۔۔ یہی کہ خوشی و مسرت کے خواستہ فٹنگ میں اپنا سر جاکھسائی میں نہ رہے۔ بات بڑے فتنہ مندوں سے سنی ہے۔۔۔۔۔ آپ بھی سوچیں۔۔۔۔۔ دیکھئے ایک آدمی اپنی ہر طرف جہان میں اپنی پسندیدہ عادت سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ پھر اس کے اندر گوشت و عذرا ہو نہاد، اندر غیر معمولی خیر و نعت کے پتے بھی کھیلنے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ خود بھی صحت مند ہے اور اپنے کام کو اچھی طرح سراہا ہوا ہے۔۔۔۔۔ اسے ہمیں کوئی علم نہیں کہ وہ کچھ ایسا ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی کامیابی سے گزار جائے گا۔۔۔۔۔ وہ آدمی عموماً ایک اعلیٰ درجے کا مہر کہلاتا ہے۔ یعنی وہ بہت سے واقفوں کی تربیت کر رہا ہے اور یہ کام ایسا ہے جس میں تفریح ہے۔۔۔۔۔ دلچسپی ہے۔ خوش آئند پوش و پوش ہے۔۔۔۔۔ اس طرح آدمی ایک شالی زندگی گزار رہا ہے۔ اب اس سے زیادہ اس آدمی کا کیا پائیے۔۔۔۔۔ آپ سمجھ رہے ہیں؟

استاد: دماغ ماہک ہی آپ ہی بتائیے اس آدمی کو اب کیا کرنا چاہئے؟

مشیر: (آہستہ سے) اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ اسے کیا کرنا ہو گا میں تو اسے صرف اتنا کہوں گا کہ وہ استاد کہے اس وقت تک انتظار کریں۔ جب تک وہ حقیقتاً بڑھا نہیں ہو جاتا۔۔۔۔۔ یعنی میری عمر کہ نہیں پہنچ جاتا۔۔۔۔۔ جب تک اس کا پیشہ نہیں چل جاتا۔۔۔۔۔ جب تک اس کے ہم سنوں کے بار دوست۔۔۔۔۔ اس کے عزیز ترین رشتہ دار اس کے جبری دوست موت کا شمار نہیں ہو جاتے۔۔۔۔۔ جب تک اس کی کڑھیاں اس کی زندگی کو زندگی نہیں دے سکتیں۔۔۔۔۔ بلکہ وہ نہیں بنا رہیں۔۔۔۔۔ اور جب تک اس کی زندگی سے ہر چیز نکل جاتی ہے۔ نہیں ہو جاتی جس کے ہمارے وہ زندگی گزار سکے۔۔۔۔۔ اور جب اس کی حالت ہو جائے تب اسے اس قسم کے شگ و شگافت کو سنے دیجئے۔۔۔۔۔ اور اپنے مصائب کا ذکر ہمارے کرنے دیجئے تب وہ اپنی گردش زندگی پر ایک نکرڑا سے انداز میں دھماکا لگائی مٹھکے۔۔۔۔۔ اپنی کھٹی ہوئی خوشیوں کو یاد کرے۔۔۔۔۔ تب اگر وہ ناشکری اور عدم ایمان کے انفال کے قیاس سے شکایت نہیں ہو سکتی!

(ادامک اپنے اس خیرہ کتے پر ہنسنے لگتا ہے)

استاد: میٹر صاحب! مجھے بہت افسوس ہے۔۔۔۔۔ یقین مانتے مجھے اپنی باتوں کا بہت افسوس ہے۔ میں بے ایمان ہوں۔

مشیر: (اٹھتے ہوئے) بہت خوب۔۔۔۔۔ آمین! آمین! آپ تو کچھ کہتے۔۔۔۔۔ دیکھئے یہاں پہلے سبق ختم ہوتا ہے۔

استاد: آپ کی گفتگو میں بے پناہ منطق اور ذہنی دلائل ہیں۔۔۔۔۔ میں اب آپ کی بات سمجھا۔

مشیر: (پہلو اٹھا کر) میں منطق اور دلائل۔ بڑی حیرانی کی بات ہے۔۔۔۔۔

استاد: یعنی آپ کا مطلب ہے کہ میں بے پناہ دلائل اور خفایا منطق کو قیاس نہیں کر سکتا؟۔۔۔۔۔ مگر مشیر نے۔۔۔۔۔ مسائل اس پر کھینچے اور خفایا دلائل میں کوئی ایسا نہ جس وجہ سے ہے۔۔۔۔۔ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔ آپ یقیناً غلط کہہ رہے ہیں۔۔۔۔۔ آپ کی اس گلی۔

میرزا کا کہنا تھا کہ میں.....

زیراں.....

میرزا کا کہنا تھا کہ میں..... اب چھوٹے اس بات کو پسند نہیں کرتے۔ اس کے متعلق کوئی بات بھی نہ کیجئے۔
 اسکا..... میرزا صاحب! آپ میں سے کتنے دل لہلہ ہو رہے ہیں؟ کبھی یہ شخص کبھی نہیں آتا۔
 میرزا صاحب! ایک رات میں..... (آہستہ) دیکھئے مجھے سب کے نظر آ رہے ہیں..... میرزا صاحب! میں نے ایک مری
 یہاں لگا دیا ہے..... وہ مدت کتنی..... میرزا صاحب! وہ مدت دہائی ہے..... (آہستہ) اب آپ بھی کچھ ہی
 میرزا صاحب! کتنا ہیں..... وہ مدت لگا..... وہ فیل تاروں میں رابٹ پر تھا..... ہم سب وہ رات بھی میں آ کر رہی۔
 ہم وہ مدت کتنی..... ہم سب وہ مدت کتنی..... ہم سب وہ مدت کتنی..... ہم سب وہ مدت کتنی.....
 نظر آتے ہیں کہ جب وہ مدت لگا رہی ہے اتنا خوش و خوش ہیں..... اب میں سب کے ساتھ گیا ہوں اس زندگی خود ایک بہت
 بٹا ہوا ہے..... ایک طبع (میرزا صاحب!) میں ان..... ایک خالق ایک طبع..... لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک مادہ ایک طبع
 بھی ہے..... ایک خالق خواب..... (میرزا صاحب!) وہ مدت کتنی ہے، کتنے صاحب میں مایات اب بے معنی ہوتی کر رہا ہوں؟
 میرزا.....

میرزا..... دیکھئے میرزا نے یہ سب انہی باتوں کو نہیں..... ان کا ایک مطلب ہے ایک مقصد..... میرزا صاحب! میں نے کہا ہوں
 زندگی ایک مذاق ہے..... مجھے تو یہ مذاق ہی نظر آتی ہے..... ایک ایسا مذاق جو مجھے سے کیا گیا ہے۔ جو ہم سب سے کیا گیا ہے..... نہیں
 کہ تاسا، ضابطہ سے کیا گیا ہے۔ اور انسانیت ہی کے نام پر کیا گیا ہے!..... دراصل ہم تو ایک کھیل کھیل رہے ہیں..... ہمیں ہم خود نہیں کھیل
 رہے کہ ہم کہہ کر دیا جاتا ہے۔ اور ہم سب اس کھیل کو ایک طبعیت نام دیتے ہیں..... انا انا..... ایک جیسی نام..... سب
 ہیں سوچتے ہیں کہ جیسا کہ سرور اور سکون والہ جہان کہاں ہیں؟..... مگر تو غلطی میں تیرا دھننے والی بات ہے نا..... ہر کوئی سمجھتا ہے
 کہ اس کا ہمارا مطلب ہے..... خوش ہے اس کے لئے زندگی ایک جیسی طبع ہے..... وہ اپنے ہمارے پر رٹ کر رہے..... خدا اور قدرت کی آگ
 میں جلتا ہے..... لیکن وہ اپنے ہمارے سے کبھی نہیں بڑھتا کہ کیا وہ واقعی خوش ہے، مسرت ہے۔ اسے سکون اور جیسی میرزا؟..... سکون اور
 جیسی حواس دنیا میں کبھی ہی نہیں..... کسی اور دنیا میں بھی نہیں..... آپ ہی کہتے کہاں ہے خوشی، اطمینان، سکون، راحت؟.....
 کبھی ہی نہیں..... کسی جگہ بھی نہیں..... نہ ہی کبھی میں..... نہ جہاں میں..... نہ ہی کبھی میں..... نہ ہی کبھی میں..... نہ ہی کبھی میں.....
 دہم ہے۔ ایک فریب..... ایک بہت بڑا سبب..... اور بس..... انا کتنا طبعیت مذاق ہے..... اگر کوئی انسان اس
 مذاق میں نہ رہے کہ وہ بہت قدر ہے اس مذاق کو دیکھتا تو یہ تمام سحر دیکھ کر کتا ہوتا..... کتا لعل اٹھاتا.....

(اب انہی اس کا مذاق نہیں دے سکے اس لئے وہ جہاں میں ایک وقت آ جاتا ہے)

میرزا (آہستہ) میں کہتا ہوں.....

زیراں.....

میرزا کا کہنا تھا کہ میں.....

استاد: (بڑے غصے سے کڑکھاتے ہوئے) مجھے معلوم تھا کہ یہ بد فیزی ہو کر ہے گی..... ایک بار کیا لاکھ بار منع کر چکا ہوں۔ (دھمکتے ہوئے).....

.... ارے کون سے لڑکے نے گیند کو بگ مارا ہے (دھمکتے ہوئے)

ایک لڑکے کی آواز: (باہر سے) جناب م..... م

استاد: ارے تم.... تم.... تم.... کم بخت نظر سے او بھل جوتے ہی پھر شرارتیں شروع کر دیں۔ بد بخت چھوڑ کر عین طے تم سے

بار بار کہا ہے کہ میری کڑکھانے کے سامنے اس قسم کی سوئیں دیکھا کرو..... اب دیکھتے جاؤ۔ چھٹی کا مدد یاد کرو گے گا..... اور آخر آؤ تم نہ

..... ان ان ابھی آؤ..... فداؤ (اپنی مٹری کے پاس آ جاتا ہے)..... یہ معاش!..... میرا صاحب آپ ہی اس کم بخت کا علاج کرنا

مشیر: آپ اسی لڑکے کے متعلق اگلے روز مجھ سے ذکر کر رہے تھے نا؟

استاد: جی ہاں..... یہ تو مجھے ناقابلِ اصلاح نظر آتا ہے..... دیکھئے میں نے اسے بلایا ہے..... آپ اسے ایک لٹریکے لیجئے.....

پھر آپ ہی بتائیے اس لڑکے کا کیا جلتے (لڑکا سر کو دکھانے اندھا داخل ہوتا ہے)..... م..... م..... بتاؤ اپنی اس حرکت کا آپ کیا جواز

پیش کر دے گا (خاموش رہتا ہے)..... کچھ بھی نہیں؟ حسبِ معمول کئی وجہ نہیں؛ ارے تم خوب جانتے ہو کہ نہیں اس میدان میں

کھیلنے کی قطعی اجازت نہیں؟

لڑکا: سکا اپنے میں بھول گیا تھا

استاد: بھول گئے تھے ارے بھول گئے تھے؟ اچھا یہ بات ہے تو اب ہمیں قہاری اس یادداشت کا کچھ دیکھ بندوبست کرنا ہر گز مشیر سے

مشیر: آپ کا کیا خیال ہے؟

مشیر: (لڑکے سے) میرے بچے تم کیوں ان کا حکم بھول گئے تھے؟

لڑکا: (اڈتے ٹٹتے) جی... جی... میں کچھ جوش میں آ گیا تھا۔

استاد: جوش!

لڑکا: جناب میں بے انتہا خوش تھا۔

مشیر: ہو ہو (زحمان بھی مرنے سے اپنے کان کھینچ کر بیٹا ہے) یہ رہی بات!

استاد: (لڑکے سے) خوش تھے؟ ہیں؟ اس لئے کہ آج نہیں سزا دل سکی؟ کیوں اسی لئے خوش تھے نا؟

لڑکا: (سرخ ہونے لگا) جی ہاں

استاد: سنا آپ نے مشیر صاحب؟

مشیر: جی ہاں میں سنی رہا ہوں..... اور میرا خیال ہے کہ میرا زبوان دوست ٹیپسٹ بھی سنی رہا ہوگا؟

استاد: آپ کا مطلب ہے کہ.....

(وہ موضوع کی تبدیلی میں کہہ بیٹا ہے)

مشیر: دیکھئے نا اس لڑکے کا معاملہ تو خوشی کے متعلق اس قانون کے مطابق ایک استثنائی حیثیت سے ہوتے ہے جس کا ذکر ابھی ابھی میرا

نوجوان دوست کر رہا تھا۔

نوجوان۔ اچھے بچے ہیں، مگر وہی استثنائی کیفیت جو کلون کرتا تو بتاتی ہے۔

استاد بہ صرف ایک استثنائی حالت ہے، لڑکا چٹی چٹی، سمجھتا ہے اب کو دیکھتا ہے۔

نوجوان۔ یہاں یہ لڑکا اس طبقے کا غایتہ ہے جو اس استثنائی حالت کا خالق ہے۔ دیکھتے ہیں اپنی بات سے کچھ نہیں ہٹتا۔
یہ صاحب اب حقیقی مقصد کی طرف واپس آ رہا ہے (استاد صاحب) ظاہر آپ کو گفتگو یاد ہوگی جو مسٹر ناگ کے آنے سے پیشتر اس کیلئے کے ایام کے متعلق کر رہے تھے افسانہ کو زندگی کا حسی تجربہ خیال کر رہے تھے۔ اب میں اپنے اس دعوے کو دہراتا ہوں کہ تعلیمی ایام ہی زندگی کا حسی تجربہ سمجھنے ہیں۔ زندگی میں صرف یہی ایک وقت ہوتا ہے جب انسان کو حقیقی مسرت کا تجربہ ہوتا ہے۔ دیکھتے ہیں لڑکا خود اعتراض کرتا ہے کہ آپ کی سزا سے بچ نکلنے پر وہ انتہائی مسرور اور شادمان تھا۔ اسی خوشی کا تجربہ صرف سکول کی اسکے دلوں میں ہوتا ہے۔ یہی غیر ذمہ داری ہے جو مسرت و انبساط کا موجب ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ بعد میں زندگی میں صرف اتنی سی بات پر کہ وہ بیدار سے نکلے کون اتنا خوش ہوتا ہے۔ انسان کب اتنی معمولی معمولی باتوں پر جیون ہو کر خوشی سے اچھل پڑتا ہے؟ (اسے لڑکے کی سرچشما کا احساس ہوتا ہے) اور برصغیر کی گلیں غلام غلام مارتی کر رہی ہیں۔

استاد۔ (لڑکے پر ایک نظر ڈال کر) دیکھئے یہ سوال تو اب ادھی علی علی پر دوبارہ فرما رہا ہے کہ کیا واقعی خوشی کے لئے عمرانی معمولی واقعات جو ہر مسرت پریشانی کا باعث بنتے ہیں وہاں ہائیں یا کہ نہیں؟ مسٹر ناگ آپ اس معاملے کے متعلق کچھ کہیں گے؟
مشیر۔ جی ہاں تو خیال ہے کہ اس قسم کی ہر مسرت پریشانیوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی ہوتی چلتی ہے کہ ان سے انسان کے قلب و دماغ وسیع ہوتے ہیں۔

استاد۔ (لڑکے سے) ٹھیک ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب نہیں دوبارہ خوش ہونے کا موقع فرزند دونوں۔ نہیں اس کے لئے مسٹر ناگ کو فکرو گز رہا ہے۔ (لڑکا ہلکے سے ہنستا ہے) لیکن میں نہیں اتنا کہہ گا کہ اس خوشی میں ہیبت زیادہ آگے نہ بڑھ جائے۔
لڑکا۔ بیت اچھا جناب (دوبارہ وہی ہنس کے ہنسنے لگتا ہے)۔

استاد۔ مناسب ہے کہ فٹ بال میں ساتھ لیتے جاؤ (لڑکا فٹ بال اٹھانے کے لئے آگے بڑھتا ہے)
مشیر۔ (م فٹ بال کو فٹ بال سے پیشتر ایک خیال آتا ہے) بھئی دیکھو اس واقعہ سے کچھ ایک بات یاد آگئی ہے۔ مسٹر مسٹ فٹ بال کے کھلاڑی تو نہیں جو؟

نوجوان۔ جی میں بھی سال تک سکول کی فٹ بال میں کھیلتا رہا ہوں۔
مشیر۔ بہت خوب! میرا خیال ہے کہ پرانے طالب علموں کی ایک ٹیم بنا کر اسے اگلے چنے سکول میں کھلایا جائے۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی ٹیم میں کھیلو گے؟

نوجوان۔ (بیت خوش ہوتا ہے) جی واقعی آپ ٹیم بنا رہے ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو میں بڑی خوشی ہے کھیلوں گا اگرچہ میں مدت تک نہیں کھیلا اور مشق نہیں کر سکا مگر میں بڑی خوشی سے کھیلوں گا۔

مشیر۔ دیکھو بھئی ابھی اس میں ایک آدمہ ہوتا تو ہے ہی تم اس طرح سے مشق کر سکتے ہو۔
نوجوان۔ جی ہاں میں خود بھی اس معاملے میں بڑا مشتاق ہوں۔ بخدا مجھے پسند ہے کہ بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔ میرے دل میں خوش

کہیں سے رہا ہے۔

مشیر۔ (سکھتے ہوئے) بھٹل ا۔

نوجوان ا۔ (کسی عورت کو دیکھ کر) میں خوش ہوں گا۔ جیسے پرانے دن وٹا آئے ہیں۔ پھر وہی کیل کھیتے ہوئے کتا آئے گا۔ (اگر وہ) آج سے میں ناشتے سے پیڑ کھانے کی خوش کیا کروں گا۔ (مطرح) جناب کچھ میں اس حیثیت سے کہیں گا؟

مشیر۔ خبر تو بعد میں دیکھا جائے گا۔۔۔۔۔ تم ہی بتاؤ کہ تم کوں سی جگہ پر کھیتے رہے ہو؟

نوجوان۔ بخری کورڈز۔ خیر بھئی اس کو۔ میں آپ کی ترتیب کر گڈ ٹائمنگ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے جہاں کھیتے ہیں وہیں ہی خوشی سے کیل ملے گا۔

آستان۔ سیت اچھا۔۔۔۔۔ وہیں سے تم کو ہر جگہ کیل کر ڈی خوشی ہوگی خوشی ہوگی! ا میں نے تم سے خوشی کے متعلق کیا کہا تھا؟

نوجوان۔ اے سرے اللہ۔۔۔۔۔ مگر میں اس طریقے پر تو نہیں سوچ رہا تھا۔۔۔۔۔

آستان۔ میں انسان تمہاری عمر میں سوچ ہی کب سکتا ہے! کیوں مشیر صاحب! نوجوانی کی حیثیت تو یہی کہ ہے کہ فٹ بال کے کیل میں ہی ہے

خوشی اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اور میں؟۔۔۔۔۔ کیل صرف کیل فٹ بال کھیتے سے ہی جوانی کا دل بھل جائے۔۔۔۔۔ میں جب

انسان کی یہ حق ایہ جقت یہ کھڑی ہونے کا احساس تم پر جاتا ہے تو اس کی زندگی میں کچھ نہیں رہتا۔۔۔۔۔ اس کے بعد انسان

ایک ہڈ سا ڈھانچہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔ خواہ اس ڈھانچے کی عمر ساٹھ برس کی ہو جائے یا چوبیس کی مگر ہڈ سا ڈھانچہ ہی ہے۔ (دقت)

لڑکا۔ (مشیر سے) جناب میں فٹ بال نہ سکتا ہوں؟

مشیر۔ اورو فٹ بال۔۔۔۔۔

لڑکا۔ اورو! ایک آستانہ فٹ بال! جناب مجھے یاد آیا کہ جب میں سکول میں چٹھی ہونے کے بعد آپ کے پاس آیا تھا اس وقت اپنی سیر کرنے

مجھے یہ پیغام آپ تک پہنچانے کے لئے دیا تھا۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ (سوجھتا ہے) اور میں وہ بھی بھول گیا۔

(مشیر فٹ بال لڑکے کو ملے دیتا ہے)

لڑکا۔ فٹ بال کو کھیتے ہوئے، میں مجھے یاد آیا۔ اسے دیکھ ل گیا ہے۔

آستانہ۔ دیکھو جس دھکت کھڑا ہوتا ہے، کیا؟ کیا کہا؟

لڑکا۔ جی اپنی سیر کر دیکھ ل گیا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں، اطلاع آپ تک پہنچا دوں۔

(واپس ہاتھ ملتا ہے)

آستانہ۔ دیکھو (جسے تباہ کر دیتا ہے)۔۔۔۔۔ تم فٹ بال اور آستانہ۔۔۔۔۔ دم نہ دے رہے تھے، اپنی سیر کرنے تم سے ہی کہا تھا کہ میں دیکھ ل گیا

ہے؟۔۔۔۔۔ مگر اس نے خود مجھ سے اس کا تذکرہ کیوں نہیں کیا؟

لڑکا۔ اس نے مجھ سے ہی کہا تھا کہ میں آپ کو اطلاع دے دوں۔۔۔۔۔ وہ خود اپنے مزے دل کو مٹانے گیا ہے۔ جب میں اندر آتا تھا تو مجھے

بڑے دردناک سے میں دیکھا تھا اس نے مجھے صرف یہ پیغام دیا اور خود ہٹا گیا۔

انتہا۔ (وہ انتہا بڑی مسرت سے) خوب..... بہت خوب مگر مجھے یقین نہیں کہ اگر وہ لڑکے سے تو کہا گیا تھا کہ وہ ذلیل حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

انتہا۔ لیکن میرا اپنا بھی تو یہی خیال تھا..... میرے ادا آپ کے درمیان اس کے متعلق گفتگو بھی ہوئی تھی۔ لڑکے کی عمر بھل سزورس کی ہوگی۔
..... (لڑکے سے) یہاں نہیں بیٹھیں گے تاکہ تم نے غلط پیغام تو نہیں دیا؟..... کہوں یہ پیغام ٹھیک ہی تھا؟

لڑکا۔ بالکل جانب بالکل درست!

انتہا۔ اچھا..... مجھے اس سے بڑا انتہا خوشی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا (مشر سے) اب تو اس لڑکے کے سامنے راپیں کھل گئی ہیں.....

اس نے یہ افراد کسی خاص محنت کی بنا پر نہیں یا۔ پچھلے برس اسے کرکٹ کا اعزازی نشان دیا گیا تھا۔ وہ سکول کی ٹیم میں فٹ بال بھی چڑی اچھی طرح کھیلتا ہے۔ اور قیام گاہ میں بھی وہ بڑی خوش اسلوبی سے رہتا تھا۔ دوسرے لڑکوں پر اس کا بڑا اچھا اثر تھا۔ اس کے سکول چھوڑنے سے پیشتر چارویں یہ تمام گاہ پندرہ سال میں پہلی بار اتنی پسندیدہ نظروں سے دیکھی جائے گی! مشیر صاحب وہ لڑکا تھا ہی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک..... چار چھوٹے اس بات کو سمجھنے لگا کہ خوش فرائیگی (مشر اور وہاں) اس کے ساتھ انتہا مسرت پر ایک دوسرے کو کھینچیں گے بڑی پر مسخ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ (مشر بھی جھانپ رہا ہے) ادا میرے خدا..... مجھے معلوم ہے اب آپ کیا کہنے والے۔ ہم ہیں..... میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا اعلاہ بالکل درست ہے۔ میں اپنے آپ کو اس وقت لا انتہا بلند ہوں پر محسوس کر رہا ہوں (لڑکے کی طرف دیکھتا ہے) ادا سے تم اب یہاں کیا کر رہے ہو؟ بھاگ جاؤ۔ ادا دیکھو اٹھیں تیسرے کھانا کہ واپس آتے ہی میرا میرے پاس آئے۔۔۔۔۔ (لڑکا چلا ہوا ہے)۔۔۔۔۔ مشیر صاحب آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ آپ کی رائے ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا تھا وہ صرف بھرت کی ثابت ہوا۔ ہم درحقیقت خوش قسمت ہیں۔ ہم میں سے ہر کوئی خوش قسمت ہے۔ اگرچہ ہماری بھی مشکلات ہیں۔ مگر وہ آپ کے مصائب کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ہم ان مشکلات سے فراہم حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم انہیں بھول سکتے ہیں ادا ہم ان مشکلات سے کچھ نہ کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں مگر آپ اس نعمت سے محروم ہیں۔ صرف آپ ہی ایک ایسے انسان ہیں جس کے لئے خوشی کا حصول بہت مشکل ہے۔
..... خوشی آپ کی پہنچنے سے باہر ہے ادا کی پرچھے تو آپ ایسے انسان کے لئے خوشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مشیر۔ کیا یہ سب کچھ میں نے کہا تھا؟

انتہا۔ ادا نہیں کیا؟

فرحان۔ جی..... آپ کی باتوں سے یہی نتیجہ ادا کیا جاسکتا ہے..... ادا میں..... میں نے تو اپنے آپ کو بہت سچ پر کار بہت بڑی ذیادتی کی ہے۔

انتہا۔ آپ نے مجھے تہیہ کر دی ہے۔ آپ نے مجھے راستہ دکھا دیا ہے اس وقت جبکہ میں نے بھی اپنی گزشتہ زندگی کے متعلق بڑا جذباتی نتیجہ اختیار کر لیا تھا۔

مشیر۔ میرے چھوٹے ان باتوں کو دہرانے سے فائدہ۔

فرحان۔ ادا مشیر صاحب جب مشیر صاحب اس قسم کی باتیں کر رہے تھے تو آپ ان پر بے تحاشہ قہقہے لگا رہے تھے!

مشیر۔ بھئی میں اپنی اس حرکت پر نادم نہیں بلکہ خوش ہوں۔

استاد۔ آپ کا مطلب ہے کہ آپ یہ باتیں سمجھنے سے نہیں کر رہے تھے؟

مشیر۔ ارے پھر وہی پرانا سوال!

استاد۔ آپ جواب دیجئے۔ کیا آپ واقعی اُنھے ناخوش ہیں؟ یا کبھی کبھی آپ بھی اس بوجھ کو اس شکا دینے والے بوجھ کو بھول جایا کرتے ہیں۔

مشیر۔ میں میں (پھر یہ تلافی قہقہہ لگاتا ہے)

فرحان۔ نہیں آپ اس بوجھ سے کبھی بھی غافل نہیں ہوتے۔ میں جانتا ہوں ادا بھی طرح جانتا ہوں۔

مشیر۔ (پھر دودھ پلٹے ہوئے ایسی سٹی جس میں ڈھکیں پایا جاتا ہے، نہیں! نہیں!! یہ بات مجھ تک ہی رہنے دو تم دونوں نہیں جانتے کہ تمہاری زندگیوں کتنی پر لطف ہیں!

استاد۔ (دستی ہے، لیکن میرے سوال کا جواب یہ تو نہیں ہے۔

مشیر۔ (اسی دستی ہے، اس کے برعکس میں تو یہ کہیں گا کہ آپ کے سوال کا یہی مکمل مفصل اور آخری جواب ہے، آپ نہیں سمجھتے؟) (پھر جھپٹتا ہے)

استاد۔ (بے تابانہ، ایسے لگتا ہے جیسے آپ کی مذاق کی حس غیر معمولی تیز ہے۔

مشیر۔ (دست لٹ پٹے ہوئے، لیکن یہی تو اصل نکتہ ہے۔

فرحان۔ نکتہ؟

مشیر۔ ارے تم ابھی تک میری مدح 'میرے دماغ' اور میری باتوں سے اس کا اندازہ نہیں لگا سکے؟ میری باتوں سے نہیں کتنی اشارہ نہیں گا؟ کہو! ہر یا میں خود ہی اپنے آپ کے متعلق زیادہ کچھ کہہ دوں۔

استاد۔ جی ہاں۔ مزید

مشیر۔ ارے کیا فضیلت بات کی ہے خیر چھوٹی ہے اسے۔ آپ یہ بتائیے کہ کیا میں ناخوش نظر آتا ہوں! کیا میرا اندازہ کہ اس قسم کا ہے جیسے میں آپ سے رحم اندہ ہمدردی کا طلب گار ہوں؟

استاد۔ (بھلے یقین کرتے ہوئے) مگر آپ آپ خود نہیں بتائیے گا؟

فرحان۔ آپ اتنی فدا سی بات بتا کر کیوں مجھ سے ذہنوں کو نجات نہیں دہتے؟

مشیر۔ (بھی آپ دونوں ہی کتنے پر لطف آدمی ہیں۔ مگر کہیں دونوں کو یہ خیال تو نہیں کہ میں آپ دونوں پر رشک کرتا ہوں؟) (دونوں کے چہرے پر

قیم۔ ماضی، ادا، تمہیں کا اظہار ہوتا ہے، مشکبہ ہے تمہارا یہ خیال ہے۔ تم یہی سوچ رہے ہو غریب تمہارے زندگی کے متعلق علم میں

قد سے اضافہ تو ہوا لیکن مذاک قسم تمہاری نظر تو میری زندگی کے صرف غور و فکر پہلو پر ہے۔ (وہ پیشہ جاتا ہے اور بے بسے ہاتھ لگاتا

ہے، مگر مینے مجھے کوئی مصیبت مد پیش نہیں نہیں ایسے مصائب سے دوچار ہوں جن کے بیان سے ہی آپ کو بھی دھکی کوئی (وہ اپنے

سرد کر دیتے ہیں، میکانیکی نقطہ نظر سے دیکھتے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں لیکن اس بوڑھے کے

تجربے کو خوش اسلوبی سے ادا کرنے کے لئے دو ہزاروں کی ضرورت ہے ایک بے دماغ ضمیر اور دوسری بہترین یادداشت)

ایک ادنیٰ قسم کا ہے کہ میرے پاس ۷ دندہ جینی مرچ ہیں اس کے علاوہ جیسا کہ آپ نے کہا ہے میرے پاس ایک انسانی خصوصیت
 بھی ہے۔ اودہ ہے جس مطلق اودہ خصوصیت ایسی ہے جس سے بڑھاپے کا تجربہ اودہ بھی خوش گوار ہو جاتا ہے۔ اس کا پیش
 یہ ہے کہ حضرات یہ دینا تو ایک بڑا پر لطف تماشا ہے ایک ایسا تماشا جس کا مشاہدہ ایک آرام دہ جگہ پر بیٹھ کر کرنے ادا اس
 کے سکھانے سے بڑا لطف دیتا ہے۔ اودہ اس کا سحر اثر نے میں تو بے پناہ لطف آتا ہے۔ اگرچہ یہ لطف بعض اوقات بڑا مبہم
 ہوتا ہے مگر اس کے ابھام میں بھی معنی پوشیدہ ہوتے ہیں اودہ یہی لطف ہے جس کی وہ نمائی میں میں انسانیت کی یہ نکاحیہ تمثیل تیار
 کر رہا ہوں انسانیت کی یہ نکاحیہ تمثیل جو بڑی سداں، بڑی حسین اودہ بڑی دلچسپ ہے یہ نکاحیہ تمثیل نہ سکول کے دنوں
 سے نہادہ جوش انگیز ایک نوجوان کے خیال دل سے نہادہ حیرت خیز ایک ادنیٰ سکول ماسٹر کی زندگی بھر کے کامائے نمایاں سے نہادہ
 پرکشش اودہ بادب تو رہا ہے یہ ہے وہ مانگیر نکاحیہ تمثیل جو آسانی بھی ہے اودہ شاید ابھی بھی (غیر میں اس ابدیت کے
 سکھ سے کوئی سہکا نہیں) مگر مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ اب ختم ہوئی کہ ہوئی مگر یہ جب بھی ختم ہوتی ہے اس کا انجام ہر مرتبہ اودہ
 خراب ہی ہوتا ہے جی ہاں مجھے اس بات کا مکمل یقین ہے خیر ان باتوں کو بھر دینے مختصر یہ تمثیل یہ تماشا
 خیلوی طور پر بڑا بڑا اچھا بڑا پر لطف اودہ صحت مند ہے (آہستہ سے ایک لمبا سانس لیتا ہے) میں اس تماشا سے بڑا لطف
 اٹھا رہا ہوں اودہ جتنا مجلس میں آج ہوں اس سے پیشتر کبھی بھی نہ تھا۔ (خوش ہوا ہے)

خدا گواہ کوئی لطفِ زندگی نہ رہے
 الہی پاؤں کو رہ آشنائے منزل کر
 جو نام کا ہے تغیر وہ کب تغیر رہے
 فداسی دیر میں رازِ جمال کھل جائے
 یہ فصلِ گل کا ہو عالم تو پھر خزاں کیا ہے
 نگاہِ سیکڑوں جلوئے تراش لیتی ہے
 وہی نگاہِ حقیقت شناس ہے جس میں
 نگاہِ شوق سے ہے عرضِ حُسن کی تحریک
 یہی ہے گردشِ دوراں کا ماحصل شاید
 دلِ حزیں کے تقاضے کہ حالِ دل کہہ دوں
 یہ کیا ستم ہے کہ اسے چرخِ وار کو نہ نظام
 وہ بے خودی ہے غلط ہوش سے جو خالی ہو
 خودی کے ساتھ اگر کیفِ بے خودی نہ رہے
 خضر کی بھی مجھے پروا ہے رہبری نہ رہے
 خوشی وہ کوئی خوشی ہے جو دو گھڑی نہ رہے
 نگاہِ جلوہ طلب میں جو بے خودی نہ رہے
 کہ گل تو ہوں مگر ان میں شگفتگی نہ رہے
 ہٹے جو پردہ تو یہ مشقِ آذری نہ رہے
 الم، الم نہ رہے اور خوشی نہ خوشی نہ رہے
 جو یہ نہ ہو تو تقاضائے جلوہ گی نہ رہے
 کہ دو دلوں میں کوئی ربطِ دوستی نہ رہے
 وفا کی شرط کہ ہونٹوں پہ آہ بھی نہ رہے
 تری خوشی تو رہے اور میری خوشی نہ رہے
 وہ زندگی نہیں جس میں خود آگہی نہ رہے

فلک کسی کو مٹائے نہ اس طرح ہاوی
 کہ مٹے مالے کی دنیا میں خاک بھی نہ رہے

شوقِ بختِ رسا دیکھی ہے زلیلت کی زد میں تضاد دیکھی ہے
 اک نئی صبح کی رو میں ہم نے تیسرے کی آبلہ پا دیکھی ہے
 ایک سر نہ پہنچے ملتی ہوئی قسمتِ شاہِ دگر دیکھی ہے
 ہم ساروں سے ہوں کیونکر نازیں ہم نے سسج کی غیا دیکھی ہے
 حُسنِ بیمار کو سے آئے کوئی دستِ عاشق میں شفا دیکھی ہے

ہم نے دیوارِ گلستاں پر سے قید میں باوِ صبا دیکھی ہے
 نکل کر صحرائے قنوج سے ایک ایسی بھی گھٹا دیکھی ہے
 ہم نے ملتی ہوئی بزمِ شب میں خونِ لالہ کی حسنا دیکھی ہے
 انقلابات کے آئینے میں صورتِ راہنما دیکھی ہے
 زندگی ایک نیا رخ بدلی جب بھی خاموش زرا دیکھی ہے

ہم تیرے قلب سے ہو کر گندے تیری ہر ایک منسا دیکھی ہے
 ہمیں غیروں سے ڈانٹے نہ کوئی ہم نے اپنوں کی ادا دیکھی ہے
 دل کسی طور پہلتا ہی نہیں د نظر جب سے خفا دیکھی ہے
 عشق کس بات پر آبِ ناز کو زلیلتِ جنسِ وفا دیکھی ہے

گنجِ زنداں میں بھی ہم نے باقی
 زندگی غمِ سرا دیکھی ہے

کون اب آپ کی محفل میں ہے فرزانہ میں سب جانتا ہوں
 کس لئے آج مجھے کہتے ہو دیوانہ میں سب جانتا ہوں
 بادہ کیوں زہر سے کیوں پھر ہے ہاڑ میں سب جانتا ہوں
 کس طرح اجڑا ہے میخانے کا مینخانہ میں سب جانتا ہوں
 میں یونہی بیٹھا ہوں، بھولا نہیں، اے قافلے والو جاؤ!
 دور ہے شہر کہ نزدیک ہے دیوانہ میں سب جانتا ہوں
 دھوپ میں شمعیں جلاتے ہو مجھے کہتے ہو آؤ جل جاؤ
 شمع کب جلتی ہے، کیوں جلتا ہے پروانہ میں سب جانتا ہوں
 اس طرف بھی کبھی اے موسم گل! اب رہا رات کبھی
 خونِ دلِ خونِ جگر ہے ترانہ درانہ میں سب جانتا ہوں
 مجھ سے پوچھو الٰہیٰ عین کیسے ہیں آزادی نو کیونکر ہے
 کس طرح، کس نے بنایا ہے یہ افسانہ میں سب جانتا ہوں
 مڑ کے مت دیکھ! کہ غربت میں نظر ایک غمِ دل کے سوا
 وند تک کوئی نہ اپنا ہے نہ بیگانہ میں سب جانتا ہوں

لوگوں کی ملامت بھی ہے، خود دردِ مری بھی
 کس کام کی یہ اپنی وسیع انظرِ مری بھی
 کیا جانئے کیوں سبست تھی گلِ ذہن کی رفتار
 ممکن ہوئی تاروں کو مری ہم سفری بھی
 دلوں کو گلی بن کے چلتا تھا تراجم
 دھوکے میں چلی آئی نسیمِ مری بھی
 کس عشق کو اس معرکہِ دل میں ہوئی جیت؟
 اک چیز ہے لیکن یہ مری بے جگری بھی
 سننے کو تو ہم نے بھی سنی چارہ گروں کی
 پھو کہ میاں تم سے کوئی پوٹ بھری بھی؟
 فرقت کے شب و روز میں کیا کچھ نہیں ہوتا
 قدت پہ ملامت بھی، دعائے مری بھی!

اک فرد کی اُلفت تو بڑی کم نظری ہے
 ہے کس میں مگر اہلیتِ کم نظری بھی

وہ چاند تارے ڈوب چلے، مہکامِ سحر اب کیا ہوگا
 اسے قلب کی دھڑکن کیا ہوگا، اسے دردِ عذاب کیا ہوگا
 کچھ عہدِ طرب کا ذکر کرو، کچھ موسمِ گل کی شکر کرو
 جو قصِ شررِ ہم دیکھ چکے، وہ قصِ شراب کیا ہوگا
 ہم جلاۃِ جاں دیکھ چکے، اب بھی ہے وہی دیدنیِ دل
 خواہیں کانسوں بھی ٹوٹ گیا، اسے فوقِ نظراب کیا ہوگا
 گم کردہ منزل بھی تو ہمیں آوارہ منزل کہتے ہیں —
 اسے آلود پانی کیا کیجے، اسے فوقِ سفراب کیا ہوگا
 تسکینِ دل مضطر کیلئے اب اور ہی کچھ تدبیر کریں —
 یوں اس کا تصور کرنے سے اسے بدۂ تراب کیا ہوگا
 ہم مسلکِ عشق سے ناواقف، ہم اہل جنوں میں، یہ نہیں ہی
 طعنوں کا ترے اے واعظِ نادان ہم پہ اثر اب کیا ہوگا
 یہ کوئی فریبِ نظر تو نہیں، یہ دُنسیا ہے، اس نیا پر
 اور اس سے بڑا الزام کوئی اربابِ فطراب کیا ہوگا

سسٹے میں نقوشِ حیات چمکائے
 پھر ایک بار محبت کی بات دہرائے
 بجھی پڑی میں اُمیدوں کی دیپ مالا میں
 نقاب اٹھاؤ، مری مخلوق میں آجائے
 زچھے ہوئے میں ہر اک سمت تک نور کجیل
 کہ جیسے حدِ نظر تک زمیں کا پھیلاؤ
 نئی حیات کے خاکے ابھی ادھر سے ہیں
 گلوں کا رنگ، ستاروں کی روشنی لاؤ
 یہ تیرگی، یہ اُداسی، یہ بے جسی، یہ سکوت
 مرا زباب، مری کائنات سے آؤ
 وہ نقش کرتی ہوئی آرہی ہے صبحِ حیات
 ستارے ڈبکتے جاتے ہیں، بھیرویں گاؤ
 سفر کی رات یکایک نکھر گئی ہے توج
 کوئی پکار رہا ہے، فدا ٹھہر جاؤ

نئے نئے نئی محفل، نیا مہتاب ہے ساقی
 بابِ فکر کا لیکن وہی مضرب ہے ساقی
 ہمارے ہی لئے سال کا دل بیتاب ہے ساقی
 مگر یہ کیا کہ حائل عقد و گرداب ہے ساقی
 بنام اضطرابِ عقل، مطلوب ہے مجھ کو
 وہ ساغرِ جمیں صہب کے عوض بیتاب ہے ساقی
 ہزاروں تلخیوں سے دل کا پیمانہ لباب ہے
 ہرے ہی نول ہے مریگی سیراب ہے ساقی
 بڑی مدت سے مجھ کو جست و آدیت ہے
 یم ہستی میں یہ گمراہی نایاب ہے ساقی
 جلائے کو حجاباتِ نظر کو سوزِ بادہ سے
 کہ فطرت خود نمائی کے لئے بیتاب ہے ساقی
 ترے اس میکدے کا ذرہ ذرہ گرم جلاں ہے
 یہ دورِ جام ہے یا گردشِ دولاں ہے ساقی

جگ ایرواتی

عبدالحمید کے افسانے پہلے بار اس وقت شائع ہوئے۔ جس وقت ترقی پسند ادب اپنے عروج پر تھا۔ ادبی رسلے پانچویں کے ساتھ شائع ہوئے۔ ادبی مجلس منتقد ہوتی تھی۔ عبدالحمید دواؤں کے ہوا خواہوں میں جان لیتی۔ امدادیوں کی تعداد بھی کافی مستقل تھی۔ فقیر کے بعد عبدالحمید کے افسانوں سے پڑھنے والے طبقے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے والی تھی۔ ان کے افسانوں کی دھماکنے پر یہاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ افسانے ترقی پسند ادب کی روش پر چلتے ہوئے معاشرے کے عیبوں کی ترجمانی کرتے تھے۔ دوسری یہ کہ ان طبقوں کے متعلق افسانوں کی تصویریں کئی کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار کے یہاں ادب کی روش میں تھی۔ چنانچہ جب پہلے پہل لوگوں نے حیرت کے مجسموں، دانش کے جنگلوں میں ڈالتے ہوئے کتبوں اور عجیبی ہوئی شاعریوں پر غور کیا تو ان کے دل پر حیرت ہوئے۔ محنت بڑی خوش گوار توانات و لہجہ ہلکا سنے گئے پھر ہوا یہ کہ ایک کامیاب فلم کے ڈائریکٹر کی حراج ایک فلمی ہسٹلروں کو پانچ سالہ اندام میں وہاں شائع کر دیا۔ چنانچہ چند پانچ سال بعد بھی وہ جاگ ایاہ تھی میں وہیں پر ہے۔

[illegible]

[illegible]

منظر و پس منظر

فلم کی شکل

فنی لطیفہ میں تخلیق عمل کو ایسے مختلف درجوں یا حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا کہ ایک کی تشکیل و تکمیل دوسرے سے بے نیاز نہ کر سکن۔ ہر شکل کے لیے ہر ایک تصور کے ذہن میں جب کوئی خیالی پیکر اٹھائی جاتا ہے تو اس کے اندر خیال خواہ و صندے اور غیر واضح ہوں۔ لیکن مکمل تصویر ہر ایک خاکہ اس کے قریب و کنارے خطوط اور رنگ تصور کے ذہن میں مزور ہوا آٹھتے ہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی ہلکے اور سہم کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح فلم میں بھی یہی صورت کارروائی کا انتخاب کرتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی مرکزی خیال کی افنائی صورت اور فنی تشکیل کا تصور ناگزیر ہوتا ہے۔ البتہ فلم کے زنجیری عناصر اس کے جدید ہیئت کے فنی اور تکنیکی پہلوؤں کو کچھنے کے لئے اسے تین درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ عملی طور پر تقسیم ممکن نہیں۔

۱۔ موضوع یا مرکزی خیال کا انتخاب

۲۔ موضوع یا مرکزی خیال کی افنائی صورت

۳۔ انسانے کی فنی تشکیل

موضوع یا مرکزی خیال

موضوع یا مرکزی خیال کا انتخاب بہت نازک اور اہم مسئلہ ہے۔ خصوصیت سے اس لئے کہ کسی بھی خیال کو فلم کا موضوع قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور موضوع کی سماجی افادیت سے قطع نظر بغیر انسانی زندگی و تہذیب و تربیت کے علاوہ اور کوئی معیار ایسا نہیں۔ جو اس انتخاب میں رہبر ہو سکے۔ البتہ تکنیکی نقطہ نظر سے چند ایک خصوصیات ایسی ہیں۔ جو اگرچہ اس انتخاب کو محدود تو نہیں کرتیں لیکن مجموعی طور پر فلم کے عناصر و عناصر پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم مرکزی خیال کی ڈرامائی اہمیت ہے۔ اگر موضوع ڈرامائی نقطہ نظر سے کمزور ہے۔ تو وہ سب کے عناصر کے لئے غیر موزوں ہے۔ کامیاب فلم کے لئے دوسری شرط مرکزی خیال کا اختصار ہے۔ مرکزی خیال کا انتخاب کرتے وقت یہ نظر انداز نہیں ہونا چاہیے کہ فلم ایک محدود لمبائی اور نمائش کے لئے ایک محدود وقت کی پابند ہے۔ اس لئے ایک کامیاب فلم کے لئے اختصار اور جامعیت بنیادی خصوصیات ہیں۔ مرکزی خیال میں جھیل و زیادہ ہونے کی صورت میں جڑتیا

یہ کہ نہیں دیا جاسکتا۔ جس کے بنیہ ظہر کا پس منظر ہی طرح ہوا۔ اہم میں وہ بنیہ کی گینت جہاں ہی تار اور کڑی صورت
 پیدا نہیں ہو سکتی جو قاتل کی کے انعامات کو ظہر کے بیانی تصور ہے ہم اہم کہہ سکتے۔ میری خصوصیت و مزاج کا کچھ نہ کہ ہم کہتے
 اگر کوئی خیال لاغیر پیدا۔ اہم کچھ جو اہم کہہ سکتے۔ اہم اس کی اضافی صورت سے اہم کی شکل میں سب سے اہم کی تا وہ میں پیدا نہیں ہو سکتا۔
 مرکز ہی خیال کو اضافی صورت سے دیتے وقت منظر نگار کے لئے مزید ہے۔ کہ وہ مزاج کے کاموں سے نکالنا اور اس کے سب سے کائناتیں
 ہی سب سے تسلسل اور نظری یا ڈیپاک کے کہہ سکتے کہ ہدیہ خود غور تک پہنچے۔ کہ وہ وہ کی شخصیت کی سب سے کائناتیں میں کچھ اور کمالی
 واقعہ کے ہی منظر میں اس طرح کہا کہہ سکتے۔ جو داخلی احساس میں اضافی ماحول میں ایک مناسب نہ ہم اہم کی ہدیہ کہہ سکتے۔ یہ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ
 واقعات کو ترتیب دیتے وقت میں کی صورتی اہمیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ ہم کہہ سکتے کہ وہ تقاریر سے ہے۔ اہم کی کائنات کے
 اہم میں اگر صورتی احساس پیدا نہیں ہو سکتے۔ تو وہ ہمیں تمام تر جزئیاتی واقعات اور نفسیاتی صورتیں کے وجود ہی کا مظاہرہ ہے۔ کمالی ماحول میں
 کام آتا ہے میں بعض واقعات ایک فقرہ، ایک لفظ اپنی اشاریت اور ایمایت سے اضافے کے ہی منظر کو اجاگر کیا ہے۔ لیکن ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ
 کہنے کے لئے مزید ہے۔ کہ ایسے نفسیاتی اشاروں کا خارجی اظہار بھی ممکن ہو جس کے لئے منظر نگار کو اضافی سے زیادہ ضرورت ہے
 موحنا پڑتا ہے۔

منظر نگاری کا آخری مرحلہ افسانے کی غلطی شکل ہے۔ جس کے لئے اضافے کو نفسیاتی تسلسل کے اعتبار سے حقیقت میں تقسیم
 کیا جاتا ہے۔ اور ان حصوں سے مختلف مناظر اور مناظر سے مختلف نشاں ترتیب دیتے جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر منظر نگار کے لئے
 مزید ہے کہ وہ اپنے کام پر اس انداز سے ترتیب دے۔ جس سے ڈرامے کے ہر جزو اور ہر جزو اور ہر جزو میں منظر نگاری
 ہوا اور تازہ و بھرپور ہو سکے۔

یہاں یہ کہنا ہے غلط ہو گا۔ کہ مرکزی خیال کی اضافی ترتیب اور بالخصوص اس کی غلطی شکل میں حادثہ کا کہہ سکتے۔ غلط ہے۔

محمدناز حسین

کہ شخصیتوں سے نہیں بنیادی حقیقتوں سے دلچسپی ہے۔
 وہ اظہار حقیقی کے کہی گریز نہیں کرتا ہی اس کے فن کی
 سب سے بڑی غلطی ہے۔

نئی قدیں

• ملک باکس • لاہور

جائزے

انجمن ترقی اردو راجدھانی دو کتابیں

انجمن ترقی اردو راجدھانی نے دو کتابیں شائع کیں جن کا نام ہے "انجمن ترقی اردو راجدھانی کی تاریخ" اور "انجمن ترقی اردو راجدھانی کی خدمات"۔ ان کتابوں کے مصنفین انجمن ترقی اردو راجدھانی کے اراکین ہیں۔ ان کتابوں کے موضوعات اردو زبان و ادب کی ترقی و ترقی کے لیے کیے گئے کاموں کی تاریخ و خدمات ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفین انجمن ترقی اردو راجدھانی کے اراکین ہیں۔ ان کتابوں کے موضوعات اردو زبان و ادب کی ترقی و ترقی کے لیے کیے گئے کاموں کی تاریخ و خدمات ہیں۔

انجمن ترقی اردو راجدھانی کی تاریخ - مصنف: انجمن ترقی اردو راجدھانی۔ قیمت: ۱۰ روپے۔
انجمن ترقی اردو راجدھانی کی خدمات - مصنف: انجمن ترقی اردو راجدھانی۔ قیمت: ۱۰ روپے۔

انجمن ترقی اردو راجدھانی کی تاریخ - مصنف: انجمن ترقی اردو راجدھانی۔ قیمت: ۱۰ روپے۔
انجمن ترقی اردو راجدھانی کی خدمات - مصنف: انجمن ترقی اردو راجدھانی۔ قیمت: ۱۰ روپے۔

انجمن ترقی اردو راجدھانی کی تاریخ - مصنف: انجمن ترقی اردو راجدھانی۔ قیمت: ۱۰ روپے۔
انجمن ترقی اردو راجدھانی کی خدمات - مصنف: انجمن ترقی اردو راجدھانی۔ قیمت: ۱۰ روپے۔

انجمن ترقی اردو راجدھانی کی تاریخ - مصنف: انجمن ترقی اردو راجدھانی۔ قیمت: ۱۰ روپے۔



اجی ہاں! میری سر میں سخت درد ہے! سیریلون

لیکن کیوں! اگر آپ نے سیریلون استعمال کی ہو تو یہ درد فوراً دور ہو جاتا
سیریلون سائنس دانوں کی نئی ہونی شہرہ آفاق دوا ہے اس کے اسباب پریم کے دو گونہ جلد ہی آدم کا ماما اس کی ایک ٹیبلٹ میت اپنے پاس رکھتے

مُسکین

اجی تک یہ کتابیں نہ پڑھی ہوں! —

قد بے ، اسے حمید ، ۴ روپے
نئی پود ، تدر گنیف ، تین روپے آٹے

افسانہ

بادشاہت کا خاتمہ ، سعادت حسن منٹو ، ۳ روپے
تیسرا آدمی ، شرکت صدیقی ، ۴ روپے
خزاں کا گیت ، اسے حمید ، ۳ روپے مکے

تنقید

بحث و نظر ، ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالات ، ۵ روپے
تنقیدی نالیے ، ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مقالات ، ۴ روپے

ناول

یڑھی کبیر ، عصمت چغتائی ، ۵ روپے آٹھ آنے
جھیل اور کنزل ، اسے حمید ، ۴ روپے

مکتبہ اُردو لاہور

چودھری انعام علی پبلشر نے اردو پر ایسے ۵۵ ایکڑ صفحہ پر چھپوا کر کتبہ اردو لاہور کے لیے

دنیا کے افسانے

منتخب افسانوں کے چند مجموعے

چند روز اور	خدیجہ مستور	تین روپے
در و دیوار	احمد ندیم قاسمی	دو روپے آٹھ آنے
بیسرا آدمی	شوکت صدیقی	تین روپے
منزل کی طرف	انور	تین روپے آٹھ آنے
بادشاہت کا خاتمہ	سعادت حسن منٹو	تین روپے
منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو	چار روپے
چپ	ممتاز مفتی	تین روپے آٹھ آنے
جگا	بلونت سنگھ	دو روپے بارہ آنے
چاندی کے تار	سہندر ناتھ	دو روپے بارہ آنے
طلسم خیال	کرشن چندر	دو روپے
ٹوٹے ہوئے تارے	کرشن چندر	دو روپے
زندگی کے سوڑ پر	کرشن چندر	دو روپے
ان داتا	کرشن چندر	دو روپے آٹھ آنے
جنگل	میرزا ادیب	دو روپے آٹھ آنے
کلیاں اور کانٹے	اختر اونیوی	دو روپے بارہ آنے
ایک لڑکی	خواجہ احمد عباس	ایک روپیہ آٹھ آنے

ڈراما

قہر حیات

اوپندر ناتھ اشک
دو روپے

چرواہہ

اوپندر ناتھ اشک
دو روپے

تین عورتیں

سعادت حسن منٹو
ایک روپیہ بارہ آنے

سحر ہونے تک

ناصر شمس
تین روپے

مکتبہ اردو، لاہور

نور
الدين
کتاب

۱۹۵۲ء

بین
الکتاب

مکتبہ اردو
لاہور

37-1



لطیف
شیر

نمبر
۱۹۵۲

نیا ادب

تقلید

چار روئے

ڈاکٹر پیار جی

بند و نظر

چار روئے

ڈاکٹر عیادت پری

تکلیف زاویے

چار روئے

مسٹر حسین

نئی قدریں

ناول

چار روئے

اے حمید

جہیل اور کنول

چار روئے

اے - حمید

ڈرے

تین روئے

مترجمہ: انتظار حسین

نئی ہود

دو روئے

مترجمہ: ظہور الحسن کار

بامبی

دو روئے آٹھ آنے

ابو سعید قریشی

ڈرہوک

تین روئے

ابو سعید قریشی

تہمت

اے - حمید کی تازہ ترین تصنیف

جہاں یوفٹ گرتی ہے

(ناولٹ) دو روئے چار آنے

چار روئے

اے - حمید

جنگل روتے ہیں

طنز و مزاح

داستان غریب حمزہ

اے - حمید کے نکاحی مضامین

قیمت دو روئے آٹھ آنے

مکتبہ اردو، لاہور

بیانی جوامع و سیرکت علی مرحوم

- 3 DEC 1953

ادب لطیف

جلد ۳۷ شماره ۱

مینجنگ ایڈیٹر۔۔۔۔۔ افتخار علی چودھری

ایڈیٹر ————— میرزا ادیب

پاکستان میں
نرسالانہ ، آٹھ روپے
غیر ممالک
نرسالانہ ، بارہ روپے
فی پرچہ ۱۲ ار آنے

مکتبہ اربعہ - لاہور

ترتیب

میرزا ادیب	پیرایہ آغاز، ایڈیٹر ۳
بہن ۵۶	پروفیسر معنی حیدر دانش
غزل	ہمارے ادب میں تنوعیت ۴
ڈاکٹر سعد حسین ۴۵	پروفیسر دانشاد کلاںچوی
زہرا نگار ۴۶	ڈاکٹر نذیر محمد کے نغمے کروار ۱۱
سعود قریشی ۴۷	عابد حسن منٹو
حافظہ میاںوی ۴۸	ادب میں نقطہ نظر کا مسئلہ ۱۵
جیل الدین عالی ۴۹	سید ابوالخیر کشفی
احمد ریاض ۵۰	بابائے اردو — ایک تاثر ۲۰
امین راحت چغتائی ۵۱	✱
✱	مغیث الدین فریدی
منشعین	نیا آفتاب ۲۳
اشارے ۵۲	سید معنی قومی
✱	شہر ویران ۲۴
عظیم مرتضیٰ	سید الطاف مشہدی
منظر و پس منظر ۵۴	نان و ایمان ۲۶
✱	گرمال سنگھ بیدار
معنی قومی	دعوتِ بہار ۲۷
میرزا ادیب	✱
جائزے	سید تغیل احمد
✱	اک ترے جانے کے بعد ۳۱
	عزیز انصاری
	بگی ۵۳

پیرائے آغاز

جوش کی ایک نظم

کچھ عرصہ پہلے ادبی سے اردو نگاروں کا ایک مجلہ شائع ہوا تھا جس کا نام "شکستِ زندان" ہے اور جسے اردو نے "مورثہ" اور "عجائب غلام ربانی" "تابان" نے مرتب کیا ہے۔ اس مجلے میں مرتب نے اردو کی حرفت انہی نظموں کو یک جا کرنے کی کوشش کی ہے جو بلا واسطہ یا بالواسطہ ایشیا کی موجودہ بیداری اور ایشیائی ملک کی مختلف ترقی پسند تحریکوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہمیں اس وقت اس مجلے کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں البتہ ہم اس نظم کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو اسی نام سے جوش کی ایک بادی کے قلم سے "جوش" کے تازہ شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ جوش نے اس نظم پر ایک نوٹ بھی دیا ہے جس کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیا جائے تو ذیل کے امور واضح ہو جائے گی :

- ۱۔ جناب جوش کو پہلی شکایت یہ ہے کہ اس مجلے میں ان کی ایک ایسی نظم کو شامل کیا گیا ہے جو ناقص و ناتراشیدہ ہے اور جو نظر ثانی کی ملک
- ۲۔ "شکستِ زندان" میں جن نوشتوں و نوجوان شعراء کو شامل کیا گیا ہے — ان کے عقائد سے اختلاف کے تصور کو بھی میں کفر سے بدتر خیال کرتا ہوں لیکن جہاں تک کہ شاعری کا "جوش" میں کلام موزوں داخل نہیں کیا جاسکتا ہے ان نوواردان کو چہ شعر سے شدید اختلاف ہے۔

- ۳۔ نوجوان شعراء کی "فنی بیاریں اور ادبی خامیوں پر کب سے دل ہی دل میں کڑھ رہا ہوں — ادب خطہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر بزرگ یونہی چپ سادے بیٹھے رہیں گے تو خود اپنا اور اپنے ساتھ شاعری کا بیڑا بھی غرق کر دیں گے — اپنے فضل خاصوشی کو مجھدا توڑ رہا ہوں۔

- ۴۔ "جو سکتا ہے میری اس نظم سے شدید اختلاف کیا جائے — اور زخیز جذبات کے ناسمجیدہ متوج و تلاطم کی بنا پر اس مخاطب کی لے یہاں تک بڑھ جائے کہ میرے سے قدامت سزاوارت گداز انسان کو قدامت پرست و روایت دوست کا خطاب بھی عطا فرما دیا جائے۔"

- ۵۔ — آخر میں "ان زخیز شعراء سے میری نیت کی طرف سے بدگمانی کا اظہار کیا جائے گا تو واقعی میرے دل کو ایک شدید ضرب لگے گی۔"

یہ تو ہے اس نوٹ کا حاصل جو نظم کے اوپر دیا گیا ہے۔ نظم کے ستائیس شعروں میں سے بائیس شعروں میں مختلف تشبیہات، استعارات کا سامنا ہے کہ زخیز شعراء کی "وجہ و ذوق اکرام شمسازی" اور "بے وقار و بے ناکس شمریت" کا حسب معمول شاعرانہ اظہار کیا گیا ہے

اور باقی پانچ شعروں میں "ان گدایان کوئے دانش" کی خوش فہمیوں کو جوت ملامت بنایا گیا ہے۔

اس سے پیشتر کہ ہم ان امد کا تجزیہ کریں، جناب جوش کے بارے میں ہر ایک باتیں عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جوش بر عظیم کے ان شعراء کی صفت میں کچھ جاتے ہیں جن کا احترام ہندو پاکستان کا ہر در ستر فکر کسی نہ کسی حد تک ضرور کرتا ہے۔ انہوں نے اردو کی نچرل شاعری میں نہایت اہم اضافہ کیا ہے اور قطع نظر ان کے لہجے کی بے اعتدالیوں کے بعض انقلابی نظموں میں ملک کی ترقی پسند قوتوں اور صحت مندرجہانات کی بڑی شدت و غلوص کے ساتھ ترجمانی بھی کی ہے ایسے محترم شاعر کا جن کا رویہ اصولاً نوجوان نسل کے ساتھ نہایت مشفقانہ ہونا چاہئے، نوجوان و نوجیز شعراء پر اس انداز سے گرجنا اور اس طرح برس پڑنا نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مختصر نوٹ میں انہوں نے جدید شاعروں کے لئے دو مرتبہ "نوجوان" ایک مرتبہ "خود" ایک مرتبہ "لوشق" اور ایک جگہ "نوجیز" کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور خود کو بزرگ کہا ہے۔ کیا کسی بزرگ کی شان کے یہ شایاں ہے کہ وہ اپنی توکشی ملامت و تعجیب کے تمام تیر نوجیز، لوشق، نوجوان اور خود نسل کے سینے میں تھام دے؟

اگر جوش کو اس بات کی شکایت ہے کہ ایک غیر مکمل اور ناتراشیدہ نظم کو شریک مجبور کیا گیا ہے تو اس میں ان کا اپنا قصور ہے اور وہ خود اپنی غفلت کا اعتراف کر چکے ہیں۔ — اور اگر شکایت ہو بھی سکتی ہے تو مرتب سے "اس میں نوجیز شعراء کا کیا قصور؟ اس بات کا عنصر (غیر شعوری طور پر) انہوں نے نئی نسل پر کیوں نکالا ہے !

دوسری بات جو جوش نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ ان نوجیز و لوشق شعراء کے عقائد سے اختلاف ان کے نزدیک ایک کفر سے بھی بدتر ہے۔ — انہیں شکایت ان کے شعروں کی فنی خامیوں اور زبان و بیان کی ناچنگلی سے ہے ایک طرف تو مبالغہ کی انتہا یہ ہے، ان کے عقائد سے اختلاف کو کفر سے بدتر امر سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف صحت جان یہ ہے کہ ان کی فنی خامیوں کو دیکھ کر ان پر جیٹھ کس کا جھکس کی پستی کی جاتی ہے۔

حیرت ہے جوش جیسا باشعور عقائد و تصورات کو نظر انداز کر کے صرف اسلوب اور ہیئت کو اہمیت دیتا ہے۔ جوش کے قلم سے یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کیونکہ ان کی افست لابی شاعری میں جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ باغیانہ تصورات کی اُتیش لہر ہے۔ — ورنہ اسلوب ان کے یہاں بھی فرسودہ، پٹا ہوا، پرانا اور سخت قسم کا روایتی ہے۔ ان کی انقلابی شاعری بلند بانگ تصورات کی شاعری ہے۔ — ہیئت میں انہوں نے ایک انچ بھی اُگے قدم نہیں اٹھایا۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے وہ ہیئت پرست اور ساقی ہی روایت پرست بھی ہیں پھر انہیں یہ کہنے کا کس طرح حوصلہ پڑتا ہے کہ نوجوان شاعروں کے ان — شعور سازی و جہد و ذوالکلام — شریعت بے وقار و بے ناموس۔

ہے۔ فن کے معاملے میں یہ توفیر شاعر سخت غیر سنجیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہ ہونا چاہئے کہ شکایت کرتے ہوئے خود غیر سنجیدہ انداز اختیار کر لیں اور ایسی سطح پر اتر آئیں جسے علمی سطح نہیں کہا جاسکتا۔ یہ باتیں کوئی در لکھتا تو ہم انہیں درخورد اعتنا نہ سمجھتے۔ مگر قیامت یہ ہے کہ جوش جیسا بلند پایہ شاعر توفیر شاعر ذیل کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جو ایک بزرگ کی شان و سنجیدگی کے تحت خلات ہے !

ایک اہم بات بھی ہے جس کی طرف اشارہ کرنا شاید غیر مناسب نہ ہو۔

اپنے نوٹ میں جوش نے ایک جگہ لکھا ہے :

”اتنے قریب روحانی کے باوصف میری نئی نسل نے اب تک مجھے پہچانا ہی نہیں ہے اور ان کی مردم شناسی کی صلاحیت اس قدر تنگ حد تک سقیم و ناقص ہے کہ ان میں آج تک اس رند خواہی کی معرفت ہی حاصل نہیں ہوئی ہے۔“

یہ سطور پڑھ کر جب ہم نظم کے آخری حصے پر پہنچتے ہیں جہاں جوش نے شاعر ذیل پر بڑی طرح برس پڑے ہیں تو ذہن میں یہ شک پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید نئی نسل نے اس رند خواہی کے ساتھ کسی نہ کسی رنگ میں مزور گستاخی کی ہے۔ یا معرفت حاصل کرنے میں کوتاہی کی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ —

حیف ان پختگان خامی پر کہ سمجھتے ہیں خود کہ جالینوس
ان گدایان کوئے دانش میں کوئی دارا ہے کوئی کیا دوس
صرف اک بوند بھر ذرا سی جان اس پر یہ مند ہیں کہو قاسوس
سرا قدس حجاب کے مانند اور دستار بھر اوقیانوس

آنرہیں برعلاصم ربانی

کیا نکال ہے منہ کوں کا جلوس

اس نانو شگوار ذکر کے ساتھ ہمیں ایک اور بات — تلخ ہی سہی — کہنا ہے : جوش کی شکایت بالکل بے جا بھی نہیں اگرچہ کہنے کا ڈھنگ سخت بے جا ہے۔ نئی نسل فن کی تخلیق میں جگر کاوی کی قائل نہیں ہی ہم میں سے بیشتر ادیب سمجھتے ہیں کہ ایک بات کہنے کیلئے جتنا بلند آہنگ اختیار کر لیا جائے اتنا بلند ادب پیدا ہوتا ہے۔ کچھ کہنے سے بیشتر کہنے والی چیز پر غور کرنے، بار بار غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ جو کچھ کہا جاتا ہے وہ جذبے کی گرائیوں میں سے نکلتا ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ظہور میں آتا ہے وہ ادبی اور فنی اعتبار سے سخت ناقص ہوتا ہے۔ جوش کو صرف فنی خامیوں کی شکایت ہے۔ ہم کہتے ہیں۔ بعض لوگوں میں کچھ کہنے کیلئے ہوتا ہی نہیں اور وہ جھٹ ادب پارے تخلیق کرنے لگتے ہیں۔

آخرا یا کیل جو رہا ہے۔ یہ روش کیوں قائم ہے۔ ادبی معیار کیوں روز بروز پست ہونا چلا جا رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری ان مرتبین پر بھی عاید ہوتی ہے جو ذہن کو محض اس بنا پر آفتاب کہتے ہیں اور کلموں کا چاہتے ہیں کہ ہر ذرہ خوش قسمتی سے ان کی پارٹی — یا حلقہ اثر ہی کی فضا میں پرواز کر رہا ہے۔ جب سردار جعفری جیسی ذمے دار شخصیت نیاز حیدر کو بہت بڑا شاعر کہے اور مجروح کی نہایت معمولی غزلوں میں شاعری کا بہترین حصہ دیکھے اور ربانی انتخاب کرتے وقت اپنے حلقہ اثر سے باہر نہ نکل سکے تو اس ادب کی کیونکر بہت افزائی نہ ہوگی تو اس ادب کی کیونکر بہت افزائی نہ ہوگی جو مواد اور ہیئت کے اعتبار سے ناقص ہے۔

پروفیسر حفیظ حیدر دانش

ہمارے ادب میں قنوطیت

قنوطیت کے معنی مایوسی کے ہیں۔ اس لئے اس لفظ کے کازن میں آتے ہی غم و اندوہ اور نالہ و شہیون کا تصور آجاتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ غم و اندوہ کا اظہار ہمیشہ قنوطیت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ادبیات کے دائرے میں قنوطیت کا لفظ ایک اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اظہارِ درد و ملال کی ہر وہ صورت جو حقیقی اسبابِ غم کے پیدا ہونے کی قنوطیت قرار نہیں دی جاسکتی۔ مثلاً مرثیوں میں خواہ وہ عام ہوں یا مذہبی حیثیت کے ہوں درد و الم کی ترجمانی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اس قسم کے اظہارِ ملال کو قنوطیت نہیں کہا جاسکتا۔ مثنویوں میں المیہ و واقعات کے سلسلے میں ناکامیوں اور اشک افشانیوں کے بہت سے سامان ملتے ہیں لیکن وہ بھی قنوطیت کے دائرے میں شامل نہیں کئے جاسکتے۔

قنوطیت کسی ہنگامی یا سوانحی کے اظہار کا نام نہیں بلکہ وہ ایک مخصوص مستقل اندازِ فکر اور طرزِ احساس کا نام ہے۔ اس میں ایک نظریاتی شان ملتی ہے۔ وہ ایک شدید ذہنی میلان ہے۔ جس میں ایک افسانہ زندگی کے محض تاریک پہلو کا مشاہدہ کرتا ہے اس کی نگاہ میں زندگی کے روشن پہلو کی طرف سے گریبا بند ہو جاتی ہیں۔ ایسا شخص کائنات کے نظام، اس کے ہنگاموں اور اس کے تمام مرجبات و محسوسات کو بیکار و بھل سمجھتا ہے۔ غرض کہ قنوطیت دراصل رجائیت کی ضد ہے جس میں آرزوہ خاطر کی ایک خاص شہار اور مسلک بن کر رہ جاتی ہے۔

قنوطیت اگرچہ فرد کی اندامی مزاج سے گہرا تعلق رکھتی ہے مگر ساتھ ہی عصر و ماحول کے اثرات بھی اس کی نشوونما کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ میلان روحانی اور تعلیمی امور سے بھی تقویت پذیر ہوتا ہے۔ اس لئے کسی ادب میں قنوطیت سے بحث کرتے وقت متعدد انفرادی، قومی اور تاریخی مسائل محلِ نظر ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے موجبات و اثرات، فوائد و نقصانات کی دلچسپ تفصیلات کے سلسلے میں بہت سی اہم باتیں معرضِ بحث میں آجاتی ہیں۔

ہمارے ادب میں قنوطیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس سے ہماری بعض ادبی و فنی خصوصیات کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو ادب دنیا کے جدید ترین ادبوں میں سے ہے۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ قنوطیت پسندانہ جذبات و خیالات سے اس قدر مالا مال ہے کہ اس کی مثال کسی پرانے ادب میں بھی خدا مشکل سے مل سکتی ہے۔ قنوطیت کی افراط ہمارے ادب میں موردِ اعتراض بھی رہی ہے تاہم اس میں ایک ایسی جامعیت اور دلچسپی ہے جو ایک خاص عظمت و اہمیت رکھتی ہے۔

ہماری نثر کی تصانیف میں قنوطیت کا عنصر تقریباً مفقود ہے۔ پرانے قصبے عموماً طرب و ہنس پر مبنی ہیں۔ قدما کی مذہبی اور اخلاقی تصانیف میں بھی قنوطیت کا کوئی عنصر نہیں عہدِ جدید کے بعض ناولوں اور افسانوں میں المیہ انداز تو ہے لیکن وہ بھی قنوطیت نہیں ہے۔ جدید نظموں میں کہیں کہیں مدہم اطمینان، اندوہنا کی اور جھللاہٹ کے مفاہیم ملتے ہیں لیکن قنوطیت کا انداز ان میں بھی نہیں ہے۔ قنوطیت کا تمام

ہر ماہ سے یہاں دراصل غزلوں میں ملتا ہے۔ غزل ہمارے ادب کی سب سے وسیع اور مقبول ترین صنف ہے جو داخلی کیفیات سے
تعلق رکھتی ہے۔ ہماری غزلوں کا ایک بڑا حصہ اندوہ و یاس کا سرمایہ ہے اور اس میں شدید تاثر، فشریت، اندوہ و گداز کی بھلیاں پوشیدہ
ہیں۔ غزلوں میں اس میلان کی ترقی اور مقبولیت کے متعدد اسباب ہیں جن کی مختصر کیفیت یہ ہے۔

غزل کا موضوع محبت ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کے طاری ہونے کے بعد آرام و آسودگی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتی
ہے۔ عشق ایک اضطراب مسلسل کا نام ہے۔ محبت کی دنیا کاوش و جستجو کی دنیا ہوتی ہے جس میں حصول مقاصد کے بعد بھی طمانیت و آسودگی
پیدا نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے جذبات محبت کی شدت قنوطیت کا پختی خیمہ ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں غزل ایران سے آئی۔ اور اندوہ و یاس کی کچھ روایات سے کر آئی۔ اس کے نئی وجود تھے۔ فارسی غزلوں میں قنوطیت
پسندانہ میلانات، صوفیانہ مذاق کی بدولت بہت تقویت پذیر ہوئے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں خاقان صورت اہل ایران میں
زیر گیر ہو چکا تھا۔ جس کا اظہار کچھ آگے چل کر غزلوں میں بڑی شدت سے ہونے لگا۔ صوفیوں کے نزدیک مادی زندگی ایک بھر و فراق
کا نام ہے۔ صاحبان طریقت کی روح محبوب حقیقی کی جدائی محسوس کرتی ہے اور ان جلووں کی یاد میں بے قرار رہتی ہے جن کا نظارہ یوم
الست کیا تھا۔ یہ کیفیت ایک کرب و اضطراب کا عالم پیدا کرتی ہے۔ پھر مصائب محبوب کے لئے جو ریاضتیں کی جاتی ہیں وہ بھی بہت
ثقل و شدید ہوتی ہیں۔ ترک و دنیا اور نفس کشی کے تمام طریقہ اختیار کئے جاتے ہیں اور ان سب کا نتیجہ ایک طرح کی قنوطیت پسندی
کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جہاں تک کہ عشق بؤیہ کے تمام غموں کا مجموعہ بلکہ خود لفظ غم کا مترادف قرار پا جاتا ہے۔ ایران کا مشہور
سرنی شاعر عراقی کہتا ہے ۔

بہ عام ہر کجا و دور و بالا بود بھم کو دند و عشقش نام کو دند

حضرات صوفیہ کا عقیدہ توحید و وجودی بھی کائنات کے لاموجود اور بے اصل ہونے کا تصور پیدا کرتا ہے۔

یہ حالات چل ہی رہے تھے کہ ایران پر تاتاریوں کا حملہ ہو گیا، ملک پر تباہی آگئی، لاکھوں ہائیں ضائع ہو گئیں۔ قتل و غارت کے بے پناہ
لڑخانی نے حیات و کائنات کی بے ثباتی کے نقش و دیوں پر بٹھا دئے۔ رادھر سے اُدھر تک خوف و ہراس کی فضا چھا گئی اور اندوہ و
بے کسی کے جذبات دلوں پر طاری ہو گئے۔ صنف غزل ان حالات سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کے لب و لہجہ میں یاں و کلامی
انماز اور بھی بڑھ گیا۔ اور ایران کی شاعرانہ فضا پر قنوطیت کے گہرے بادل چھا کر رہ گئے۔

اُدو شعراء نے اسی قسم کی ایرانی شاعری کا نتیجہ کیا۔ اس لئے ان کے یہاں شروع ہی سے قنوطی انداز پیدا ہو گیا۔ وئی کا

شعر ہے ۔

گر دغم، آب من عشق کے معاد نے غانہ عشق جگر سوز کوں تعمیر کیا

سرا آئی دکن کے ایک پڑانے شاعر ہیں، وہ کہتے ہیں ۔

پہلی سمت غیب سے اک ہوا کہیں ہود کا جل گیا مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سوہری رہی

یہ قنوطی رنگ عرصے تک یونہی چلتا رہا لیکن اس میں بھر پور صداقت اور سچی تاثیر کا عنصر کم تھا۔ یا سیاسی شاعری کا شاندار دور

ہمارے ادب میں میر تقی میر سے شروع ہوتا ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے قنوطیت کو محض تقلیدی طور پر نہیں بلکہ اپنی فطرت کے

معاوضے سے شاعری میں جگہ دی۔ انہوں نے اس روایت کو حقیقت بنا دیا، شراب یاس انہوں نے پہلے خود ہی پھر دوسروں کو پلائی۔ وہ اس راہ کے میر کا رواں ستھے۔ میر صاحب فطرتاً یاس پسند تھے۔ پھر ان کی ابتدائی تربیت نے ان میں عشق و نالہ پیشگی کی رغبت پیدا کر دی۔ وہ وراثتاً ماحول میں تربیت پا کر وہ پہلے ہی سے بے ثباتی کمیات کا اثر قبول کر چکے تھے۔ پھر کم شناسی میں یتیم ہو کر، بے کسی، مفلسی اور بے نوائی کے ہاتھوں غم روزگار کی آنکھوں میں مبتلا ہو گئے، اور بعد میں قدانیوں اور مرثیوں کے ہنگاموں اور خود ترنویوں کے مناظر دیکھ کر وہ اندر و جہرت کا ایک مرتجع بن کر رہ گئے، سیاسی انحطاط کے باعث ملک کی فضا خوف و ہراس کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ وہلی اور اس کے گرد و نواح میں دو گون کی طبیعتیں درد مندانه جذبات کی پذیرائی کے لئے آمادہ تھیں، اس شکست خوردہ ذہنی ماحول میں میر صاحب نے اپنے پُر اثر اور دلخراش نذامیں دل کے مرثیے اس طرح مناسے کہ تمام ادبی فضا کو ماتم کردہ بنا دیا۔ وہ ایک مخصوص دبستان تنزلیت کے موسس ہیں۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تنزلیت کو بہت مقبیل بنا دیا اور دوسرے شعراء پر ان کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ اس کی مدائے باد گشت آج تک سائی دیتی ہے۔ میر صاحب تنزلیت کے اظہار میں بڑا سلیقہ رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار جس طرح دل میں اتر جاتے ہیں اس کا اندازہ ان اشعار سے کیا جاسکتا ہے۔

الٹی ہر گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

دل تر ہے ہے جان گھلے ہے حال مگر کا کیا ہو گا جہنم جہنم لوگ کیں ہیں جہنم کیا ہم سا ہو گا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا دل ستم زدہ کو ہم نے تمام تمام لیا

میر عہد اُ بھی کوئی مرتا ہے جان ہے تو جہان ہے پیاسے

کیا پرچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے گاہے بگاڑے ہے، گاہے دما کرے ہے
ہم طرد عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے
کیا جانے کیا تمنا رکھتے ہیں یار سے ہم اندر ایک جی کو اکثر ملا کرے ہے

میر کے شاگرد راسخ عظیم آبادی بھی درد مندی کے بڑے دلدادہ تھے۔ صاحب گل رعنا لکھتے ہیں کہ مشاعروں میں "عجب شعرا غزلیں پڑھا کرتے تھے تو یہ آنکھیں بند کئے جھوماکرتے تھے، اپنی غزلیں پڑھتے وقت آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا۔ ان کے یہاں بھی میر کا سا قنوطی انداز اپنی لپری نشتریت کے ساتھ جلوہ گر ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لاگ اس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ اب کاٹا سا کچھ مگر میں ہے اپنے چیمہ ہوا

ضبط گر یہ تو ہے پر دل پہ جواک چوٹ سی ہے قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

اپنا بھی ماجرائے دل اک مریہ ساسے بے اختیار دیتے ہیں لوگ اس بیان پر
شعراء و شاعری میں موت۔ غالب اور ذوق کے کلام میں میر کے انداز کی پھلک جتنی ہے برقع کا رنگ اگرچہ عنیدہ اور غمور تھا۔
تاہم اس قسم کے اشعار بھی کہ جاتے تھے۔

مانگا کریں گے اب سے دُعا رنجریار کی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دُعا کے ساتھ
مرزا غالب اپنی شوخی طبع اور شگفتہ مزاجی کے باوجود میر سے بہت متاثر ہیں، وہ بھی قیامِ حیات کو بدغم ہی سمجھتے ہیں اور
اس قسم کے بہت سے اشعار کہتے ہیں۔

غمِ ہستی کا اس دُکس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے مگر برتنے تک

آئے ہیں بے کسی عشق پر رونا غالب کسی کے گھر جا نیگا بیابانِ بلا میرے بعد
ذوق کے یہاں یاس و ہندو کی بہت سی پر اثر تفسیروں میں مثلاً
پھول تو وہ دن بہارِ باغِ ناز و کھلا گئے حسرتِ حق پھول پر ہے جو بن کھلے رہ جائے

لائی حیات آئے تھنا لے چلی چلے اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے
اگرچہ یہ کہہ کر غامض ہو جاتے ہیں۔

نہ بتوا پر نہ بتوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا
ابو ظفر بہادر شاہ آخری تاجدارِ دہلی کی زندگی بڑے مصائب میں بسر ہوئی۔ غدر کے بعد دہلی کی تباہی، اغوا کا قتل اور پھر اپنی
اسیری و جلا وطنی کے ماحول ان کے یہاں یاس و ہندو کی گہرا اثر کیا ہے۔ اس لئے بہت پر اثر معلوم ہوتا ہے۔ چند
شعر ملاحظہ ہوں۔

ہم اپنے کچھ غم میں نامہ و نثر یاد کرتے ہیں ہمیں کیا گرہن میں چہا ہے عند لیبوں کا

برسوں گدے کہ ہوتی خاک ہزاری برباد اب تو اس کو چپے میں اسے باؤ سحر خاک نہیں
گھنٹوں میں جب تک نوائی کا دھندلا دھواں عیش و نشاط کی ترجمانی ہوتی رہی، لیکن جب واجد علی شاہ معز دل ہرے تو گھنٹوں کا
مذاق نکل بھی بدلا۔ اندھ و طلال کے آثار طاری ہو گئے۔ دنیا اور عیش دنیا کی بے ثباتی گہرا اثر کرنے لگی۔ جھٹلیں ویران ہو گئیں اور حصولِ
عبرت کے لئے چشمِ تغور گودستان کی میر کرنے لگی۔ کائنات نے غالباً سب سے پہلے یاس و حسرت کے رنگ کو ابھارا اور پھر اس
کا مذاق عام ہو گیا۔ یہ بھی قریباً نگاری کا ایک مخصوص انداز تھا۔ عذرا گھنٹی کے یہاں یاس و ماتم کی یہ سب بہت تیز ہو گئی۔ سال کی غالباً
کوئی غزل ایسی نہ ہوگی جس میں موت اور اس کے متعلقات پر دو پار شعر نہ ہوں۔ ان کی ایک ہی غزل سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
یہ مشورہ ہم اُنٹھے ہی چہارہ ہو کرتے اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے

کفن کو باندھے ہوئے سر سے آتے ہیں درند
ہم امد آپ سے اس طرح گفتگو کرتے
سواوشہرِ غمیشاں کا دیکھتے منظر
سنا نہ ہو جو غمو شہی کو گفتگو کرتے
امد اشتیاقِ نوحہ خوانی کی انتہا یہ ہے کہ
حرفیں بدلت غم تھے اُٹھ کر کچھ ہوتا
تو نوحہ خوانی تا کا مٹی عدد کرتے

آج کے بعد یہ تنوہی انداز قافی بدایتی کے یہاں شدت سے نمودار ہوا۔ قافی زندگی بھرنا کامیوں میں جتنا ہے۔ میر کی طرح
ان کا سارا کلام ان کی محرومیوں کا افسانہ ہے۔ وہ دیرِ جدید میں یا سیات کے امام مانے جاتے ہیں۔ ابتداء میں مکشوی رنگ کے
زیر اثر ان کے یہاں بھی مرگ و لحد کے تعلقات کی کثرت رہی، بعد میں ان کے یہاں ایک فلسفیانہ بصیرت اور خود و تامل کا عنصر
شامل ہو گیا۔ ان کی بدولت تنوہیت کے لب و لہجہ میں وقار و عظمت پیدا ہو گئی۔ امد انہوں نے عدد منداتہ جذبات کو جدید اسالیب
فکر سے کچھ قریب کر دیا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

قافی ہم تو جیتے جی وہ میت میں بے گور و کفن
جس کو غربت اس نہ آئی اور بدن بھی چھوٹ گیا

یاس نے عدد ہی نہیں حق تو یہ ہے دو ابھی دی
لیکن پھر مرگ جی و جہ تسکین نہیں بنتی

مرگ و بے سنگام قافی: تسکین ہو چکی
زندگی سے آپ گھبراتے ہیں گھبرا کر یں
غرضی کہ تنوہیت کے زیر اثر ہمارے قسم رسبہ شعرا نے اعلیٰ قسم کے شعر کہے ان میں ایک دائمی گدازہ امد نشریت پیدا کی
امد عدد و تاثیر کے عناصر کو غیر قافی بنا دیا۔ البتہ عام طبائع پر اس کا اثر اچھا نہ ہوا، قوائے عزم و عمل میں ایک تعطل رہا امد عرصے
تک قومی بیداری نہ تھی کی راہیں سدود رہیں، دبی دبی آہیں ہمارے منظوم ادب میں آج بھی سنائی دیتی ہیں لیکن تنوہیت اب
دوبہ انحطاط نظر آتی ہے۔
(بشکریہ ریڈیو پاکستان - راولپنڈی)

تنقیدی ادب

بحث و نظر

ڈاکٹر سید عابد

پانچ روپے

تنقیدی زاویے

ڈاکٹر عیادت بیٹوی

چار روپے

نئی قدیں

مناور حسین

چار روپے

مکتبہ اردو - لاہور

پروفیسر دلشاد کلاںچوی

ڈاکٹر نذیر احمد کے ننھے کردار

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کے قلم میں ہلاک اور جوش تھا۔ وہ اپنے قلم سے معوری کرتا تھا۔ سچی اور جھلاک تصویریں کھینچنے والا معترف تھا۔ اسلام آباد میں ان کی آمد وہ فی معاشرت کے مرتعے پر پہنچتا ہے۔ قاس کا فن جوش، صداقت اور مشاہدات و تجربات کا بہترین سرمایہ بن جاتا ہے۔ اس کے فن کی ہی خصوصیت اس کے تعلیمی اخلاقی مقصدی اور اصلاحی تاویوں کو بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔ اور وہ اپنے فن کے سہارے نئے دم کی انقلاب سے زندہ اٹھانے کی صورت ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ ملکی بد نظمی، بے ماہ روی، غربت اور مادی، اور معاشرتی تخریب کو مد کرنے کے لئے گھر ٹوٹنے اور پر سکون اور سازگار بنانے کی مزید کھتا تھا۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر اس نے نامل لکھے۔ اور ناولوں میں گھر ٹوٹنے کی کہے برہنہ کو اجاگر بھی کیا۔ اور اس پر تنقید بھی کی۔

گھر ٹوٹنے کی ادبچوں میں گہرا نفسیاتی تعلق ہے۔ بچہ سب کچھ یا کم از کم زیادہ کچھ گھر سے لیتا ہے۔ گھر کا ماحول اس کی زندگی پر پہلی بھاپ ہوتا ہے۔ گھر ہی بچے کے بڑھتے ہوئے ہیں۔ مادہ سمجھتے بھی ہیں۔ ایک بچے کی اپنے والدین گھر ٹوٹنے سے اپنا دلچسپ تیار کرتی ہے۔ گھر ٹوٹنے کی سادہ اور مستحکم اس کی تائید زندگی کی سازگاری اور استواری کی آئینہ مادہ ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد بچوں کی نفسیات سے کما حقہ واقف تھا۔ اس نے اپنی تعلیمی حکیم کی کامیابی کا مادہ ماحول پر رکھا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے ننھے کردار میں مقصدیت کا شکا نہ ہو سکے۔ وہ اصلاح چاہتا تھا۔ اعلیٰ سے شروع تھا۔ کہ بڑے گھروں کی اصلاح مشکل ہے۔ وہ بچوں کو اپنی مقصدیت کے مطابق ڈھال کر ان سے کام لینا چاہتا تھا۔ اور یہ کہ داد ڈالنے میں اس نے ٹھوکر کھائی ہے۔ مقصدیت کی لگن اسے بچوں کی مکمل نفسیات میں جا پھرنے دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے کرداروں کو ہر منزل پر مٹالی بنانے کی کوشش کی اور کردار کے ارتقاء کی طرف کم تر جہ کی۔

ننھے کردار ڈگلی گوندھی مٹی کے تودے جیسے ہیں۔ جنہیں مکمل صورت اختیار کرنے سے پہلے پھیر ڈالنے، گھڑے جانے، بننے سونے آگ میں تپنے اور تپ کر گندن بننے کے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے ننھے کردار جلد از جلد مقصد حاصل کرنے کی خاطر پہلے مراحل ایک ہی جنبش میں طے کر لیتے ہیں۔ ایک ہی رات میں بدل جاتے ہیں۔ یا آفاقی زندگی ہی میں مقصدی سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور پھر اپنی سانچوں میں بڑھنے سمجھنے پلنے لگتے ہیں۔ ویسے بھی ڈاکٹر نذیر احمد کہ داد نکالنے کے گھر سے پوری طرح واقف نہ تھے جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ بکمان کے کہہ فرشتے ہوتے ہیں۔ یا شیطان، ننھے کرداروں میں تو فرشتہ پن اتنا زیادہ دکھایا گیا ہے۔ کہ شیطنیت کا پہلو کسی ننھے کردار میں دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے شیطانیت تو کجا بچہ کی شہ نخی اور شہوت بھی ایک قلم معذور ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس پر بھی وہ اپنے عمل سے فرشتوں کے طہ پر زندہ نہیں رہتے، ڈاکٹر نذیر احمد کا قہار ہی انہیں زندہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی مودیت نے انہیں جاننا نہ بنانے اور زندہ رکھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ البتہ ایک تھا کہ داد دیا ہے۔ جو جاننا معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ ابتدائے زندگی سے ہی ان کو اردل کو مقصد کے سنجہ اور بائیلنگ میں رنگ دیا جاتا تھا۔ واقعات، حادثات، اور ماحول تک کو ان کے کرداروں کے مطابق ڈھال لیا جاتا تھا۔ پھر بھی ڈاکٹر نذیر احمد کی ان خامیوں کے باوجود یہ کہا جاتا ہے۔ کہ ان کا دل امتحالی کرداروں کی جیسی مرتع کشی اس نے کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کا فلسفہ تعلیم ہی اس کا سب کچھ تھا۔ اس نے اپنے نظریہ تعلیم میں صحیح طرح کی تربیت، صحبت اعلیٰ ذل سے پرہیز، اعلیٰ تعلیم اور علمیت، خاص طور پر زندگی سے۔ وہ اپنے چھوٹے بڑے کرداروں کی خوبی اور برائی کو اسی کسوٹی پر پڑھتا تھا۔ شے کو داروں کی تربیت، اور اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اُس نے اپنے ناولوں میں عموماً اور مرآۃ العروس اور توجہ النعوج میں خصوصاً کیا ہے۔ ابن الوقت میں ابن الوقت کے بچپن کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف اٹا بنایا گیا ہے کہ لکھنے بچپن سے تالیف سے محبت تھی۔ بڑی محنت سے اس محنت کو پڑھا تھا تا جوں اور میاؤں سے ان کے شہر اور ملکوں کے حالات اور کیفیات، معاشرت و سیاست کی تفتیش کرتا تھا مذہب کے بارے میں اس کی معلومات کتاب الملل والنحل سے کہیں زیادہ تھیں۔ ہم ان باتوں کے تذکرہ سے غور کیا نازدہ لگا سکتے ہیں کہ ابن الوقت اگر انگریز دوستی اور انگریزی تہذیب کا دم بھرتا تھا تو کیوں؟ ڈاکٹر نذیر احمد نے ابن الوقت کو جس قسم کا کردار بنایا تھا۔ اس کا بیچ اس کے بچپن میں ہی بویا تھا۔ وہی غیر ملکیوں سے انس۔ ان کی تہذیب سے وابستگی،

توجہ النعوج میں جہاں زیادہ تر مثنوی کے بارے میں وہاں نسخے کے باروں میں بھی مشابہت کی انتہا کر دی ہے۔ نعوج کی سب سے چھٹی بیٹی حمیدہ نہ محنت و مصروف ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کچھ ہے۔

نعوج سب گھر کے سدھار اور بچوں کی تربیت کی طرف توجہ ہوتا ہے۔ تو اپنی بڑی کا تعاون چاہتا ہے۔ اور اس سے کہتا ہے: "بھلا چھوٹے بچوں کو تو سنبھال لو گی؟" نعوج کی بوی حمیدہ ان الفاظ سے ڈی بھرتی ہے۔ اور ساتھ ہی اپنے سنبھلی بیٹی حمیدہ کا قارن کرتی ہے۔ "ان کا درست کر لینا کیا مشکل ہے۔ یہ تو رسم کی ناک ہیں۔ سبھر کو پھر وہ۔ پھر گئے۔ بلکہ شامل کو منہ سے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہو، بچوں کا قاعدہ ہے کہ جیسا بڑوں کو کرنا ہے دیکھتے ہیں۔ خواہ خواہ اس کی نقل کرنے لگتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ حمیدہ نے مجھ کو لار لار دیا ہے۔ کیا تو اس کی چھ بوس کی بات ہے۔ مگر سزا سے اتنا کہ بڑے بڑھوں کی باتیں کرتی ہے۔" بڑے بڑھوں کی باتیں سچی کے سہ سے منہ جھیل سوالوں کی صورت میں کہوائی گئی ہیں۔

"اماں جان خدا کیا چیز ہے؟ اور عبادت اس کی کون ہے؟ اماں جان انڈیاں سے ہمارا کیا رشتہ بنتا ہے۔ کہ اتنے سوک کہتے ہیں اماں جان تم تو ناز نہیں پڑھتیں۔ کیا تم انڈیاں کی لوندی نہیں؟ اور کیا تم اس کی دی ہوئی روٹی نہیں کھاتیں؟" اماں جان، (بڑا کہنے پر) انڈیاں خدا ہوتے ہیں گے؟

اب اسی موقع کا تھوڑا سا اقتباس لکھ دو۔ میں۔ (غیبہ اپنی بیٹی حمیدہ سے) خدا ہونے کی تو بات ہی ہے۔ حمیدہ! یہ جو کہ روٹی بند کر دیں۔ تو پھر ہم کہاں سے کھائیں گے۔ اور اگر غصی ہوا کا وہ وہ سوک گیا، تو ہماری غصی وہ نہ گئی۔ یہ کہہ کر رونے لگی۔ میں نے اٹھا کھلے لگایا۔ اور پیار کیا۔ لیکن جس قدر اس کو تسلی دیتی تھی وہ اتنا دعوتی تھی۔ مجھ سے بھی غیبہ نہ ہو سکا۔ اور مجھ کو روتے دیکھ کر اندھی جیاب چوٹی۔ آخر میں بڑی مشکل سے میں نے اس کو سنبھالا۔ اور کہا: "حمیدہ! تم ڈرو مت، ابہ میاں کا یہ دستہ وہیں کہ جو بڑی غلام کام نہ کریں۔ ان کا کھانا بند کر دیں۔" حمیدہ۔ کچھ۔ میں۔ ان ہاں۔ تم سے گھبراؤ۔

اسی باب میں کچھ آگے چل کر ایک اور حلقہ ہے۔ حمیدہ۔ (گھبرا کر) کہا ابہ میاں یہاں جائے گھر میں بیٹھے ہیں۔ میں دغیبہ۔ گھر میں کیا۔ ہمارے پاس بیٹھے ہیں۔ تو ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے، یہ سن کر حمیدہ نے جلدی سے اور ڈھنی اور ڈھلی۔ اور سنبھل کر مودب ہو بیٹھی اور مجھ سے آہستہ سے کہا: اماں جان سب ڈھک لے۔ اس کے بعد حمیدہ پر کچھ اسی ہیئت غالب آئی۔ کہ میری گود میں تھوڑی دیر تک سب پڑی رہی۔ آخر آٹھ لگ گئی۔ میری ٹانگیں سن ہوئے گئیں۔ تو میں نے آہستہ سے چار پانی پرٹا کہ میدان کو پاس بٹھلایا۔ کہ دیکھ ہاتھ دیکھ

ہو۔ اسانہو کہ لڑکی سوختے سوئے ڈر کر چٹک پڑے۔ اور میں یہاں چلی آئی۔ مجھ کو تو حمیدہ کی باتوں سے ایسا ڈر لگتا کہ اندر سے کلیجہ قہر کا پناہ جاتا تھا۔
 فحش، کپڑوں ڈر کی اس میں کیا بات تھی۔ حمیدہ۔ میں کہتی تھی کہ ایسی چھوٹی لمبی ریشمی اور ایسی باتیں کچھ اس کو بوجھ نہیں تھیں۔

مسند جہ بلا مکالمہ، سوالات اور حمیدہ کے خیالات سے آپ بونی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حمیدہ کا نھا کہ دار کتنا شاہی اور مکمل ہے۔ اس کا اندازہ میرا
 اسی طرح حمیدہ کا چھوٹا بھائی، علم بھی اپنے چند دوستوں کی فانی حضرت بی کے اثر سے جمع رہ کر چلنے لگ جاتا ہے۔ گولان سے بڑے گروہ خصوصاً
 نیچے لہ کلیجہ تو قہر بیا ان کے الٹ ہی نکلتے۔

سزا العروس میں اصغری کا نھا کہ حمیدہ کا خلفہ چھپاٹنے والے کے در سے بڑے کو انیف علی اور متالی کر رہا ہے۔ اصغری کا تعارف ان الفاظ میں
 کیا گیا ہے۔

”یہ ریشمی اس گھوٹا لیسو تھی۔ جیسے باز میں پھول یا گونی کے حجم میں آگے۔ ہر ایک طرح کا ہنر، ہر ایک طرح کا سلیقہ، اس کو حاصل تھا۔ عقل، ہنر،
 حیا، لحاظ سب مغفیت خدا نے اصغری کو عنایت کی تھیں۔ لڑکی میں اس کو کھیل کود، سنسی اور چھپڑ سے نفرت تھی۔ یہ عذابا گھر کا کام کرتا۔ ان مغفیات
 سے متعجب تھا کہ دار نھا کہ ماری معلوم نہیں ہوتا یا ایک کچھ جست و چالاک شہ پرادر لڑکا ہو سکتا ہے۔ یا مریض و بلا تھا اور بے حس ہو سکتا
 ہے۔ معصومیت اس میں پائی جائے گی۔ بگڑ بگڑ اور عقلیت کا یہ دھب تو بنو گا۔ ایک ارتقا یا فہم کل یا مثالی گوار ایک بچے کو سوئپ وینا محض مقصدیت
 ہی ہے۔ حالانکہ اصغری ان اقتباسات کے مطابق گیارہ سال کی ہے۔ لیکن اصغری کے اس کہ علم سے پانچ چھ سال پہلے بھی متعارف ہوتے۔ تب بھی آپ اس
 کو ایسی ہی مغفیات کا مالک پاتے۔ حمیدہ سال کی اس بچی کی معصومیت اور بچنے کی ایک بات قابل ذکر ہے۔ کہ اپنے بہنوئی محمد مائل کی گود میں بیٹھ کر ان کے
 اصرار سے اور ملل کی طرف بالادادہ دیکھ کر ان سے عیدی کا روپیہ لے لیتی ہے۔ لیکن دوسری صبح جب گھر کے مالکے ازاد، چھوٹے بڑے
 ابھی سوئے ہوئے ہیں۔ یہی اصغری بیل سامنے آتی ہے۔“

(محمد مائل) صبح کو اٹھا تو دیکھا اصغری حجاب و دے رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر اصغری نے سلام کیا۔ اور کہا: بھائی صاحب دمنو کے واسطے گرم
 پانی جو جھبے۔۔۔۔۔ محمد مائل نے کہا: نہیں بھائی۔ مسجد میں جماعت نے ساتھ نماز پڑھیں گے۔۔۔۔۔ اصغری نے کہا: بھائی
 صاحب، چلے نہ جائے گا۔ آپ کے واسطے چار بنائی ہے۔ سادی پیچھے گایا معدہ کی؟۔۔۔۔۔ محمد مائل نے کہا: جیسی مل جائے۔
 اصغری بولی: آپ کی آواز کچھ جاری ہے شائد نزلے کی تھریک ہے۔ تو وہ دھمزد کرے گا۔۔۔۔۔ محمد مائل نے کہا: نہیں
 نزلے کی تھریک تو نہیں سلامت کو اماں جان کے ساتھ بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ جو خواہی اللہ ہے۔۔۔۔۔ محمد مائل نماز پڑھ کر واپس آیا۔
 تو اس کو کیا ملا۔ ہاتھ نہ دے ہو کیا نہ کھا ہی ہیں۔ سلام کر کے بیٹھ گیا۔ اصغری نے سینی لاکر سامنے رکھ دی۔ چار مانی میں گرم گرم چار دو پیالیاں، دھ
 پچھے ایک طہنری میں قند، محمد مائل نے چار لی۔ خوش ذائقہ، خوش رنگ، بھلا س درست، پی کو بی با نوح ہو گیا۔

اصغری کے ننھے کرہار سے آپ بیدی طرح واقف ہو گئے ہوں گے۔ اسی اصغری کی بڑی بہن اکبری کا کہ دار اس کے بالکل برعکس ڈھلا ڈھلا
 موجود ہے۔ معلوم ایک ہی، مال باپ کی لدا، ایک ہی ماحول میں۔ ایک ہی تربیت پاکر کو نکلا گیا۔ دسک کی صند بن جاتے ہیں؟ یہ سادی خامیل ٹکڑ
 نڈیا محمد کی ہودیت اور مقصدیت کے تحت آجاتی ہیں۔ اور اس کا مل اس کے مقصد کے سامنے دب کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر نڈیا احمد کے ننھے کرداروں میں سے نڈیا سبکا کا نھا کہ دار معصوم فن اور مقصد کا ایک شاہکار ہے اس ننھے کرہار کے طبعی
 و جذبات، میلانات، جذبات۔ اور محلات کی خوب عکاسی کی گئی ہے جس کے خیال میں ڈاکٹر نڈیا احمد کے ننھے کرداروں میں سب سے زیادہ جاڈار
 کردار معصوم ہی ہے۔ بچپن معصومیت، البرہن، ضد۔ یہ سادی باتیں عوں کی سی ہیں۔ یہ کہ دار د شیطان ہے۔ اور نہ فرشتہ، یہ محض بچے کا کردار ہے۔

اس سے میرا وہ نہیں کہ ڈاکٹر تیرا احمد نے اپنے مقصد سے ہٹ کر یہ کہہ دیا ہے۔ مقصد یہاں بھی موجود ہے۔ لیکن فن میں مدغم ہو کر نہایت واضح اور پائے چھوڑ جاتی ہے۔ افسانہ کی مہر و فن غیرت بیگم کا بھروسہ اوس کے سے مصلحت نہ کرتا تھا اس کی سوکن ہریالی کا انتظام اور سلیقہ معصوم کے پروردگار کے تو یہ ہے ہی اظہار پاتا ہے۔ فلان مہنگا المعروف ہ لکھنات کا قدرے طویل اقباس سے معصوم کا نسا کہ ملاحظہ ہوں کا قاعدہ ہے۔ اور وحشی جانوروں کی طرح ہلانے اور چارے سے رام ہوتے ہیں۔ معصوم کا یہ حال ہو گیا تھا۔ کہ غیرت بیگم (حقیقی ماں) کی شکل سے دور بھاگتا تھا اس کی پرچھائیں سے ڈرتا سمجھٹے گھر میں داپنی سوتلی ماں کے ہاں اس کی ایسی خاطر داری ہوتی تھی کہ اس نے اندر پاؤں رکھا۔ اور ہریالی نے دودھ اس کو گود میں لیا۔ ہاتھ نہ دھوایا۔ بالوں میں تیل ڈالا۔ کنگھی کی آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ میوہ مٹھائی اس کے لئے لگا رکھی تھی۔ جو کچھ موجود ہوا کھلایا۔ بس معصوم سانسے سانسے دن بھر ٹھٹھٹھ گھر میں ٹھٹھٹھ تو روتا اور بچتا۔ ہونڈی نے چھوٹے گھر میں جا کر معصوم سے کہا: بلیاں لی لی جلتی ہیں۔ ہونڈی کی ٹوٹ پکڑ کر اور طبی س کو معصوم دین میں لے گیا۔ پھر ہونڈی گدی اٹھاتی ہے۔ نکل نکل پڑتا ہے۔ اس کشتہ کشا میں ہونڈی دیر لگ گئی۔ اور وہاں غیرت بیگم ہاتھ میں معصوم کے انگرکھے کا اکیرا لے کر (باپ اپنے کیلے) انتظار کر رہی ہیں۔ آخر دوسری کو دودھ لیلہ نسبی معصوم کو بلانے لگی تھی۔ وہ بی مرکہ گئی۔ بس آپ بھی اس کے ساتھ کھیل میں لگ گئی ہوگی۔ بارہ دہوں کو کچھ کے تو "غیرت بیگم جو کچھ کر اور سنا ہو کہ نعلت بولی تو اپنے دلچسپ گھر میں بیٹری نے بھی سنا اور اس نے جلد سے اسے کھانسی سے کہا: آہا بڑی ماں کے یہاں کیسے کیسے بیمار کے کپڑے آئے ہیں۔ جلدی بھاگ کر جاؤ کہ تہا دی جی اچن بیو نئی جاتے۔ وہ بڑی ماں بیٹھی کہہ رہی ہیں۔ آنکھیں بھیجی کون آئے! آنکھیں بھیجی کون آئے!!"

معصوم سامنے گیا۔ تو غیرت بیگم بولی: تم نے جان ہار، یوں ہی سانسے دن غذائی چار خاک چھاننا پھر پھر۔ دیکھ اب تجھ کو کیسے قالم اسکو کے پاس پڑھنے بٹھاتی ہوں۔ تو بھی یاد کرے۔ معصوم: میں اپنی چھٹی ماں کے پاس بھاگ جاؤں گا۔ غیرت بیگم: ہلفو سپنے میں الیک بڑا سا لگا رہا کہ اس کجست ناشہ فی کا منہ جلاؤں، ٹکڑا بول کا بد بگدی بولی کا شور بہ، آواز اپنی امالت پر گیا کچن، ہریالی، کو سیا بنایا میرے سامنے اگر پھر اس مرا کو ماں کہا ہو گا۔ تو جو پکڑ کر کاٹ ڈالوں گی۔ معصوم: سن کر آدمی دور سے پھرانسا بھاگ گیا۔ بسنتی بیچے دھڑی بھی، مگر اب وہ کس کے ہاتھ آتا تھا۔ پورے ہی میں کھڑا غیرت بیگم کے چڑانے کو پکار پکار کر چھوٹی ماں!! چھوٹی ماں!! کہتا تھا۔ جہاں غیرت بیگم نے دیکھا۔ تو اڑیں ہو گیا۔ اور پھر وہی وہیں سا خٹا کہ چھوٹی ماں! چھوٹی ماں!! کہنے لگا۔ غیرت بیگم نے دلالاں میں سے بیٹھے بیٹھے جوتی کھینچ ماری۔ مگر وہ ڈیڑھ جوتی تک کیا پہنچی۔ عرض معصوم کو جو دھتلی۔ تو غیرت بیگم کو اسی طرح گھڑی بھر دتی کہ تادہ۔ اور پھر چھوٹے گھر میں جا گھسا۔

اگر فسانہ عجائب، چارہ دیش وغیرہ قسموں کے کرداروں کا ڈاکٹر تیرا احمد کے ناول سے مقابلہ کریں۔ تو ڈاکٹر تیرا احمد کے کرداروں کی زیادہ جاندار معلوم ہوتے ہیں۔ فوق البشر کرداروں اور متخیل زندگی سے بہت کہ ہم انسانی کرداروں اور گوشت پوست کی زندگی کے قریب آتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ زندگی کے یہ نقوش بھی تمثیلی ہیں کہ داری نہیں۔ پھر وہ کہہ کر تگادی کے سنگ بنیاد اور سنگ میل کا کام فرمادے دیتے ہیں۔ دوسرے ہیں ڈاکٹر تیرا احمد سے پہلے کے قلموں میں ننھے کرداروں سے واسطہ ہی نہیں پڑتا۔ اگر اسیا کہ واسطہ تو اتنا کہ یہ پیدا ہو کر تعلیم اس قابل ہو جاتا ہے کہ کسی مدد سے یا خود دیش سے عشق کی چنگیں کھانے اپنے جوان کردار کو پیش کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر تیرا احمد کو زندگی میں گہری دہشت تھی۔ انہیں انسانی نگاہ مل تھا۔ وہ زندگی کا قاعدہ بھی تھا۔ وہ زندگی کے متعلق ایک خاص نظریہ بھی رکھتا تھا۔ اسی نظریہ کے تحت بچے کی پیدائش، اس کے والدین، اس کے ماحول اور اس کی تربیت کو پیش کیا ہے۔ اصلاح کا کام کرنے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے اسے ننھے کرداروں کی، قوم کی نئی نسل کی ضرورت تھی۔ اسی ضرورت کی بنا پر اس نے ننھے کرداروں کی طرف توجہ کی۔ اور انہیں نبھانے کی مروت نکالی ہے اور بات ہے۔ کماؤں کا فنی نقص ہر جگہ اس کی مقصدیت کی چلی کھاتا ہے۔

عابد حسن منٹو

ادب میں نقطہ نظر کا مسئلہ !

(۲)

(اس مقدمے کا پہلا حصہ ستمبر کے شمارے میں چھپ چکا ہے)

جدلی مادیت کے فلسفے کا اطلاق تاریخ پر کیا جائے۔ تو تاریخی مادیت کا فلسفہ وجود میں آتا ہے۔ تاریخی مادیت تاریخ کا سب سے زیادہ منطقی اور سائنسی نقطہ نظر ہے۔ اس لئے کہ اس میں نہ صرف مختلف ادوار کے واقعات اور حادثات اپنی ظاہری صورت میں جمع ہوتے ہیں، بلکہ ان واقعات اور حادثات کا تجزیہ کر کے ان کے مدعا ہونے کے صحیح وجوہ بھی معلوم کئے جاتے ہیں اور پھر یہی تاریخ جن مختلف ادوار میں تقسیم ہے ان کا تجزیہ کر کے ایک دور کو دوسرے دور سے علیحدہ کرنے والی اہم ایک دور کے بعد دوسرے دور کو جنم دینے والی قوتوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس فلسفے کی رو سے ثابت ہوا ہے کہ تاریخ کا دھوا محض کسی سکندراعظم، یا نپولین یا آلبر کے ہاتھوں اپنی سمت تبدیل نہیں کر سکتا۔ بلکہ انہوں نے ان کے ہاتھوں جو کام سر انجام پائے ان کے پس پشت حاصل دوسری سماجی طاقتیں سرگرم عمل تھیں۔ تاریخی مادیت مختلف ادوار میں انہی سماجی طاقتوں کے تعین کرنے کا نام بھی ہے۔۔۔۔۔ اس نقطہ نظر کے تحت سماج کی تبدیلی کے جو قوانین مرتب ہوئے ہیں۔ وہ ایسے ہیں کہ محض اپنی سے واقفیت کی بنیاد پر آپ مختلف زمانوں کے تہذیبی، سیاسی اور سماجی ڈھانچوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً تاریخی مادیت نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ مختلف ادوار میں جو مختلف طبقات موجود رہتے ہیں۔ انہی کے تغاؤ سے نیا سماج جنم لیتا ہے۔ اور پھر یہ کہ ان طبقات کو جنم دینے والے وہ مخصوص پیداواری طریقے (آلات پیداوار اور ذرائع پیداوار) ہیں جو اس دور میں مستعمل ہوتے ہیں۔ چنانچہ مشین کے زمانے سے پہلے کسی بھی حصے میں وہ مزدور طبقہ موجود نہیں تھا جو آج دنیا میں موجود ہے۔ انہی قوانین کی مدد سے اگر کسی زمانے کے پیداواری طریقے۔ جن میں آلات پیداوار اور دیگر ذرائع پیداوار داخل شامل ہیں، کا علم ہو، تو اس زمانے کے طبقات اور اس زمانے کے سماجی نظام کی بہت سی خصوصیات سے ہمیں کسی دوسرے زمانے کے واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اگر کسی زمانے کے طبقاتی رشتوں سے واقفیت ہو تو اور بھی زیادہ آسانی کے ساتھ اس زمانے کے فلسفوں، اور معاشرت پر دشمنی ڈالی جا سکتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن یہ اصول میکانیکی طریقے سے استعمال میں لانے کی چیز نہیں ہیں کیونکہ جب ذرائع پیداوار میں تبدیلی آجاتی ہے۔ اور نیا سماج جنم لے لیتا ہے تو اس کے بعد بھی پرانے سماجی نظام کی بہت سی خصوصیات کافی دیر تک موجود رہتی ہیں۔ خاص کر فلسفہ و ادب اور ثقافت میں، کیونکہ یہ چیزیں صدیوں کے تجربوں کا پتھر اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اور ان کا ایک لحاظ تبدیل ہونا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ایک مرتبہ نیا نظام اپنے پاؤں میں کھڑا ہو جائے تو پھر بالائی اس کے طبقاتی رشتوں کی مدد سے اس کی تفصیلات متعین کی جا سکتی ہیں۔

تاریخ کا یہی سائنسی نظریہ جو اندازوں اور تخیل کی بلند پروازی کی جگہ قوانین فطرت کے صحیح شعور کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ ہمارے بھی مد نظر ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسی کی مدد سے ہم اپنے ملک کا تاریخی جائزہ لیں گے۔ اور یہ دیکھیں گے کہ اس وقت ہم ارتقادی کوئی منزل پر ہیں۔

رسم بنا دیا۔ یہیں بھولنا نہیں چاہیئے۔ کہ یہ چھوٹی بھوٹی بڑھیاں بھی ذات پات کے احتیانات اور غلامی کی ننگہ دستہ وعدہ تھیں۔ انہوں نے اٹھانے کو سلامت پر قاعدہ کرنے کی یہ رائے۔ انسان کو غلام ہی حالات کا غلام بنا دیا۔ ایک سماجی حالت کو جو آپ ہی آپ نہ پاہور ہی تھی۔ ایک غیر متغیر قسماً سے دیا۔ اور اس طرح فطرت کی پرستش شروع کر دی، جو انسانیت کے جوہر کو غارت کر دیتی ہے۔ (کامل، اکبر احمد ہندوستان، صفحہ ۳۹)

پنا خیر اس دوسکا اکثر اب اسی ہے بسی، تقدیر پرستی۔ اور ادھام پرستی کا شکار ہے۔ — یہاں اس قدم بحث سے ماسل جو بہت پیش
رہا مقصود تھی۔ وہ یہ ہے کہ اگر ہم انگریز سائنس کی آمد سے پہلے کے نظام کو بھی بعض اوقات جائز بنی نظم کہا جاتا ہے۔ لیکن اس جاگیر نظام
اور انگیز کے پیہ اگر وہ جاگیری نظام میں کچھ نیا دی فرق تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ نیا دی فرق پیدا نہ ہوتا تو انگریز کی حکومت جس پہلی شاخوں
کی طرح ہی محض مزدور ملک محدود رہتی اور اس کا وہی عیشیت میں داخل نہ ہوتا۔ لیکن انگریز کی آمد نے اس وہی عیشیت ہی کا ناقص کیا۔ اور اس کی بجائے ایک نئی
جاگیر عیشیت کو فروغ دیا ماسی کے سبب سائنس ایک سائنس کی طاقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ملک پر تو بعض بھی ہو گیا۔

[illegible]

سہل لیا بٹھرایا۔ اور اس کا تختہ زمین کے اعتبار سے کیا گیا کہ پیدار کے اعتبار سے ۔۔۔۔۔۔ اسی کے تجربے کے طور پر جاگیر داروں کا یہ تیار طبقہ ۔۔۔۔۔۔ جو اس سے پہلے مفقود تھا ۔۔۔۔۔۔ اپنے تمام تر ظلم و تشدد کے ساتھ وجود میں آگیاں جاگیردار طبقہ کی انگلیز سرکار کے ساتھ غیر شرطا دوستی کا اظہار مندرجہ ذیل اعتبارات سے کر سکتا ہے :-

۱۔ جاگیرداروں کی پر خلوص اعانت پر چاہا جائے کہ وہ سکے ہیں ۔۔۔۔۔۔ رینگال کے زمینداروں کے وعدہ کا واسطہ دیکھو کہ پاسپورٹ (۱۹۲۵ء) ۔۔۔۔۔۔ انہیں بھی رعیت ایک طبقہ کے ذمہ رہا ہے تو جہاں فرمن ہے کہ ہم حکومت کے ہاتھ مغبورہ رکھیں ۔۔۔۔۔۔ رینگال زمیندار کانفرنس منعقد ۱۹۳۷ء میں جہاں رجسٹرنگ کا خطبہ صحت خود لا روڈ ویمن پیئنگ نے کہا تھا ۔۔۔۔۔۔ رینگال کا نینداریت وطن خواہ اور مردروں میں نا کام بھی سمجھا جانے لگا۔ مگر اس کا ایک فائدہ ہوایکستہ زمیندار طبقہ کی پیداوار کے باعث ہوا ہے ۔۔۔۔۔۔ بیت الہیت کا ملک ہے ۔۔۔۔۔۔ یہ نیا طبقہ انگریزوں کو ابوبائی نظام کے استحکا۔ اور بدستور قائم رہنے کا بہت

documents on indian Policy vol .1. Page 215

بجائے بے دہشت و دایہ دہی معیشت کو توڑ کر نئے جاگیرى نظام میں تبدیل کرنے کا ایک دریدہ تھا۔ جو عبادتوں پر
 اب پرست ہو گیا۔

یہ جائیداد طبقہ سامراجی اقتدار کی ایک ایسی خاصیت ہے۔ کہ کوئی بھی نوآبادیاتی یا نیم نوآبادیاتی ملک ایسا نہیں جہاں یہ طبقہ موجود نہ ہو۔ سامراج

ادب یہ جاگیر کا نظام لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ جہاں نہیں بھی سامراج کے خلاف جدوجہد کی گئی ہے۔ وہاں جاگیر کا نظام کی بھی مخالفت کی گئی ہے۔ خود ہندوستان میں قومی آزادی کی جدوجہد کے آغاز کے ساتھ ہی ریاستوں میں نوابوں اور ہمارا جوں کے خلاف بھی جدوجہد جاری ہوئی۔ کچھ ریاستی جاگیرداروں کی اسی جاگیر کا نظام کا سب سے بڑا مظہر تھی۔ ریاستوں کے علاوہ انگریز سامراج نے کئی ادب جاگیر میں مختلف خدشات کے مسئلے میں مختلف ٹکڑوں کو بخش ادب اس طرح پورے ملک کو اپنے شکنجے میں جکڑ دیا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی ہمارے یہاں وہی پرانا جاگیر کا نظام قائم رہا۔ یہ وہی نظام ہے۔ جس کے متعلق ادب کہا گیا ہے۔ کہ سامراج اور یہ نظام لازم و ملزوم ہیں۔ اسی جاگیر کا نظام کے ساتھ ہی ہمارے ہاں ایک اور طبقہ بھی ابھرا۔ یہ تاجو طبقہ تھا۔

سامراج کی ہندوستان پر حکومت کے بعد جب قومی آزادی کی تحریکات سے جنم لیا۔ تو ہمارے ادب نے بھی اس میں بھرپور حصہ لیا۔ تقسیم سے پہلے کے ادب میں جاگیردار اور سائینس دشمنی کی جہانات بکثرت موجود ہیں اور دراصل ہمارے نئے ادب کی سب سے بڑی خصوصیت بھی یہی ہے۔ کہ اس میں ملک کی قومی جدوجہد کا نفس شدید طور پر موجود ہے۔ سامراج کا وجود ہے؟ جاگیر کا نظام برقرار ہے اور اسی کے ساتھ چند تاجو اور سرمایہ دار جو سامراج کے وفادار ہیں۔ علوم و شمن گروہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے برعکس پورے ملک کے پورے علوم جن میں سب سے زیادہ مزدور، کھیت مزدور اور کسان، ادب اس کے بعد وصالہ طبقہ۔ جو نئے جاگیردار اور قومی سرمایہ دار کی خصوصیت میں اوپر بیان کر چکے ہیں اس میں قومی آزادی کا نظام میں پس رہے ہیں چنانچہ اس وقت ان سب علوم کا مشترکہ مقصد سامراج اور اس کے ساتھ کھیت کر کے دے ڈالے جاگیردار اور سرمایہ دار سے آزادی حاصل کرنا ہے۔ اور ہر کچھ عرصہ سے انگریز سامراج کے علاوہ امریکی سامراج بھی اس ملک میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس سفاد پر کے حکمران طبقہ میں کچھ ساتھ ہی تلاش کر رہے ہیں۔ چنانچہ انگریز اور امریکی سامراج کا باہمی تنازعہ مشرق وسطیٰ کے کئی ملکوں کی طرح ہمارے ملک میں بھی مختلف ہٹاؤں کی صورت میں پیدا ہوا ہے۔

اس صورت و حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری سماجی زندگی میں وہ غلطی اور نظریات جو جاگیر کا نظام اور سامراج کے پیدا کردہ ہیں۔ ابھی تک موجود ہیں۔ مثلاً تو ہم پرستی، تقدیر پرستی، وجہانیت، فحاشی، افنی کو زندگی سے علیحدہ کر کے تھیں بات بنانے اور جہان، حیوانیت وغیرہ۔ ہمارے ادب کو ان تمام رجحانات کا ادب براہ راست سامراجی امتداد لکھ جاگیر کا نظام کا مقابلہ کرنا ہے۔ اور انہیں شکست دینا ہے۔ یا اگر ایک فقرے میں کہا جائے تو ہمارے ادب کو قومی آزادی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لینا ہوگا۔ لیکن اس مرتبہ اسے اس بات کی طرف بھی خاص توجہ دینی ہوگی۔ کہ اس جدوجہد آزادی میں ایسے طبقوں کو جاگیر کر کے جو پیچھے طبقوں کی طرح سامراج سے سمجھوتہ بازی کریں۔ یہ طبقہ ظاہر ہے۔ کسان مزدور کا ہوگا، جس کا کوئی مفاد اس امتداد کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔

نظریاتی طور پر اپنے فرائض سے آگاہ ہونے کے بعد ہم اب اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں کہ ادب میں یہ جدوجہد کی طرح عملی جامہ پہن سکتی ہے کیونکہ ظاہر ہے۔ ادب براہ راست سیاسی پراپیگنڈہ تو کرتا نہیں۔

ادب کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ تمام سماجی علوم سے علیحدہ ادب کا مقام فنونِ لطیفہ کی طرح ادب براہ راست شعور کو کم اور جذبات کی دنیا کے مارتے سے زیادہ اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔ انسانی جذبات کا خیر بلدی۔ ہر مزہ زندگی میں وقوع پذیر ہو سنے والے واقعات اور تاثرات سے تاثیر پذیر ہے۔ اسی لئے ادب کا کام بھی یہ ہے۔ کہ وہ براہ راست جاگیرداروں کے ساتھ بدکھنے کی جگہ جاگیر کا نظام اور سامراجی امتداد لکھ دے۔ ہر مزہ زندگی پر اثر متعین کر کے اس اثر کے خلاف فحاشیات پیدا کرے۔ یہ درست ہے۔ کہ ہمیں بعض واقعات صرف مزہ بازی سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ جیسے مولانا خضر علی کے کام میں یا گیا ہے۔ لیکن اگر ہمیں وہ طریقہ اختیار کرنا پڑے جو ہمارے ہاں پریم چند نے اختیار کیا۔ اور روس میں گوئی کے پیچھے

باب اے اردو ایک تاثیر

انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق — یہ دو نام ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہو کر رہ گئے ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ انجمن کی پوری تاریخ مولوی صاحب کی بے لوث خدمات اور مسلسل سماجی کاوشوں سے ظاہر ہے۔ انجمن ترقی اردو کے لئے وہ جس میں اُن کی شخصیت اور وہ کیلئے مولوی صاحب نے اپنی جوانی کی زندگی بھر بڑھاپے کا سکون لٹا دیا ہے۔

آج کل کراچی میں انجمن کا چھوٹا سا جشن منایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر نہایت ہی دلچسپ اور دلکش تقریریں ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا ہے کہ یہ مضمون دوزخ نامہ امرت کے شکر ہے کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے۔

آج انجمن ترقی اردو کے جشن پچاس سالہ کے موقع پر میں اُن کی مجلس سے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں جو میں نے دیکھ کر انجمن ترقی اردو کے صدر دفتر کا انجمنی منزل میں دیکھا ہے۔ جو صورت اور منظر اب میں بھی اپنے کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ اور جس کے ہر پہلو سے عجیب و غریب باتیں کہنے لگتا ہوں کہ کچھ تو خالص خیالی ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جب میں کراچی آیا۔ میری حالت صحت کچھ نہ تھی۔ تو مولوی صاحب قلم سے ہٹ کر لپٹ کر رہ گئے۔ اپنے کمرے کے باہر آ کر ایک کرسی پر بیٹھ کر رہ گئے۔ اور نگاہیں گرد و پیش کے ماحول سے بہت دور کہیں کچھ اندیشہ کرتے ہی تھیں۔ قدموں کے پاس ایک کالٹا بیٹھا تھا۔ کتے نے صبر نہ کیا کہ حد سے بھی آگے بڑھ کر بڑے ہی جارحانہ انداز میں مجھے خوش آمدید کہا یا احتجاج کیا یا کون جانے ہر مولوی صاحب پوچھے۔ کتے کو انگریزی میں ڈانٹا میں قریب پہنچا۔ بہت خوش ہوئے۔ اور سے کجبت تو یہاں بھی آگیا۔ موت کی طرح تجھ سے بھی بھارت نہیں آئیں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا: مولوی صاحب آپ کتے کو انگریزی میں ڈانٹتے ہیں: ہنسنے لگے۔ بولے۔ ”بھئی یہ تو ایک انگریز پھوڑا گیا ہے۔ میں اسے ادھر رکھا رہا ہوں۔ اُمت آہستہ بیکھڑے لگا۔ ابھی میری دور میں ہے: اور مولوی صاحب کا کٹا میرے ساتھ اُن کے سر پر لٹکا کر دیکھ کر کچھ نرم پڑا۔ اور میرے قدموں کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔ کتے کو میں نے سمجھا تھا۔ سیدھا سادہ انسان جو بڑا۔ مگر مولوی صاحب کو خوش کرنے کے لئے کتے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہا۔ مولوی صاحب بڑے سے سے ”ننوں“ سے تو جی ہلکا ہوا تھا۔ یقیناً تو ہے۔ اس کی محبت پر انسانوں سے گھبرا کر میں نے اسی کی محبت کا سہارا لیا ہے:

میں پابندی کے ساتھ انجمن آنے لگا۔ مولوی صاحب قلم سے سیدھا شمس صاحب دریا آبادی سے کہا۔ کہ ان سے کچھ کام لو۔ پاکستان میں انجمن کی سرگرمیوں کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میں تو می زبان میں کچھ کہنے لگا۔ بول سمجھے کہ تو می زبان کا کلام نہیں ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ تو می زبان کو اردو سے متعلق معائنہ اور خبروں کے لئے وقف ہونا چاہیئے۔ مگر سید شمس صاحب اس میں سلووات عالم ”اور عجائب و غرائب“ قسم کی چیزیں بھارت سے تھے۔ میں نے اگر کبھی دینی زبان سے اختلاف کیا۔ تو انہوں نے پس منہ نہ کیا۔ اور پھر وہی کا احساس کچھ اس درجہ بڑھا کہ میں نے حد تنادوں اماراتوں کے باوجود کچھ عرصہ تک انجمن کے دفتر نہ جا سکا۔

مولوی صاحب اس پر اپنے سال میں ہی انجمن کی خدمات کا طائرہ بڑھاتے ہی گئے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد جیسا کہ انجمن گیا۔ تو مولوی صاحب نے سید تقی الدین صاحب سے ملایا۔ تقی الدین صاحب اب انجمن سے متعلق نہیں۔ اُن سے میرے تعلقات بھی بد میں خراب ہو چکے ہیں۔ لیکن پوری ایاطی

ہوتے ہیں۔ موجدوں کو طرح ان کی طبیعت میں بھی قرار نہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کے لیے میں بڑے آدمی کو دائمی بڑھتی جا رہی ہے۔ تعلیم و انداز، ایک عجیب طرح سے ان کی باتوں میں جھلک اٹھتا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اسطاس کراچی میں مولوی صاحب نے جو تقریر کی تھی۔ وہ ذرا دور کی اولاد سلیم جلد ہی تھی۔ مجھے۔ اور جب میں ان کی تقریریں دیکھا تھا۔ تو میں تھا۔ اندیشہ اسے دور دراز۔ مگر ابھی مولوی صاحب اور جنس لگے۔ وہ بزدلی کی موت مر رہی نہیں تھکتے۔ بڑے حالات میں مرنا بھی بزدلی ہے۔ ان کی تقریر کا یہ جملہ مجھے سدا یاد رہے گا۔ کہ۔ میرا ایمان ہے۔ کہ دنیا کا ہر آدمی نیک ہے۔ مولائے کامل آدمی کے۔ اہم آج بھی مولوی صاحب میں جمل کی اتنی قوت ہے۔ کہ سرسید پر انہوں نے ۵۰۰۰ صفحات کا مضمون تین چار ماہوں میں مرتب کر رکھا۔ یا۔ ۱۰ سال اندہ کے لئے کوئی مناسب مضمون موجود تھا۔ قاضی احمد میاں اختر سوانا گڑھی نے یہی مولوی صاحب کے سبیل تذکرہ کہا۔ مولوی صاحب سن کر چلے گئے۔ اور تین چار دن کے بعد مضمون قاضی صاحب کے ہاتھوں میں تھا۔

بڑے آدمی اکثر کہتے ہیں کہ میں ذاتی پروپیگنڈے سے نفرت ہے۔ مگر پھر بھی یہی بڑے آدمی اپنے سیکڑوں کو ہدایت کرنے میں کلان کی چٹائی کی جائے۔ میں نے عبدالحق صاحب کو منور علی طور پر اس ذاتی پروپیگنڈے سے نفرت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی عظیم شخصیت کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔ میں نے ان سے ایک بار پیل ہی پوچھ لیا۔ کہ مولوی صاحب آپ کے والد کا اہم گرامی کیا تھا؟ بہت مذہب رکھنے والے آدمی صاحب نے کہا کہ اب کو یہ معلوم کر کے کہ رکتوں کا ثواب ہو گا۔ میں خاموش ہو گیا۔ عبدالحق صاحب خود خانی کے نہیں خود پوشی کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین نے بڑے سلیقہ سے کتنی سچی بات کہی ہے۔ کہ مولوی عبدالحق ان بزرگوں میں سے ہیں۔ جو ادا الحق سے ۱۰۰۰ کو صفت کو دیتے ہیں۔

مولوی صاحب کی زندگی بڑی اجل اور صاف نظری ہے۔ یہ زندگی ڈھلے ٹھلے کی طرح کسی دانع، جیسے کا متحمل نہیں ہو سکتی۔ ان کی زندگی میں اب بھی بڑا نظم و ضبط ہے۔ صبح کو ان کی پہلی تدریسی اکثر مدد تہ کی مدد کو چھوڑتی ہے۔ اس بڑے صاحبے میں بھی کلکشن کی ریت پر مولوی صاحب کے ساتھ قدم سے قدم مل کر چلنا بہت سے ذوالوں کے لئے مشکل ہو گا۔ مگر اہر وہ تین برس میں ان کی سند دستی بہت گزرتی ہے۔ اہم میں تو ان سے ان مجلسوں میں بھی نہیں جاتا۔ جہاں مولوی صاحب شرکت کرتے ہیں۔ تاکہ میں انہیں نہ دیکھوں، ان کے دور کا مداوا مسٹر پاش نہیں۔

اور اب جب ان کی طویل زندگی پر نظر ڈالتا ہوں۔ تو یہی بات ذہن میں آتی ہے۔ کہ
”اردو کے راستے میں انہوں نے جو ان کی رنگینی اور بڑے صاحبے کا مکون ٹھکانا ہے۔“

ہاجر و سرور

دوئی کتابیں ممتاز خٹ

اندھیرے، اجالے (ماننے)

نئی قدیں (مقالات)

قیمت: تین روپے

قیمت چار روپے

مکتبہ الاولیاء لاہور

مغیث الدین حسینی

نیا آفتاب

نئے افق سے نیا آفتاب ابھرا ہے
نیا اُجالا نئے صبح و شام لایا ہے

اس آفتاب کی کرلوں میں وہ حرارت ہے
جو ذہن کہنے کو اک تازہ روشنی دے گی
ضمیرِ مِرود کو بخشنے کی دولتِ احساس
دلوں کا زنگ چھڑائے گی زندگی سے گی

غروب ہو گئے رسمِ کہن کے ماہ و نجوم
بسا اُگھٹتہ بزمِ جہاں اُٹھتی ہے
نیا سفر، نئے راہی نئی ہے راہِ حیات
اُجالا پھیلتا ہے تیسرے کی کھٹکتی ہے

اس آفتاب کی اک اک کرنِ حیات بدوش
ضمیرِ ارض و سما کو جگانے آئی ہے
نیا تصورِ کیمت و نشا و بخشے گی
چرخِ بزمِ تمنا اُجالانے آئی ہے

نیا نظامِ مگستاں کو بخشنے کے لئے
نئے شکرِ فہ کھلاتی ہوئی گنتی ہے
شبابِ مجہوم کے سازِ طرب اُٹھاتا ہے
حیاتِ وجد میں آتی ہے قصہ قس کرتی ہے

سید رضی قمری

شہرِ دیراں

مرا شہر — یہ شہرِ دیراں
 جہاں روشنی مر گئی
 چاندنی بج گئی
 رکھزاروں میں صُبحوں کے اُجڑے ہوئے خواب
 شاموں کے مٹے ہوئے گیت
 بکھرے پڑے ہیں یونہی رائیگاں
 موت کی آہیں سونی گلیوں میں آزاد پھرتی ہیں
 گرتے ہوئے اور اڑتے ہوئے خشک پتوں سے کرتی ہیں سرگوشیاں
 ایک بے خانماں مہاجر پر شکستہ
 مگر پیر کے اک جنازے پہ زحہ کناں
 دم بخود دیکھتا ہے
 مرا شہر
 یہ شہرِ دیراں !

یہاں میں نے دیکھا کہ پھولوں سے زخماں اپنے ہی مڑگاں کے ٹٹوں سے غمی ہوئے

اور میں تین اٹھا

میں نے سب کو دکھایا کہ دیکھو یہ کیا کر رہا ہے یہ کیا ہو گیا؟
میں نے شاخوں پر اُتے ہوئے زخم دیکھے تو میں دروت مٹایا
میں ہر اک سے کہتا رہا دوستو، سناختیو یہ بہاریں نہیں۔

میرے پہلو میں نعمہ سی اک ابجو دیکھتے دیکھتے جوئے خوں بن گئی
اور میں کہتا رہا چھوڑ دو، شہر ویران ہو جائیگا، کھیت بل جائیگا
رہے بھرے ہونٹ گیتوں سے محروم ہوتے ہوئے دیکھ کر
میں نے ہر اک کو آواز دی

”بزرگ گل سے ہومت چھوڑو، یہ شبنم نہیں ہے۔“
یہاں شیطنت کے گھناؤپ اندھیرے میں اک مورقی رات بھر
معبودوں میں کراہی،

تو میں خوف سے کانپ اٹھا
میں نے سب کو بھیجوا کہ ”یہ کھیل اچھا نہیں“
”یہ مفت مک اُجالے نہ غارت کرو، باز آؤ۔“

* * *

مگر یہ مرا شہر لٹ ہی گیا
یہ مرا شہر لٹ کر رہا

اب خرابوں میں عفریت پرچم اڑاتے اُچھلتے پھریں گے،

نان و ایمان

لے کے ٹکڑوں میں میکدے کا شباب	جیسے آہو کا دیدہ بے خواب
مُسکرا کر گلاب بنتی ہوئی	گنگنا کر رباب بنتی ہوئی
سُرخ ہونٹوں کو پاپ کے من کا میت	سے رہا ہے جنم عوامی گیت
چھیڑ کر انکمٹروں میں دیکپ راگ	بھر رہی ہے رگوں میں خرمیں آگ
اللہ اللہ یہ برق پاشِ خدام	تیز رو ہو گیا ہے نام سے "کام"
نرد ماتھے کا کر رہی ہے عام	فدہ سودج سے لے لے سے سلام
چھیڑ کر زندگی کے افسانے	توڑنا چاہتی ہے بُت خانے
سے کے شانوں پہ گیسوؤں کا سحاب	آ رہی ہے وہ جانِ روح شراب

سوچتی ہے کہ کیا کرے انسان

اک طرف نان اک طرف ایمان

کریال سنگ بیدار

دعوتِ بہار

اُسے پڑھنے والوں کے ذہن میں کریال سنگ بیدار کی یاد آج بھی بیدار ہے۔ بیدار پہلی مرتبہ مولانا جواہر مرحوم کے ادبی دنیا میں چمکا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملک کی شعری فضاؤں پر اس طرح چھا گیا تھا۔ کہ شعرو شاعری کا کوئی تذکرہ اس کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد جہاں اور بہت سے ادیبوں کے متعلق یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہاں کریال سنگ بیدار کے نام کو بھی نگاہیں بے سود تلاش کرتی رہیں۔ مگر چند روز ہوتے دفتر ادب لطیف میں ایک لغافہ آیا۔ اور یہ ستر انگیر خبر لے کر آیا کہ بیدار شہتی پنجاب میں اپنی طویل علالت کے باوجود بدستور فکر و سخن میں منہمک ہے اور یہ نظم اس کے مہنی نگری انجائے کا نتیجہ ہے۔

ہم اپنے محترم دوست کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ کریال سنگ بیدار کا ایک لمبی مدت کے بعد دوبارہ بزم سخن میں آنا واقعی ایک بہت بڑا خوشگوار ادبی حادثہ ہے

ایڈیٹر

پھر فصل بہار آئی
اٹھ جام اٹھاساتی
اُغوش میں آساتی

یارانِ جواں مشرب
گاتے ہیں بجاتے ہیں
چیتے ہیں پلاتے ہیں
ہنستے ہیں ہنساتے ہیں
کچھ ہوش میں آتے ہیں
کچھ ہوش سے جاتے ہیں
خاموش ہے کیوں اب تک
اٹھ دھوم بچاساتی!

پھر فصل بہار آئی
اٹھ جام اٹھاساتی
شاداب ہیں دیرانے
گلزار مہکتے ہیں!
اشہار مہکتے ہیں
رنگارنگ مہکتے ہیں!

پھر فصل بہار آئی
بہم پیاس کے تاروں کو
زندانہ سخاوت کے
بیتے ہوئے صحنوں کی
ہر داغ مناساتی

پھر فصل بہار آئی
اٹھ جام اٹھاساتی

جلوؤں سے حجاب اٹھا
انکار کے پڑے میں
کچھ چاہ کے دن آئے
اب فوراً نہ جاساتی!
دیار کے دن آئے
اقرار کے دن آئے
کچھ پیار کے دن آئے
آنکھیں نہ جھراساتی!

خاموش پریمے بھی متانہ چمکتے ہیں !
وہ تان اڑاتے ہیں تو ہوش اڑا ساتی !

مہوش بنا ساتی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساتی !
کیا جلوہ مناساتی ہے چہ قدر نصاؤں میں !
کیا روح فزائی ہے مسرور ہواؤں میں !
کیا ہوش ربانی ہے مخمور کھٹاؤں میں !
اب دیر سے کیا ساتی لا بلر پلا ساتی !

بائیں نہ بنا ساتی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساتی !
بنائے جھنک اٹھی اہم نما ہو کر
سہا سے مہک اٹھی الام رہا ہو کر
ساغرے کھنک اٹھی خمیام نوا ہو کر
اب نیم دل کیسی ! اٹھ جوش مناساتی !

پی اور پلا ساتی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساتی !
نبیل کی نواسے ہے اک سوز ازل پیدا

سنبھل کی اداسے ہے کاکل کا بدل پیدا
قلقل کی صدا سے ہے حافظ کی غزل پیدا
آمت ادا ساتی ! رندانہ پلا ساتی !

دیوانہ بنا ساتی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساتی !
ہر جام کی تابش میں جمشید نظر آیا
ہر نقش کے پیکر میں بہت زاد اتر آیا
ہر پھل کی گہر سے گور اُبھر آیا

اٹھ بزم حاساتی ! پی اور پلا ساتی !
گلا اور بجاساتی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساتی !
غالب کی لطافت ہے پھولوں کی جوانی میں
اقبال کی شوکت ہے موجوں کی روانی میں
محرّم کی آمد ہے بہتے ہوئے پانی میں
آمرج میں آ ساتی ! جتنی ہے پلا ساتی !

میں نہ بنا ساتی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساتی !
ہر گام پہنیزے نے محل سی بچا دی ہے
ہر زنگیں فناں نے پھیل سی بچا دی ہے
ہر لالہ عجب نے مشعل سی بچا دی ہے
تو بھی مئے روشن سے فادیں جلا ساتی !

اندھیر بنا ساتی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساتی !
نکشن کی نفاذات طوفانِ شباب اٹھا
چھلے ہوئے شیشوں رحمت کا سحاب اٹھا

محبوبہ فطرت کے چہرے سے نقاب اٹھا
تو بھی ریح زیبا ہے زلفوں کو سہا ساتی !
دیدار دکھا ساتی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساتی !
خوبانِ پری پیکر کیا ناز دکھاتے ہیں
لوخیز کرشموں سے کیا نقش بٹھاتے ہیں
گلزنگ تبسم سے کیا پھول کھلاتے ہیں
تو بھی لبِ خنداں گلزار کھلا ساتی !

سوز تک دکھا ساقی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساقی !
جس بادِ زنجیں میں گزرتے نظر آئے
گلیوں میں حسینوں کا دیدار نظر آئے
ہر قطرہ گلگوں میں رخسار نظر آئے
وہ بارِ زنجیں بھی اک بار پلا ساقی !

سرشار بنا ساقی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساقی !
وہ آتشِ ترس کو نیزنگِ نظر کہئے
ستیاں شفق کہئے سراجِ سر کہئے
ہر نیند کو تابش میں غر شید قمر کہئے
اُس آتشِ تر کا بھی اک جام پلا ساقی !

الام حبلا ساقی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساقی !
وہ مستِ نظر جس سے صبا کی چمک اٹھے
پیمانے کو جب دیکھے پیمانہ چمک اٹھے
میناؤں رستی کی ہر چیز بہک اٹھے

اُس مستِ نظر سے بھی وہ گھوٹ پلا ساقی !

سرست بنا ساقی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساقی !
یہ سلسلہ نما عالم صدنگِ نظاروں کا
یہ چاند کی تابانی یہ نورِ ستاروں کا
فطرت کی یہ برنائی جوین یہ بہاروں کا
ایک ایک کو سانو میں حل کر کے پلا ساقی !

محمود بنا ساقی !

پھر فصل بہار آئی

اٹھ جام اٹھا ساقی !
یہ شام کی لہرِ حلائی
گلزار کی رنگینی کبسا کی عینائی
وادِی کی دل آویزی صحرائی دل آرائی !
ایک ایک کو صبا میں غمت سے پلا ساقی

رندوں کو پلا ساقی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساقی !
یہ شمعِ حسینوں کے عجب ہے پیروں کے
یہ تابِ اداجلوئے مہتابِ نواجلوئے
کچھ خوابِ فزا جلوت کچھ خوابِ ربا جلوت
ایک ایک کے شیشے کی کدوں سے پلا ساقی !

خورشید بنا ساقی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساقی !
یہ فکر، یہ اندیشہ اعمال کی ثمت کا
یہ رنجِ ندامت کا یہ خوفِ ملامت کا
خدا شہ یہ جسمِ خم کا دھڑکا یہ قیامت کا
ایک ایک کو صبا کی موجوں میں بہا ساقی !

معدوم بنا ساقی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساقی !
یہ دبدبہ شامی کا یہ رعبِ امارت کا
یہ نازِ حکومت کا یہ فخرِ وزارت کا
یہ چالِ سیاست کا یہ کھیلِ شرارت کا
سب پر مئےِ رونق اک برقِ گرا ساقی !

خاشاک بنا ساقی !

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھا ساقی !

یہ لوگ جو مذہب پر آپس میں گہرے ہیں
ناچیز مسائل پر ناکام جھگڑتے ہیں
بے سود اُلجھتے ہیں بے نائدہ لڑتے ہیں
ان سب کو مروت کے آداب سکھاساٹی!

انسان بنا ساقی!

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھاساٹی!
وہ دین جو انسان کو ہمسائے کے بچوں پر
برسوں کے مرنے کا اُس دین کی آفت سے
دُنیا کو بچا ساقی!

بیدار مٹا ساقی!

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھاساٹی!
وہ پتھ جو پیرو کہ تہذیب مٹاتا ہے
کمزور نہتے پر اُس پتھ کے قتلوں کو
توت سے دبا ساقی!

سختی سے مٹا ساقی!

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھاساٹی!
وہ سخت جرم مانے میں انصاف خالی ہے
مٹا کر لٹیرا ہے اُس مت کا زمانے سے
نابید بنا ساقی!

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھاساٹی!

۱۔ میلہ کو بدھوئے تین سال ہر چکے ہیں۔ (معنی)

وہ دُور جیب آپس میں اخلاص کی باتیں تھیں
جب یلیم مجھے ن تھے جب پلر کی راتیں تھیں
جب شیخ و برہمن میں چالیں تھیں نہ گھاتیں تھیں
اُس دُور محبت کو اک بار بھلا ساقی!

دُور تھوں کو مٹا ساقی!

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھاساٹی!
احباب بہم مل کر کیا دھوم مچاتے تھے
کیا جشن مناتے تھے کیا بزم سجاتے تھے
کیا شعر منانے تھے کیا نغمہ جھاتے تھے
اُس عہدِ مسترت کو پھر کھینچ بھلا ساقی!

بھڑوں کو مٹا ساقی!

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھاساٹی!
جو صاحبِ دولت تھے وہ دستِ نگر کیوں ہیں؟
جو بزم کے ساقی سے وہ تشنہ جگر کیوں ہیں؟
جو ملک کے والی تھے وہ ملک بدھ کیوں ہیں؟
یہ شر نما عالم عالم سے مٹا ساقی!

قینوں کو دبا ساقی!

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھاساٹی!
اس موسمِ دلکش میں بیتا و حزیں کیوں ہوا؟
افسردہ نظر کیوں ہوا؟ پڑمروہ جس کیوں ہوا؟
دیرینہ علالت سے دنگیر و غمیں کیوں ہوا؟
اس مردِ عزیز کو بھی دھکونٹ بھلا ساقی!

دُشاد بنا ساقی!

پھر فصل بہار آئی اٹھ جام اٹھاساٹی!

وہ گھبرا گئے اور عجب اودھرا اچھوڑ کر اندر چلے گئے۔
وہ بچکے کے قریب پہنچی اور اپنی قمیص کے گریبان کو اٹھا اٹھا کر سینے میں شراوبہ محکم کو ہوا پہنچانے لگی۔ جب سے اس کی شادی ہوئی
تھی یہ پہل پہل برقی۔ کہ ان کے ہاں کوئی بہانہ آیا تھا۔ اس کی شادی ہوئے چھ سات مہینے ہو چکے تھے۔ نہ جانے۔ کتنے دن رہے!
اس نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ سوچا۔ ایک دو دن میں اکتانہ مہیاگ بنائے گا۔ انہیں گھر میں دکھا ہی کیا ہے! کوئی پہل پہل نہ کسی کاہل
بھرا۔ قبرستان کی سی خاموشی بھائی رہتی ہے۔ وہ تو ٹھہرا ٹھہرا باسی بہاں اس کا دل کچھ گٹھے گا۔ اس کی نظریں بے جوڑے دیوان محن کے
خٹک بیل بوڑوں پر سے ہوتی ہوئی پھیکے پھیکے آسمان کی گدہ بھڑوں میں گم ہو گئیں۔ وہ اس گھر کی منتقل خاموشی، دہرائی اور بے مدد تھی سے ہلک ہوئی
جاری تھی جو سات مہینے پہنچ گئے۔ گئے تھے۔ کوئی کام کاج نہیں تھا۔ کوئی شغل نہیں تھا۔ جس سے جی بے اور وقت کٹ سکے۔ سارا
سلاخان اپا بچوں کی طرح کرکسی پر بٹھے یا چار پانی پہ لیٹے لیٹے، بے جان، خاموش، دور و دیار کو گھومتے گھومتے، تنہائی میں طرح طرح کی باتیں
سوچتے سوچتے، اس کے دل میں بدل سا اٹھتا۔ شروع شروع میں گھر میں میاں بوی کے علاوہ صرف ایک خادمہ تھی۔ جو اس کے ساتھ میکے
سے آئی تھی۔ وہ سارا دن گم گم مسم اپنی بچاؤ گی اور بوی کا ماتم کرتی رہتی تھی۔ گزشتہ اس کی بھیم تھی۔ اور وہ دونوں اکٹھا کھیل کودی تھیں۔ لیکن جوانی
میں آکر اور نام طرہ پر شادی کے بعد ان کے درمیان ماکہ اور ذکر کا اقیانوس نمایاں طور پر پیدا ہو گیا تھا۔ گھر کی روایتی تربیت نے اس کے دہن
پر یزید سید، خیال فخر کر دیا تھا۔ ذکر آخر ذکر ہی ہے۔ اور اس کو منہ لگانا... یا بے تکلفی پر تنہا اچھا نہیں۔ اس لئے وہ دونوں عورتیں ایک
دوسرے کے مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک دوسرے کی تنہائی میں بے جا مداخلت کرنے سے گریز کرتی تھیں۔ یہاں صاحب صبح سے شام
تک کچہری میں رہتے تھے۔ اور وہ اس عجیب عجیب حالت میں رہتے ہوئے گھر میں انہی کسی وحشی مگر عقیدہ باند کی طرح اس بے جوڑے گھر میں بے
مقصد گھومنا کرتی تھی۔ آخر کار اس طویل تنہائی اور اکیلے پن سے گھر پر اس نے اپنی چھوٹی بہن کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ لیکن "سکوت اور عجب و اس
گھر کی دنیا پر مسلط تھا۔ چہرے میں نہ ڈٹ سکا کوئی مہاندی نہ تھی۔ کہیں آنا جانا نہیں تھا۔ وہ دونوں ہمیں سارا سا دان ایک دوسرے کا نہ تھے تھے
اپنے اپنے حلقے کو گھونٹوں گھونٹوں کوئی بات ڈھونڈنے کی کوشش کرتیں۔ اور جب کوئی نئی بات نہ ملتی تو پرانی اور کئی بار دہرائی ہوئی باتیں

اس کی نظریک بار پھر مرجھائے ہوئے پردوں پر پڑی۔ وہ کچھ سر ج کڑاٹھا اور غصے میں چلا گیا۔ دونوں نہیں سمجھتے تھے اسے تنگے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ پانی کی بھرتی ہوئی بالٹی اٹھا کر باہر گیا اور ان کے پاس سے گزر کر چپ چاپ گمنام میں چلا گیا۔ یہ کیا کہنے لگے ہو؟ بیگم نے پوچھا۔ میں نے سوچا وہ پانی کو پانی دیدل نہ۔۔۔۔۔ یہ تھوڑے میں میں پانی دیدل۔ آپ کے کپڑے خواب ہو جائیں گے۔ یہی سن کر اس کے پاس جا کر اس کے ہاتھ سے بالٹی لینے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ مگر وہ کہہ دیا کہ کوئی بات نہیں تم جا کر اپنا کام کرو۔ وہ نہ ٹھکانے والی نہ تھی۔ مدد نہیں کروں گا۔ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرے!۔۔۔۔۔ کیسے اس کا ہاتھ بٹائیں؟ وہ ایک دوسرے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کہیں کون کرے۔ آخر وہی میں اٹھی۔ ایک گلاس اٹھا کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ "ہاں میں مجھ ہی تمہاری مدد کریں۔" وہ ٹھکانا دیا۔ وہ دونوں پورے دل سے پانی دینے لگے۔ "یہاں وہ دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ وہ کون سا پہلے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کچھ دیر نہیں دیکھتی رہی۔ آخر اس نے وہ گلاس اس نے غصے میں جا کر دوسری بالٹی بھری اور اسے اٹھا کر گمنام میں لے گئی۔ اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر مقابل کی کھڑکیوں کو پانی دینے لگی۔۔۔۔۔ بڑی بہن نے گرجا کر دیکھا کہ اس کے ہونٹ پر مسکراہٹ تھی۔ جس میں بے سے طنز اور مذاق کی جھلک تھی۔ اور دینی دھماکے کی دھیر پر مٹی ان تینوں کی طرف بھیجی۔ شک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

شام کو چائے سے فخر ہو کر صبا صاحبہ کی کسی میں جم کر بٹھ گئے۔ اور حقہ گڑا گڑا کرنے لگے۔ موسم کچھ برل گیا تھا۔ صبح کی سی گھٹن نہ تھیں۔ نہیں تھا۔ کل کی پوچھنے کی تھی۔ بابا ایک دوسرے سے باتوں میں مگرتھے۔۔۔۔۔ آج آپ ہر نہیں جائیں گے! ان کی بوی نے پوچھا۔۔۔۔۔ نہیں جی ہاں! وہ ٹھکانے ہوئے ہوئے۔ آج بھی کرنی باہر جانے کا دن ہے! اتنے دنوں کے بعد قابل گھرا رہا ہے۔ اس سے دو چار باتیں کر لوں!۔۔۔۔۔ آج صبا صاحبہ بھی اپنا پورا گھر اٹھ چکے تھے۔ وہ ان کا روز کا معمول تو یہ تھا کہ چائے پیتے ہی ہنا دھو کر باہر نکل جاتے تھے۔ اور پھر رات کو کھانے کے وقت گھر وٹتے۔ ان کا گھر میں ہی نہیں لگتا تھا۔ جی جگہ بھی کیسے! وہ گھر میں گم مٹی کرنا کرتے! ان کے دونوں سے کیا باتیں کرتے! اپنے مرنے سے نہ خاموش گھر کو دیکھ کر انہیں وحشت سی ہونے لگتی۔ اچانک مروجہ بیری کے دانے کی پہل پہل اور دنی کو یاد رکھنے کے ان کی وحشت ابھی بڑھ جاتی۔ وہ تمام امیدیں اور توقعات جو انہوں نے کبھی دوسری شادی سے وابستہ کی تھیں۔ رفتہ رفتہ امیدیں اور بالوں میں مٹی جلد ہی تھیں۔ حاصل میاں جی کے۔ میان گھر کا خاندانیت زیادہ تھا۔ اور یہ عمر کی طلحہ اس قدر دین اور گہری تھی کہ کسی قسم کا رشتہ یا بندھن اسے پر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بڑا سا بچہ میں قدم رکھ چکے تھے۔ ان کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اچانک ہی بڑی چسپانہ تھیں۔ کھنگھنگاتی۔ ان کے اپنے لڑکے سے صرف دو تین سال بڑی!۔۔۔۔۔ اور ابھی بیویاں سال میں تھی۔ مگر جہانی لحاظ سے وہ دونوں بہنیں جوان تھیں۔ اور کل عورتیں بن چکی تھیں۔ لیکن عقل ابھی بوجھ کے اعتبار سے۔ وہ ابھی تک بچے میں تھیں۔ ان کی تعلیم نہ ہونے کے باوجود تھی۔ خود راہبست اور دیکھ پڑھ لیتی تھیں۔ جو انہوں نے خاندانی تعلیمات سے محروم گھر پر ہی سیکھا تھا۔ تربیت میں بالکل مغفرت تھیں۔ گاؤں سے آئی تھیں۔ اس لئے وہی گناہوں جیسے طریقہ طریقہ۔ وہی بول چال کا دلچسپ۔۔۔۔۔ بات کا کہنے کا سلیقہ۔ ان کے بیٹھے بیٹھے کی تیز آمد نہ گھر کے مہمانوں کی خاطر مہارت کہنے کا شعور ہی وجہ تھی۔ کہ ان کے گھر میں لوگوں کا آنا جانا بے پروا تھا۔ شرم و شرم میں قہاروں نے اپنی بیوی کی تربیت کا طریقہ کافی دیر ہی تھی۔ اسے کپڑے پہنے کا ڈھنگ۔ اٹھنے بیٹھنے کے ادب اور بات چیت کا سلیقہ وغیرہ سکھانے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد مایوسی ہو کر دل چھوڑ بیٹھے۔ اور اس وقت بھی ان کے سامنے کہہ سکا کہ اپنی پالتی بچے بیٹھی تھی۔ حالانکہ وہ اُسے بیویوں مرتبہ اس طرح بیٹھے سے نسخ کر چکے تھے! ایک تو اس مروجہ سکول اسٹیج پر نہیں آئی تھی۔ اور دوسرا ان کی بیوی اس بچہ میں پہنچ چکی تھی۔ جہاں پانی جادوں کو چھوڑنا پڑا۔ شکل برتا ہے۔ اور زندگی کے سانچے میں ڈھلنے ڈھلنے ہی دھلتی

ہے۔ ماہی اپنی عقلی لامعائیں ہر چکا تھا۔ لیکن کیا کرتے عقلی ملک باد ہر چکی تھی۔ اب اس کا نیازہ بھگت ہے۔ تھے۔ دلا پر جبر کے نچا سنے
بہت تھے۔ بڑا صاحب میاں انہیں جس اڈم کا شمش جمدی اور ہمدی کی آرزو تھی۔ وہ چیزیں انہیں میرے آسکیں۔ حالانکہ اسی مقصد کے پیش نظر
بڑوں نے دوسری شادی کی تھی۔ مگر وہ شاید یہ بھول گئے تھے کہ یہ چیزیں تو طویل۔ ناکت اور ذریعہ کے بعد ہی پیدا ہوتی ہیں۔ دو بیٹے یاد
سال میں نہیں۔ بڑا صاحب اور جوانی کا یہ ہے جو بڑھیل انہیں اس میں گیا تھا۔

لہذا ہی ان کے درمیان کسی قسم کی ذہنی تعارض اور ہم آہنگی پیدا ہو سکی تھی۔ وہ عمر کی ضرورت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اور اس بچاری
کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ بدھوں کی تلوں مزاجی اور ان کے پوئلکوں کو کیسے سمجھتی۔ اگر اسے اپنی کنگھی چوٹی اور باد ستار سے فرصت نہیں ملتی
تھی۔ اگر وہ کچھ بھول جاتی تھی کہ کیا صاحب کو علی الصبح جانے کی پالی سے ساتھ تازہ کیا براحتہ مل جائیے۔ یا یہ کہ ہاتھ وقت ان کے کپڑے
خسٹانے میں تیار ہو رہا ہے۔ اور انہیں کے سب بڑے صبح سالم ہوں۔ یا ان کے جوتے ہر جسم پر لٹ کئے ہوئے ہیں۔ تو یہ عین فطری بات تھی۔
وہ ان چیزوں کی طوری نہیں تھی۔ لہذا میں صاحب کو تقریباً ہر صبح تھے کی فرمائش کرنی پڑتی۔ اور جو توڑ کی پالش کے لئے یاد دہانی کرنی پڑتی۔ اور وہ
اس وہ درجہ کی تاکید اور یاد دہانی سے چڑھتے تھے۔ ایک لام چورہ نہ کہہ کر کے لا۔ اس کے لئے ہر روز کپڑے کی ضرورت کہوں پیش آئے۔ اس سلسلے
میں وہ بھی بہ طور سے۔ کیرٹہ وہ گزشتہ میں سال سے ان چیزوں کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کی پہلی بوی کے زمانے میں یہ سب لام خود بخود اور
سکاٹلی انگلی میں منبر کے لئے ہو جایا کرتے تھے۔ اس لئے اب جب کبھی اپنے بڑے میں سے خود ہی قمیص ڈھونڈ کر نکالنے اور پہننے کے
بعد وہ اس کا کوئی ٹیٹو یا پاتے تو اندر ہی اندر پی و تاب کیا کر دے جاتے۔ اسی طرح قمیص پہنے کچھ ہی پہلے جاتے۔ ان کا دل بھر سا گیا تھا۔
مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو گیا تھا جسے وہ کم گوئی کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کرتے۔ مگر کی نفاس انہیں اجنبی اجنبی سے معلوم ہونے لگی تھی۔ دیکھ میں
داخل ہوتے۔ تو اس عجیبی عجیبی کرتے ہوئے احساس اور بیان بادل کو دیکھ کر ان کے دل میں ایک تھک سی اچھی اور پائے دلوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اپنی
عقلی احساسات بھی شدید ہو جاتا اور وہ اس تکلیف و احساس کو ذائل کرنے اور ان تلخ یادوں کو بھلانے کی خاطر اپنے راست احباب کی محل میں
پہنچے ڈھونڈتے تھے۔

لیکن آج وہ گھر پر ہی رہتے تھے۔ آج اس گھر کی سولی سولی سرور نفاس زندگی کی کچی سی لہر دم ڈالنی تھی۔ پڑنے دلوں کی خفیت سی جھلک
تھی۔ تو بیٹے کی آمد، اس کا لب و لہجہ، اس کے چہرے کے خندہ خال انہیں بار بار اپنی مرحومہ بوی کی یاد دلا رہے تھے۔ لیکن اس یاد میں نشتر
کے کچھ کے نہیں تھے۔ بلکہ مرحوم کی آسودگی اور ٹھنڈک تھی۔ آج انہیں باتیں کرنے کے لئے کوئی مل گیا تھا جس سے وہ اپنا دکھ سکھ کر سکتے تھے۔
جہان کی باتوں کو سمجھ سکتا تھا۔ اماں کے احساسات و جذبات کی تدبیر چاہتا تھا۔ جس کے ساتھ وہ ایک قسم کی ذہنی اور روحانی یکاگت، بعد ازاں
آپنی محسوس کر سکتے تھے۔ ان کے درمیان ایک مشترکہ ماضی تھا۔ ایک ماحول تھا۔ کچھ باتیں تھیں۔ چند واقعات تھے۔ یادوں کا ایک ذخیرہ تھا جس
میں وہ ہر ایک کے ساتھ جھلک رہے تھے۔ اور ان چیزوں میں وہ عورتیں شریک نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ قربت و رفاقت کے اس طعنائی اور سے
خارج تھیں۔ باپ اور بیٹا باتوں میں اس قدر محو تھے۔ کہ ان عورتوں کی موجودگی کو بالکل بھول گئے۔ وہ نہیں انہیں اور اس اور اس اور اس کے آنکھوں سے
تھوڑے سے غور سے۔ ہفتے کے بعد ان کی طرف دیکھ لیں اور پھر آپس میں کوئی بات کہنے کی عکاس کو شمل کرتیں۔ انہیں اپنی حلیہ کی احساس بڑی طرح
سے پیدا تھا۔ جیسے ایک دوبارہ ان کی باتوں میں دخل اندازی کرنے کی کوشش کی بھی تو وہ اُسے یوں نظر انداز کر گئے۔ جیسے بزرگوں کی باتوں میں
ایک کلمہ کو بھی دل نہیں ملتا۔ بہت سے احساسات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ اپنے میاں سے جل رہی تھی۔ کیونکہ رطبت کی تمام

تو جو اپنے باپ پر مرکوز تھی، باپ کی وجہ سے وہ انہیں بالکل نظر انداز کئے بیٹھا تھا۔ یہ کیوں؟ آؤ میں بھی اتنی ہی ذمہ کے قابل... میرا اس کی دل نہ ہی اس کے باپ کی بیوی تو ہوں۔ میں کوئی اس کی دشمن نہیں ہوں۔ میں اس سے کچھ نہیں مانگتی۔ کچھ نہیں چاہتی۔ صرف اتنا چاہتی ہوں کہ ہم سے بھی کچھ باتیں کر سکے۔ ہم سے بھی ہنسنے بولنے بھی تاواناں ہیں۔ اسی گھر میں رہتے ہیں۔ اگر ہم سے مل کر آیا ہے تو... تو آیا تھا، کھانا تو بہ دوں تو دم آگیا ہے یا نہیں؟ — اور تو یا مدد پھر سنبھالتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

نہیں بیٹھی! آؤ گوند رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر اٹھا کر چھوٹی بی بی کے منہ پر چھری کی طوط دیکھا۔ اس نے ان کو اس کا اس سکین سی آنکھوں میں جن میں ہر وقت ایسی سی تیرتی رہتی تھی۔ جانے کیا دیکھا کر سر جھکا کر آپ ہی آپ دھیرے دھیرے مڑا کر لے گئی۔ تو یا پاؤں لاسنا کر رہی تھی۔ — آج میاں صاحب بڑے خوش خوش نظر آئے ہیں؟ تو بی بی نے کہا — ہوں تو یا نہ ہی میں نہیں جانتی۔ — چھوٹے میاں کے دن ہیں گئے؟ — نہ نہیں؟ — کتنی راحت پڑھتے ہیں؟ — مجھے کیا معلوم؟ وہ ترش روئی سے بول — اُن کی طبیعت بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ — ہوں وہ سننا — ذہنی کچھ اور خاموش کیلئے لے میں اُنکیاں ملتی ہیں — چھوٹی بی بی؟ — کیا ہے؟ — اور تو یا کی قوری پر بل دیکھ کر ذہنی کا من کھٹکے کھٹکے بند ہو گیا۔ تو یا نے کچھ دیر انتظار کیا۔ جلدی جلدی آؤ گوند کے روٹی پکانی شروع کر۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اور باہر چلی گئی۔ نہی نے آؤ گوند صاحبہ جو بے پروا کر کہ روٹیاں پکانے بیٹھ گئی۔ پسینے کی گھریں اس کے الجھے ہوئے خشک بالوں میں۔ سے نکل نکل کر، اس کی کنپٹیوں پر سے ہوتی، پچکے ہوئے گالوں پر سے بہتی ہوئی اس کے گریبان میں جذب ہو رہی تھیں۔ — کتنا باتھا اور سبیلہ جوان ہے! اس نے اپنی ہاک پر سے پسینے کا قطرہ جھٹکے ہوئے سوچا۔ مزہ اپنی من پر گیا ہو گا۔ — میاں صاحب وقت خوش شکل نہیں۔ ان کے فٹس تو بہت جلد سے اور مسے ہوئے ہیں۔ صبح جب ہوا دھوڑا سا رنگ کی قیسی اور نیلی تون میں باہر نکلا تھا۔ تو اندر میں کھا جا رہا تھا۔ بھی تو چھوٹی بی بی بھی صبح سے گھرائی گھرائی، شراتی شراتی سی پھر رہی ہے۔ چلو گھر میں کچھ دن تو ہوئی۔ اچھی بھل مورت دیکھنے کو آئیں تو کئی تھیں۔ چھوٹی بی بی سے اگر... اور اُسے اپنا حال یاد آگیا۔ جیسے مرنے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ سوائے شراب پینے اور بوائے کیلئے کے اس میں اور کوئی چیز نہیں تھا۔ ٹھوڑوں پر پڑا تھا۔ لیکن مزاج شاہوں کا سا تھا۔ دل کا اچھا تھا۔ دل بات بڑا کا اس میں دنیا کا ہر ٹکڑا ہر غم اور ہر مصیبت یوں سا جاتی۔ جیسے سمندر میں پانی کا قطرہ۔ اس سے بڑا اچھا سوک تھا۔ ایک رات اتنی چڑھا گیا۔ کہ برداشت نہ کر سکا۔ اگلے دن مر گیا۔ وہ تب سے بڑھتی۔ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا لگاؤ سننے کی کوشش کی۔ لیکن وہ مرنے لگی۔ گولہ مونی مزہ ہو گئی۔ سب بھی کئی کئی راتوں کی تاریکی میں وہ اپنی شکستہ چادر پائی پر بیٹے بیٹے کھانے لگتی۔ ایک ایک میں آگ سی سلگ اٹھتی۔ اور وہ اپنے بیٹے جو نے ہم کو کھر دی چادر پائی سے رگڑ رگڑ کر کچھ تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔ مگر آگ اور بھی سلگ اٹھتی۔ فٹل اور بھی بڑھ جاتی۔ اس گھر میں آنے کے بعد مرد تو یا اس کے لئے حنا پڑ گیا تھا۔ سے سے کے ایک میاں صاحب تھے۔ اور ایک لڑکے سے بھی بوڑھا ملازم جو باہر کے کام لاج پر آتا تھا۔ ان دو کے علاوہ کسی دوسرے کی شکل دیکھنی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ چھوٹے میاں کی آمد نے اس کے حوصلے سے سوئے ہوئے دھجک آؤداسا سات اور خرابا سات میں بھی حرکت پیدا کر دی تھی۔ بروہم اور ہم اسیدہ نے دے پاؤں آکر اس کے دل میں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ — چلو اور نہیں تو کچھ دن شغل ہی ہے گا۔ چند دن کی دل ملی ہی ہے! — اس کے چٹے چٹے سیاہی مائل نیلے ہونٹوں پر خفیت سی سکڑا ہٹ چیل گئی۔

انہوں نے کھانا ختم کیا۔ میاں صاحب آرام کر سی پونم ملاز ہو کر سہ گڑ گڑانے لگے۔ باقی رگ سونے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اقبال کبھی

نکالنے ہی والا تھا۔ کہ ذیسی، دوڑی دوڑی آئی: "کیسے چھوٹے میاں آپ کا بستر باہر نکال دیں۔ آپ رہنے دیجئے: اس نے اس کا بستر
بغل میں دھایا اور دوسکر ہاتھ سے چار پانی اٹھا کر باسوٹے گئی۔ بستر بچھانے کے بعد وہ پھر اندرائی: "ام کوئی چیز تو نہیں جا رہے؟"
"نہیں!" — "پانی وغیرہ . . . ؟" — "مہاں۔ ہاں پانی کا گلاس لے دو۔" — وہ چلی گئی۔ اور کچھ دیر کے بعد گلاس اور مراچی
لے ہوئے لوٹی: "بیجئے میں مراچی بھی لے آئی ہوں۔ شاید رات پانی کی ضرورت پڑے:" اس نے پانی پایا۔ وہ ابھی تک کھڑی تھی۔ غصہ خیز منظر
"ام کوئی خدمت ہے؟" — "مجھے جانے کب تیار ہوتی ہے؟" اس نے پوچھا — "چرخیکہ" — وہ مطمئن ہو گیا — "بس اب
جاؤ: اور وہ چلی گئی۔ وہ جتنی بھیجا کر اپنے بستر پر آیا۔

"اقبال میاں!۔ اس نے آنکھیں کھولیں، سلیم سامنے کھڑی تھی۔ اٹھو چائے پیار ہے: وہ اٹھا اور منہ ہاتھ دھوئے بغیر جلنے کی ریزر جا بیٹھا۔ کیوں میل منہ ہاتھ نہیں دھو گئے؟"۔ چائے کی ایک پیالی پیلوں تو پھر..... "وہ تجھینے پہنچے بولا۔ اس کا باپ ٹنگ پر تنگی سے جنگ لگائے سنہ میں ختم کی نڈ دا بے بیٹھا تھا۔ کیوں اقبال سنا ہے کہ تم نے انہیں رات بیت گھایا، بجا دیوں کو تھکا دیا؟"۔ نہیں زیادہ تو نہیں۔ یہی وہ تین میل کا چکر ہو گا: وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "اسے باپ نے ان کے لئے تو ایک میل بھی بیت ہے۔ ڈیا ٹیک ہی تو کہتی ہے کہ اس کی مانگوں میں کھلیاں پڑ گئی ہیں۔ انہیں چلنے کی عادت تو ہے ہی نہیں؟"

— عادت کیسے ہو؟ سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کے لیے میں تلخی تھی۔ کبھی گھر سے قدم باہر نکالا ہوتا... ..

میاں صاحب نے فوراً منہ پھیرا۔ اور کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے راجے میں پڑ گئے، اس نے ارد گرد دیکھا، اُسے ڈیا نظر آئی: ڈیا کہاں ہے؟ اس نے پوچھا: بنا رہی ہے۔ ناشتے کے دولہان میں اس نے ڈیا سے مذاق میں پوچھا: سنا ہے تم نے میری مشابہت کی ہے۔ کہیں نے کل نہیں بیت تھا، یا؟"۔ اس نے اپنی گھبراہٹی بولی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف بڑسی عاجزی سے دیکھا۔ اور شرماتے ہوئے بولی: نہیں میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ میل صاحب نے اپنے پاس سے نگاہ یا جوگا۔ "کیوں بیت تھک گئی تھیں؟"۔ نہیں تو اتنی زیادہ بھی نہیں۔ آج وہ ناشتے سے پہلے ہی حاد صوبہ بن سکند کو ابھی تھی۔ اس نے سرری طرز اس کا جائزہ لیا۔ قلمی کی بونی و پار کا سا سفید صاف ستھرا، سیدھا سا حالہ دراز چہرہ جس میں دو خداؤں کی سی، بڑی بڑی آنکھیں جو ڈیا کی آنکھوں کی طرح اقدار دار گہرائی سے یکسر ماری تھیں۔ چنتائی کی عورتوں کی سی سستیلی تاک جو پیشانی کے بالائی حصے سے شروع ہو تی ہوئی سستلی ہو تی تھی۔ بے کیف اسے رس جونٹ جن میں گلے کی نیلا بیٹ کا ہو تو تھا۔ اور بے جان سی گول ٹھوری۔ چہرے میں کسی قسم کی کشش یا جاذبیت نہیں تھی۔ مگر لمبے چہرے پر جمے ہوئے وہ سب کچھ بدرجہ اتم موجود تھا جس کی بدولت وہ جولن نظرائی تھی۔ اس کے مقابلے میں اس کی بڑی بین کے چہرے میں تھوڑی بہت کشش تھی۔ اس کا ناتھا چھوٹی بین کی طرح گھٹا ہوا نہیں تھا۔ اس کے ہونٹ لبرال بھرے بھرے تھے۔ اور ان میں تھوڑی بہت سُرخ فحش جھلکتی تھی۔ اس کا جسم بھی گردن اور سٹول تھا۔

ناٹتے کے بعد یہاں صاحب اپنے کام پر چل دیئے۔۔۔۔۔ آج ہانی نہیں دیں گے؛ "ثریا شرمہ" ماتے جسے بول ہاس کی بہن نے پونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اقبال کو بھی اس کی اس جرأت امدیہ کی پڑی میرت ہوئی۔ "مگر ساتھ ہی اُسے ایک بہم کا طینان امد مسرت کا احساس بھی ہوا۔ اب راہِ راست پر آرہی ہے! اس نے اُٹھتے ہوئے سوچا۔۔۔۔۔ چلو چلیں: وہ بولا۔۔۔۔۔ پہلے میں بھی تہا راتھ بٹاتی ہوں۔ بڑی بہن بول اٹھی۔ ان تینوں ایک ایک بالٹھ بھری امد باہر مین میں سے گئے۔ امد پودوں کو کھانی

ہیں گے۔

اس کے بعد دن میں دو بار پردوں کو پانی دینا ان کا روز کا معمول ہو گیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد اور شام کی چائے کے بعد تین چار روز میں ہی خشک پردوں میں جان پڑ گئی۔ تھوڑا رنگ نکھر آیا اور نئی کوئپلر بھی بن گئیں۔ نہ صرف خشک پردوں ہی میں زندگی پیدا ہو گئی۔ بلکہ اس اور اس حد پرانے مکان کے مددگار اور اس کے نیم مردہ، دیے جان ٹکینوں میں بھی زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی جن آنکھوں میں پہلے اُداسی اور اندر دلی کی دھند بھائی رہتی تھی۔ اور مبہم انتظار کے دیئے بھلا لیا کرتے تھے۔ ان میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ تیرہوں پہ نکھار تھا۔ شکستہ تھی۔ ہونٹ ہر وقت مسکرائے کا بیاض ڈھونڈ جیتے تھے۔ ان عورتوں کی زندگی کے بندھن کی ساکن سطح پر ایک ہل سی بچ سی تھی۔ پہلے وہ اپنے آپ ہی میں گھومتی رہتی تھیں۔ اب ان کے خیالات اور ان کی توجہ کو ایک مرکز پر مرکوز کیا گیا تھا۔ اب وہ اس کی خاطر تواضع اس کے آرام و سائش اور دلچسپی کے لئے کوشاں رہتیں۔ انہیں ہر وقت یہ خدشہ لگا۔ مانتھا کہ کہیں واکٹ کر بھاگ جائے۔ تینوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس کی خاطر تواضع کرنے کی کوشش کرتیں۔ اور اس حد و جد اور بھاگ دوڑیں وہ اٹھانے میں ایک دوسرے سے جڑ جاتیں۔ ایک دوسرے کی لاد میں حامل ہو جاتیں۔ اندھوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں۔ ہر ایک یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کے دل کا بھید دوسروں سے مخفی ہے۔ اور وہ وہ دن کے بید سے واقف ہے۔ لیکن حقیقت میں سب کے دل کا بھید ایک ہی تھا اور سب ایک دوسرے کے دل میں اچھپے ہوئے چھپ کر جانتے ہوئے بھی اچھا بننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے درمیان روتہ روتہ ایک گمنام حادثہ پیدا ہو رہی تھی۔ ایک خاموش متبادل تھا۔ ایک دھڑکتی۔ ایک وہ سرے سے باندی سے جانے کی کوشش تھی۔ ان کے دلوں میں رقابت اور جین نی آگ دھیرے دھیرے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ جو بسنی اور کات بھرک کر شعلہ بن جاتی اور جس کی روشنی وہ دھند تک نظر آنے لگتی۔ تین متناہیں ایک دوسرے کے ٹکڑے کو اپنی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن ہنک اگیز بات تو یہ تھی۔ کہ وہ لوہے کا ٹوکڑا اس سرخ شمشاد سے بالکل بے خبر تھا اس پہ اس کو نہایتانی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اسے اس خاموش جذبہ جہد کا احساس ہی نہ تھا۔ جو ان تین عورتوں کے درمیان جاری تھی۔

اور یہ جیدہ جند اس کے پہنچنے کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی۔ تیسری صبح جب اس نے آنکھ کھول تو سلیم چائے کی پیالی لے کھڑی تھی۔
 "میں نے سوچا شاید تمہیں بستر میں چائے پینے کی عادت ہو اس لئے پیالی نہیں لے آئی۔ تمہارے باپ تو پہلی پیالی سب سے ہی میں پیتے ہیں۔۔۔"
 "آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ اس نے جھپٹے ہوئے کہا۔ اور شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پیالی لے لی۔ مگر اگلے دن جب سلیم
 کھانے بنانے کی طرف سے میز پر پہنچی تو اس نے اپنی چھوٹی بہن کو چائے کی پیالی پیلوہ اسے برآمدے کی طرف بجا۔۔۔ ہوئے دیکھا اس نے
 اپنی مایوسی کو سکراہٹ کے پردے میں چھپالیا۔ کوئی بات نہیں۔ اچھا ہے۔ آؤ اس میں ہر ج ہی کیا۔ ہے اس نے اپنے اندہ چھپتی ہوئی تمنی کو غور سے
 کرتے ہوئے سوچا اچھا ہے۔ خود ہی اس سے قہقہہ مل جائے۔ شام وہ پانی، صبح کی رطوبتوں کو پسند نہ کرے۔ کوئی بُری بات تو ہے نہیں ملے
 چلنے کی تھوڑی دیرت آبادی اب بھی چاہئے۔ اور پھر اپنا آدمی ہے۔ کوئی غیر تھوڑی ہے۔ لیکن تمنی بھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ثریا چائے دیکر باپ
 آئی۔ اس کے چہرے پر شگوفے کھل رہے تھے۔۔۔ کیوں چائے دے آئی ہو؟ اس نے چہرے پر مصدقہ سکراہٹ ادا کرتے ہوئے
 پوچھا۔ لیکن جلد ہی وہ سکراہٹ کافور ہو گئی۔۔۔ "ہاں، تمہاری نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ سلیم نے اپنے آپ کے کنگھی کئے ہوئے باؤں کو دیکھا
 اس کے اچھے اچھے کپڑوں اور گھرے ہوئے تروتازہ چہرے کو دیکھا۔ اور آئے اپنے گھر سے ہونے باؤں اور ملے دے کہڑا کھانا
 آؤ۔ تمنی اور بھی بڑھ گئی۔

وہ اس روزانہ رات کو گھوڑے باہر جایا کرتے تھے۔ اقبال کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ گھم کے روینے میں کسی قسم کا تسخیر یا
و کھاوا نہیں تھا۔ اس کی دلچسپی اور مہمندی میں خلوص تھا۔ بچائی تھی۔ وہ اُسے اجنبی نہیں سمجھتی تھی۔ اور اس کے سلوک میں سویتے پن کا ثابہ
نہ تھا۔ وہ اُسے اپنا سمجھتی تھی۔ اپنے عزیز و دور سے۔ اور اگر وہ واقعی اس کے قریب آنے کی آمینوں نہ تھی۔ تو اُسے اس میں کیا
اور امن یا پیکھا ہٹ ہو سکتی تھی؟ وہ خوش تھا۔ انروزہ اس کے باپ کی بوجی تھی۔ اور اُس نے اس کی امانت پر حاصل تھا۔ اس کی قدر و عزت
اس پر لازم تھی۔ وہ اس کے پیارا در محبت کی قطعاً مستدار نہیں تھی۔ اور یہی وہ اس سے کسی قسم کی مہمندی اور شفقت کی توقع کر سکتا تھا۔ لیکن اگر
اس کے بعد جد بھی وہ اپنی خوشی اور آزادی سے بن مانگے بن کہے، اپنا بے لگ پیارا اور شفقت سے دینے پر مائل نہ ہو۔ تو وہ بھی خود سے
اس محبت اور شفقت کا جواب دے کر اپنی دست قلمی کا ثبوت دینا چاہتا تھا۔ اسی لئے جب عجم نے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا تو وہ وہ

[illegible]

مگر اس کے قدم نہ ڈلگائے۔ اسی دن کچھ دیر کے بعد جب وہ میاں صاحب اور وہوؤں بیٹوں کے بستر اندر لگا چکی۔ تو اس نے جلدی سے اقبال کا بستر بھی اٹھا کر اندر لگا دیا۔ وہ مکرے کی دوسری چیزوں کو ترتیب دے رہی تھی کہ چھوٹی بی بی آدھکی۔ تارسی توپیاں کیا کر رہی ہے! اس نے جلتے بجتے لمبے میں پوچھا: "اُدھرنا شے کو دیر ہو رہی ہے۔ اور توپیاں اپنی صفائیوں میں مٹی ہوئی ہے۔ چل بھاگ یہاں سے اگر ان کی کوئی چیز ادھر ادھر ہو گئی تو؟ اگر تو نے آئندہ اس کمرے میں پاؤں رکھا۔ تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گی: "ذہنی سبھی ہوئی چپ چاپ باہر نکل گئی۔ لیکن اس کے اندر ایک آگ سلگ اٹھی تھی۔ اُسے پہلی بار اپنی توہین کا احساس ہوا تھا۔ اور اس کے دل میں انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد قریباً نے کمرے پر ایک نظر ڈالی۔ اُسے اور تو کچھ نہ سوجھا بستر کی چادر ہا جو ابھی تین چار دن ہوئے بچھائی تھی۔ سمیٹ کر اندر لے گئی۔ اور منہ دق میں سے سفید دھلی ہوئی چادر نکال کر اس کی جگہ بچھا دی اور باہر آ کر خاموش بیٹھ گئی۔ اس کی بہن نے اُسے

چاند سے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ اس کے بچکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ نہ جی جی میں ہنس رہی تھی۔ بچہ : سیاں مٹا اندر کرے میں سے چلائے : ذرا گرم پانی تو لانا۔۔۔ وہ کھامت بنانے لگے تھے۔ حالانکہ انہیں وہ گرم پانی کی ضرورت پڑتی تھی لیکن وہ وہ نہ بھول جاتی تھی۔ اور سیاں صاحب کو وہ نہ پانی ہاتھ پڑا تھا۔ وہ پانی میں پانی سے کہہ رہی تھی۔ سیاں صاحب کھامت بنانے لگے تھے۔ اُسے کچھ خیال آیا۔ اس نے اپنا منہ قکھڑا کر اس میں سے نیلے رنگ کی سلک کی چادر۔ نیلے نیلے کے غلات اور میز پرش نکالے۔ وہ سیٹ اُسے میز پر ملا تھا۔ نیلے رنگ کی سلک کی چادر اور اس کے ساتھ غلات اور میز پرش۔ اور یہ سیٹ ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ وہ ان چیزوں کو اتنا کاندھ ہی اندر کر دیں سے اتنی کرے میں سے لگی۔ اس نے بستر پر بھی ہوئی سفید چادر کو اٹھا کر اس کی جگہ نئی چادر بچائی۔ اور بچوں کے غلات اور میز پرش تبدیل کئے۔ اتنے میں اقبال بھی ہنسا کر آیا۔ اس نے اپنے کمرے کا رنگ ہی بدلا دیا۔ خوب ٹھانڈا تھا۔ اس نے سنا ہے کہ بچہ : سیٹ تو بہت خوبصورت ہے :۔۔۔ سلک کی چادر۔ کوا تھ میں سے کہہ دیتے ہوئے بچہ :۔۔۔ نہیں چاہیئے۔۔۔ نہیں۔ نہیں میں تو صرف اس کی تعریف کو رہا تھا۔۔۔ کوئی بات نہیں چلوں اُسے بری طرف سے تھک سچ ہو۔ بالکل نیا ہے۔ پہلی بار بار نکالا ہے :۔۔۔ نہیں نہیں۔ آپ تو دنیا دہی کر رہی ہیں۔ میں کوئی اجنبی عقود اوروں کو آپ مجھے۔۔۔ :۔۔۔ تو کیا اجنبیوں کو سمجھنے۔ بچے جاتے ہیں : بچہ نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا : سمجھنا تو انہوں ہی کو دینے جاتے ہیں : اور وہ مہینہ کے گراں بار ہو جھٹے وہ کر رہ گیا۔ بہت ہیٹ شکریہ۔۔۔ اس کے جی میں آئی کہ اُسے اتنی کہے۔ لیکن یہ لفظ اُسے بہت نا مناسب اور مضحکہ انگیز معلوم ہوا۔ اور ساتھ ہی یہ خیال بھی ٹوڑا کہ کہیں وہ اُسے ذاتی کچھ کر برا نہ مان جائے۔ وہ چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد واپس آئے اُسے اُسے نے بچہ : آئی : اُسے بچہ نے عاس دھو پھینکا تھا : اس نے بستر کی نئی چادر، نئے غلات اور میز پرش کو دیکھا اور جل کر راکھ ہو گئی۔ اس کے ہونٹ جھٹکے اور اس کی آنکھوں سے شے پکھنے لگے۔ دیکھو ڈیڑھا تہا ری آپا نے مجھے تھکا دیا ہے : اقبال نے مسکراتے ہوئے اُسے بتایا۔ اس کی بات نے اُن پر قیل کے پھینٹوں کا کام کیا۔ اس کے رنگ دہے میں ایب گیلیٹی ہوئی تھی سراسر گیلیٹی۔ اور وہ دانت کچکچاتی ہوئی واپس آگئی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ اس کمرے کو اس گھر کو آگ لگا دے۔ اور کینوں کو اس آگ میں جل بھن کر کباب ہوتے ہوئے دیکھتی رہے اس نے اپنی بہن پامکیرا کو دنگر ڈالی اور منہ پھیر کر میڈ گئی۔

دوسرے دن شدید گرمی پڑی۔ جن ہی سے تو چھٹے لگ گئی۔ اور وہ پیر تک تو یہ عالم ہو گیا۔ کہ جیسے کسی بھٹی کا منہ کھل گیا ہو۔ اور ہوا اس جہنم میں سے گزر کر آ رہی ہو۔ بند کمرے میں بوت کی سلوں پر سے گزرتی ہوئی بچھٹکی ہو ابھی کچھ کم گرم نہیں تھی۔ ہاں جسم کو بھیس دینے والی تو اسے جھکڑ چل رہے تھے۔ اس دن سیاں صاحب جی جلد ہی کچھری سے لوٹ آئے تھے۔ وہ سب دن بھر کمرے میں بند رہے۔ جب دن ڈھلا تو وہ بالکل بند ہو گئی۔ اس قدر جس کے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔ لوگ بے بسی سے کبھی تو دھندلے دھندلے اُترے گئے آسمان کی طرف دیکھتے تو کبھی ساکت رہے بس وہ خنوں کی جھکی ہوئی بے جان شاخوں کی طرف۔ شام کے قریب مغرب میں گر وہ غبار کا ایک ستون سا بند ہوا۔ وہ ستون دیکھتے ہی دیکھتے آندھی بن گیا۔ اور اس قدر دھکی سیاتھی آئی۔ کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں دیتا تھا۔ پیر پڑوں سے اکر ڈھکے۔ بجلی کے کھمبے گر گئے۔ تار ڈٹ گئے۔ اور مکافوں کی پھتیس اڑ گئیں۔ آندھی کے دوران میں جب بجلی بند ہو گئی۔ تو انہیں لائٹن جلد نے کا خیال آیا۔ لیکن اس اندھیرے میں لائٹن دھونڈھنا بھی کارورہ تھا۔ لائٹن کہیں کسی کمرے میں پڑی تھی۔ اندھیرے میں کوئی اس سے ٹکرا گیا : دیکھ کر بھئی : اس نے کسی کو سمجھا سکتے ہوئے کہا : اس اندھیرے میں تو کچھ سمجھائی ہی نہیں دیتا : بچہ نے اس کے بازو کا ہاتھ

لیتے ہوئے کہا اور تاریکی میں کھو گئی۔ کچھ وقفے کے بعد کوئی اس سے آکر چٹ گیا۔ "کون ہے بھی؟" اس نے ہنسنے ہوئے پوچھا۔
 وہ ہاتھ اس کے چہرے کو ٹھونڈ رہے تھے۔ اس نے ہاتھوں کی انگلی میں لاکٹ لیا۔ اور "تو کیا؟" اونٹنی "کہہ کر دو رہٹ گئی۔" بیگم بڑی مشکل سے
 لائین ڈھونڈ کر دہرائیں۔ زہی باورچی خانے میں باپس کے بٹے ٹانگ وٹے مار رہی تھی۔ "یہ رہی ماچھن؟" وہ ماچھن سے کوئی۔
 "کہاں؟" اس نے اور صبر سے میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ لیکنے؟" زہنی نے اس کے ہاتھ کو دو دوں ہاتھوں میں قلم کر کہا۔ اور
 ماچھن اس کے ہاتھ میں صفا دی۔ اس نے بتی بجائی۔ کچھ دیر کے بعد جب آسمان صاف ہوا تو موسمِ صاف بارش شروع ہو گئی۔ وہ صبح سویرے میں نیچے
 بارش کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ذرا محسوس میں کھڑی ہمارہی تھی۔ آئیے دیکھیں جی آپ بھی بنائیے: اس نے پرناے کے نیچے کھڑے ہوتے ہوئے
 کہا۔ "دو دوں عورتیں بچپاں ہیں۔" "جاؤ بھی جاؤ نہاؤ" "میاں صاحب بوئے؟" "نہاؤ کی گڑ گڑ نکل جائے گی۔" "ہلو تم بھی بیگم نے آئے
 ہوئے اقبال سے کہا۔" "چھنے۔" اور وہ تینوں بارش میں ہلنے لگے۔ "تو کیا؟" نظر دو پو دوں پر جا پڑی۔ ایک میں گلاب کے دو پھول کھلنے
 والے تھے۔ اور وہ سر میں ہونے کی لہلیاں۔ وہ خاموش رہی۔ اور حبیب باقی لوگ ان پو دوں کے قریب پہنچے تو وہ بڑے معجزانہ انداز میں پو دوں
 کے سامنے اس طرح سے کھڑی ہو گئی کہ وہ اس کے پیچھے چھپ گئے۔

اگلی صبح موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہر چیز دھل دھلائی، نکری نکری، تود تود، نظر آ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔ اور آسمان پر
اُدے بادلوں نے سرست قافے آوارگی کر دی تھے۔ بڑا سب سے پہلے اُٹھی۔ اور ہاتھ منہ دھوئے بغیر اس نے کیا رپوں بھر دیا۔
عجب وہ ان پودوں کے پاس پہنچی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں نہ تو گلاب کے پھول تھے۔ نہ بوتیے کی لکڑیاں! وہ سرست
پاؤں تک سر ہلا کر بن گئی اس کی آنکھوں میں کوند سے پلنے لگے۔ اس نے ننھے پھڑپھڑا رہے تھے۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ سیدھی اپنا
ہنر کے کمرے کی طرف گئی۔ آج وہ ہاتھ پاؤں نہ پر بھی تیار تھی۔ اس نے ہنر کے کمرے میں بھانٹا میاں پوری مزے سے سو رہے تھے
اس کا پارہ دفعتاً کئی ڈگری چڑھ گیا۔ اچھا تو پھر یہ اس چوہیل کا کام ہو گا۔ جو امرا دی کہیں کی!۔ وہ باورچی خانے کی طرف جانے سے پہلے
وہ پاؤں اقبال کے کمرے کی طرف گئی۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کے سر ہانے پر چائے کی پیالی کے ساتھ، گلاب کے پھول اور چند تو
کی لکڑیاں پڑی تھیں۔ وہ دانت کچکچاتی، ہونٹ کاٹتی، مسٹیاں بھیجتی، اپنی آئی۔ آج تو اس بدبخت کو کچا ہی چبا جاوے گی۔ وہ سیدھی باورچی خانے
میں پہنچی، ذہنی وہاں سے پھول کس نے توڑے؟۔۔۔۔۔ میں نے۔ کیوں؟۔۔۔۔۔ کیوں کی بھی؟ اس نے تراش سے ایک ٹاپچا
کے گال پر سید کیا؟ آگے سے بحث کرتی ہے۔ چڑیل؟۔۔۔۔۔ ذہنی کال سہلاتے ہوئے سبھی ہوئی نظروں سے اُٹے دیکھنے لگی۔
"اب یہ میں نے پھول توڑ لیا تو کون سا گنہ کیا؟"۔۔۔۔۔ زبان بند کر، امرا دی! پھناں کہیں کی۔ بڑی آئی پھول توڑنے والی۔ ذرا صورت
تو دیکھ اُٹنے میں۔ بھتی کی بھی!۔۔۔۔۔ بی بی جی میں نے۔۔۔۔۔ بکواس بند کر! اس نے ایک اور ٹاپچہ۔۔۔۔۔
کوتہ پرے کہا: "وہ چٹیا سے پکڑا ہر پھینک دوں گی۔"۔۔۔۔۔ اور میں نے تجھے سنا کیا تھا کہ تو آئندہ چائے کے کمرے میں جانا۔ وہ
تو پھر۔۔۔۔۔؟ اور اس نے اسے پاؤں سے ٹھوکر لگا کر، ذہنی گھٹنوں میں سر دیے کہ سسکیاں بھرنے لگی۔۔۔۔۔ اب گئی ہے۔
ٹوے بہانے ملتا! اس نے ستھارت سے کہا۔ "کیا ہوا ثریا!؟"۔۔۔۔۔ "یہ تو تو میں کی آمد سن کر جلدی سے اُٹ۔"۔۔۔۔۔ کچھ خیر
جی: اس نے ہلکے آمیزے رخ سے کہا: "جانے کبھت کو کیا ہو گیا ہے۔ آگے سے جواب دیتی ہے؟" اور وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔
نے اپنی ہنر کے گھر سے ہونے تو وہ دیکھ کر خائیش رہنا دیا وہ مناسب سمجھا۔ وہ وہاں کی موجودگی میں گھر میں کسی قسم کا جھگڑا فساد نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ

”ثریا“ اللہ سے رگم کی آواز آئی۔
 ”کچھ نہیں۔ اس نے توشہ دہانے سے جواب دیا۔ آج آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟ اقبال نے پوچھا۔
 ”ہاں۔ آج قزاق اتنی پیادہ ہے کہ سونے کو ہی نہیں چاہتا۔ وہ مکرانے ہوئے بولی۔ ثریا نے اس کی طرف نہر بھری نظروں سے دیکھا۔ جیسے اس نے اس کے منہ کی بات چھین لی ہو۔۔۔۔۔ تو چھپے ڈاکو کم آئیں؟۔۔۔۔۔ چلو لیکن کچھ پروگی۔۔۔۔۔ نہیں اب تک پانی خشک ہو گیا ہو گا۔ مارچ سے چلیں گے ساتھ ساتھ وہ زینہ کو ساتھ لے کر باہر نکل گئے۔

میاں صاحب نے انہیں باہر مارتے ہوئے دیکھا۔ وہ باہر چاندنی میں انگلیں روندے اپنے بستر پر بیٹے دن کی آفریقہ خیم خیم کو رہے۔
 تھے بکھرے کھلے خارجی طاری تھی۔ گل شبوبہ کی بھینی بھینی خوشبو میں بسے ہوئے ہولے جھونکوں سے قریب ہی چیل کے پتے تالیاں بجانے لگ جاتے۔ اور دوسرے درخت سرسبزوں میں معروف ہو جاتے۔ میاں صاحب کے ذہن میں پانی یا وہں کا ایک سیلاب اٹھٹھا اداہنی موجود تھا۔ اور سچائی سے احساس سے ان کی انگلیں پر ہم ہو گئیں۔ صحن کی چادر دیواری کے باہر منڈکوں نے اپنا کورس شروع کیا۔ وہ لوگ اس وقت مزے سے ہنستے بولتے چلے چارے ہوں گے۔ میاں صاحب نے چاندنی میں چیل کے جگمگاتے ہوئے چوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ انہیں مبرا خیال ہی نہیں آتا تو گا۔ وہ سب جوان ہیں، ہمعصر ہیں۔ ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے درمیان آہنگ اور بے پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن میں۔۔۔۔۔ میرا ان سے کیا تعلق!۔۔۔۔۔ وہ میری تنہائی کو کیا جانیں۔ میری مزدبیت کو کیا سمجھیں۔ میں تو بوڑھا ہوں۔ جوانی کے حلقے سے خارج ان کی دنیا سے باہر میں ان کے درمیان اتنی ہی مضحکہ انگیز ہوگی جتنی کہ بھیرڈوں کے گلے میں ادٹ کی۔۔۔۔۔ ایک طرف تو وہ اس بات سے خوش تھے۔ کو ان کا بیٹا آواز ان لوگوں سے گھل مل گیا تھا۔ کیونکہ شروع شروع میں انہیں یہ حد شرع تھا۔ کہ کہیں وہ اس اضنی ماحول سے الگ ہو جلا بھگ نہ جانے۔ لیکن اب انہیں ایک اور حد شرع ہونے لگا تھا۔ انہیں مدد تھا کہ کہیں ان کی بیوی ان کے بیٹے کو ان سے چھین نہ لے۔ یہ نہیں کہ وہ ان کے معلوم تعلقات کو کسی قسم کے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بلکہ وہ تو صرف اس بات سے ڈر رہے تھے کہ کہیں ان کا بیٹا انہیں بھول نہ جائے۔ اپنی نئی ماں کی طرف بھگ کر انہیں نظر انداز نہ کر دے۔ کیونکہ وہ خود کو بیٹے کی محبت و الفت کا واحد مستفاد سمجھتے تھے۔ جس میں وہ کسی رقیب یا شریک کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ اپنی بیوی کو رقیب کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔۔۔۔۔ میں تو اس کا باپ ہوں۔ میں اس سے پیار اور ذرا نبرداری کا مطالبہ کر سکتا ہوں۔ لیکن وہ اس کی کیا لگتی ہے؟ کچھ نہیں!۔۔۔۔۔ نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ میرا بچہ ہے۔ میری ساری محبت و خون کا ٹکڑا۔۔۔۔۔ وہ اتنا ناخلف نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ بوجھ سوجھ سے سوچتا ہوا کی خاک بھیکوں کے اثر سے نہ جانے وہ کب سو گئے۔

اگلی صبح اقبال کی تجویز پر وہ ہنر کے کتا سے پلنگ پر جانے کے لئے تیار دوں میں معروف تھے کہ، فنا ساتھ والے گھر میں داد بلا بھی گیا۔ مورتوں بچوں کے رونے چلانے کی آواز آنے لگی وہ رب وحشت نہ وہ نظروں سے ماتم کی آواز کو سننے لگے۔ میاں صاحب نے زینہ کو پتہ کرنے کے لئے بھیجا۔ اس نے آکر بتایا کہ ساتھ والے گھر میں ایک بڑھیا چل بسی تھی۔ میاں صاحب کو بہت رنج ہوا۔ کیونکہ وہ بڑھیا ہمیشہ ان کے گھر میں آیا جایا کرتی تھی۔ اور ان کی مرحوم بیوی نے تو اسے اپنی ماں بنا لیا تھا۔ بھئی تم وہ دونوں جا کر افسوس کراؤ۔ میاں صاحب نے اپنی بیوی اور اس کی بہن سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ دونوں ہچکچائیں۔ وہ اپنی پک ٹک سے متعلق سوچ رہی تھیں۔ میاں صاحب ان کی ہچکچاہٹ کو بھانپ گئے۔ پڑوس کی بات ہے۔ ہسٹیل کا سنی مزہ دار کرنا چاہیے؟ انہوں نے قد سے دوڑا اور امرار سے کہا۔۔۔۔۔ دونوں بہنوں کے منہ ٹک گئے۔ اس بڑھیا

کبھی تو بھی آج ہی مرنا تھا! ان دونوں نے سوچا۔ ان کی پک، نلک، دھڑکی، دھڑکی رہ گئی۔

... دونوں برہنہ امداد ساتھ واسے گھر میں چلی گئیں۔ اقبال وقت لائن کے غرض سے اٹھ کر کتاب لے کر بیٹھا گیا۔ زینہ باپ کی خانے میں اپنے کام لائی میں لگ گئی گھنٹہ ڈیرہ سے بعد زینہ اس طرف آئی۔ اس نے بنا، دھڑکی لپٹے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ تیل لگے ہوئے بالوں میں دھلک تھی۔ آنکھوں میں کاجل کی سیاہ چمک تھی۔ سانس پھرے پوچھو۔ ٹکس طرنت تھی۔ تیلیں ہی تو بیت دیو سے آئیں آئی۔ وہ بولی۔۔۔۔۔

کیوں؟ اقبال نے کتاب سے انکس اٹھائے بغیر پوچھا۔۔۔۔۔ جب تک میت گھر سے نہیں نکلے لی انہیں چھٹی نہیں ملیگی۔۔۔۔۔

اقبال نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ اُسے اس وقت اس کے چہرے میں بڑی کشش اور جاذبیت نظر آئی۔ اچھا! اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور نظریں جھکا لیں۔۔۔۔۔ چھوٹے میاں آپ کو بھوک تو نہیں لگ رہی؟۔۔۔۔۔ بھوک؟ اجن سے؟۔۔۔۔۔ میں نے یونی پوچھ لیا۔ ڈبل دہائی پڑی ہے۔ سواہ مخا، سو کو کر مائل جائے گی؟ اقبال کو خیالی بھوک کا احساس ہوا۔ ٹکس بھی ہے۔۔۔۔۔ ہی۔۔۔۔۔

اور شہد؟۔۔۔۔۔ ہی۔۔۔۔۔ تو جاؤ مجھے تین چار ڈسٹ بنا کر دو۔۔۔۔۔ وہ چل گئی اور کچھ دیو کے ہڈیوں میں پانچ چھ ڈسٹے کر آئی۔ اس نے پیٹ میز پر رکھی۔ اور خود سرش پر بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ بیت مزیدار ہے؟ اقبال نے ڈسٹ میں دانت گاڑتے ہوئے کہا۔

لو تم بھی کھاؤ۔۔۔۔۔ نہیں چھوٹے میاں! وہ گھر بھر بولی اٹھی۔۔۔۔۔ اے کوئی بات نہیں۔ اس وقت دیکھنے والا کوئی نہیں؟۔۔۔۔۔

زینہ نے ہچکچاتے ہوئے ڈسٹ اٹھا لیا۔ امداد سے دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ چھوٹے میاں آپ کو اس دن میری بنائی ہوئے چائے پسند نہیں آتی تھی؟۔۔۔۔۔ کیس دن؟۔۔۔۔۔ اسی دن جب آپ نے میری بنائی ہوئی پیالی واپس کر دی تھی۔۔۔۔۔ کب؟۔۔۔۔۔ میں نے تو کوئی پیالی واپس نہیں کی تم سے کس نے کہا؟۔۔۔۔۔ اور کسی نے نہیں۔ یونی میں نے سوچا کہ۔۔۔۔۔ اس نے گھر آکر اپنی بات ادا کر لی

چھڑادی۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈسٹ کو گھورنے لگی۔ اقبال نے اس کی طرف دیکھا۔ کھاتی کیوں نہیں اسے؟ وہ مسکرا دی۔ اور اُسے کھانے لگی۔ اقبال نے اُس کے سفید سبھی جیسے دانتوں کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ تہا سے دانت بڑے خوبصورت ہیں۔۔۔۔۔ وہ شرمانگئی اور اُس کے ساتھ چہرے میں سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔۔۔۔۔ تم بیوہ ہو؟۔۔۔۔۔ نہیں!

اس نے سر اٹھایا۔۔۔۔۔ کتنے سال سے؟۔۔۔۔۔ پانچ سال۔۔۔۔۔ اقبال کا دل رحم اور ہلکوی کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔

کہاں کا جینا اور کیسی جوانی! سچ چاری!۔۔۔۔۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس کے لئے کچھ کرے۔ مگر کیا اور کیسے؟۔۔۔۔۔ میری طرف دیکھو! اس نے اس کی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے مسادہ کیا کرتے ہوئے کہا۔ اس کی انگلی کے لمس سے اس کے جسم میں جلی سی رزش پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی سیاہ امداد اس آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں کی آغوا گہرائیوں میں حیرت اور پرستش کے دیئے لاپ رہے تھے۔ اس نے اپنی انگلی سے اس کے سیاہی مائل تپتے پتلے ہونٹوں کو چھوا۔ اس کی انگلی اس کے چپکے ہوئے گال کی تہی ہوئی جلد پر سے ہوتی ہوئی، اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈی پر سے گزرتی اس کے ہاتھ پر رک گئی۔ اس دھلان میں وہ ستار کے تار کی طرح تھر تھرتا رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرائے۔

۔۔۔۔۔ اے چلی دہائی کیوں ہے؟۔۔۔۔۔ کچھ نہیں! اس نے اپنے سر کی جنبش سے آنکھوں کو پھیلانے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ دیکھو میرے ساتھ چلو؟۔۔۔۔۔ کہاں؟۔۔۔۔۔ میسرے گھر جب میری شادی ہو جائے گی تو میں تجھے اپنے اس جالوں کا، کیوں آؤں گی؟۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ ادھوں! وہ جھیل جھیل آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی امداد! اسے کچھ ایسی نعروں سے دیکھنے لگی جیسے اس کی باتوں پر یقین نہ آرہا ہو۔ نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ نئی ساروں سے آنسوؤں کا رازا ہوا سیلاب کیا دلی اہل پڑا۔ نہ جانے وہ آنسو کن دلی گھٹی ہوئی خواہشات، کھلی ہوئی

پوچھی ہوئے تھے، بیاں میں سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے راکھ سے بچنے کی کچھ بھی نہ پوچھا۔ اس کی شکل و صورت اور تعلیم کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ ان سے ملنے کوئی اتنی ہی مانی تھی کہ وہ ایک اچھے مزاج، کھاتے پیے گھر سے ہی سے تھی۔ تو پھر یہ ایک ادا ہے شاہی کرنے کا؟ — — — — — ممبر میں! — — — — — بڑا مناسب کھانچ ہے۔ تم گھر کو دوسری سبب انہیں دنگم کروں گا۔ انہوں نے ہاتھ آگے بڑھتے ہوئے: — — — — — اور کچھ کچھ پنے ہونے والے سرسبز لاپرواہی سے جادو:

اقبال غصہ آیا۔ وہ دونوں نہیں سر جھکا کر دیکھتا تھا۔ تو تم واقعی آج جا رہے ہو؟ — — — — — بی بی! — — — — — پچھلے یوں نہ بتایا۔ میں تمہارے کوئی بھٹی ہوئی چیز ہی یاد کر لیتی — — — — — چھوٹے ان تعلقات کی کیا ضرورت ہے؟ وہ ہنسنے ہوئے بڑا اس نے آسان کی طرف دیکھا۔ آسان پر گہرا غبار چھایا ہوا تھا۔ ادا ہوا میں رفتہ رفتہ جدت پیدا ہو رہی تھی۔ آج پھر دیکھ لے گی — — — — — ہاں! بڑے ادا میں نظروں سے آسان کی طرف دیکھتے ہوئے آہ بھری صحن میں گلاب ادا ہے۔ تیسرے پھول تشہد اور مختصر نظروں سے پانی کا انتظار کر رہے تھے۔ بین آن کسی لڑائی میں نے کا خیال ہی نہیں کیا تھا۔ اقبل اپنے کمرے میں جا کر اپنا مختصر سا سادہ سینے کا زین پچکے سے اس کے کمرے میں آئی۔ اب جا رہی ہے! — — — — — ہاں! وہ پاؤں سے لگاتار سے فرش کا کمرے لے گی۔ اس نے دیکھ دیکھا۔ وہ ہونٹ چبا رہی تھی — — — — — گھر تو نہیں میں تین چار بیویوں تک آ رہی ہوں۔ — — — — — نہیں آپ مجھے بھول جائیں گے۔ وہ بھولتے ہوئے ہوتی ہے۔ ہلکی چیز ہوں۔ تو کمرے میں آج — — — — — اور سے نہیں پچھلے سی دتیں نہیں کیا کہتے: اس نے اس کے گل نصیبیائے ہونے پیار سے کہا: ادا کھور و ناست۔ تمہاری لڑائی نے دیکھ لیا۔ — — — — — واد کیا مجھے رہنے کی اجازت بھی نہیں؟ — — — — — اس نے تنہا ادا عزت سے کہا — — — — — اس نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں قلم کیا۔ اور اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے بولنا جاؤ۔ اب بھاگ جاؤ۔ کوئی آلیا تو تمہاری شامت آجائے گی۔ ادا وہ ہلکے پچھاتے ہوئے قدموں سے واپس چلی۔

کچھ دیر کے بعد وہ باہر نکلا۔ دونوں طرف میں بستہ رہنے پر خاموش بیٹھیں ڈبل کوئی۔ عید یزے چن رہی تھیں۔ انہوں نے شاید ابھی تک ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ — — — — — ذرا تاخیر تو سناؤ۔ — — — — — میں چلے بیٹے؟ — — — — — بیگم نے اس کی آنکھوں میں اسکی ڈالنے پرے اتاری ہے یہی ادا ہو کسی سے پوچھا۔ — — — — — بی بی! — — — — — سارے دن بچے داے ہیں — — — — — زینہ ادا بھاگ کے تاحو تو کچھ لا۔ زینہ نے صحن میں سے گڑے تھے وقت ملکہ اس کی طرف دیکھا ادا باہر نکل گئی۔ وہ برآمدے میں کھڑا انتظار کرنے لگا۔ اس نے اپنے چہرے پر گرم ہوا کی جل کو محسوس کیا۔ بیگم کی طرف مٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ رتیا سر پہ بھائے لیز پوش پر خیالی نقش و نگار جا رہی تھی — — — — — چرب ادا لے: — — — — — بیگم نے پوچھا — — — — — مشائخ گھر میں آؤں؟ پھر وہ بھل خاموشی چھٹی گئی۔ جس کتنی ہی ان کی باتوں کی گونج تھی۔ ادا کتنے ہی خیالات کی جھینسا بٹھ تھی۔ جو زبان پر نہ آ سکے تھے۔ تاہم آگیا۔ زینہ اس کا سوٹ کسٹھا کر باہر لے گئی۔ وہ دونوں اس کے ساتھ باہر دھڑلے سے نکل گئیں۔ زینہ باہر چھ خانے کی کھڑکی کی بجائی سے ناک چپا کر کھڑی ہوئی۔ اس نے دونوں کو سلام کیا — — — — — خدا حافظ! — — — — — بیگم نے خشک نگے میں ہنسی ہوئی آواز نکالی۔ تاہم چل دیا۔ باہر لے کے بھگڑ چل رہے تھے۔ ایک گرم ہوا لگولہ اپنے دامن میں گھر د خیال کاغذ کے ٹکڑے اور خشک پتے سمیٹا ہوا لٹکے کے پیچھے دیکھے چل دیا۔ تاہم دھڑلے کے بادل لڑا تاہم لکیر ادا لٹی کے درختوں کے پتوں بیچ چلا جا رہا تھا۔ وہ دونوں خشک، جلتی ہوئی آنکھوں سے تانے کے اڑانے ہوئے گھر د غبار کو دیکھ رہی تھیں۔ ادا خوف سے عالم میں اس لمحے کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب تاہم نظروں سے ادا بھل ہر جائے گا۔ وہ دونوں تنہا رہ جائیں گی۔ ادا انہیں ٹکڑے دوسرے کی آنکھوں میں بھاٹکتے ہوئے گزشتہ دنوں کا حساب کتاب چکانا پڑا۔

گلی

گلی ہر روز صبح کا سہانا پیغام بن کر آتی تھی۔ اُس کے کُتے ہی گھر بھر میں رونق، زندہ دل اور مصروفیت کی لہر دوڑ جاتی۔ وہ دروازے میں داخل ہوتے ہی کہتی۔

”نانی ماں! دیکھو میں نئے کپڑے پہن کر آئی ہوں میلا بیاہ ہو گیا ہے۔ اب میلی بالات آئے گی: چہرہ ہمارے گھر کے لیک ایک فرد سے دار سے میں پوچھتی۔ چھوٹے ماموں کہاں سے زیر؟ نانا بابا جال مٹے ہیں۔ ہیں۔ با جال سے کیا لانے گئے ہیں؟ ماموں ابھی تک چھوٹے پڑے ہیں۔ چہرہ میرے کمرے میں آ جاتی مجھے بیٹے ہوئے دیکھ کر کہتی۔ ماموں جی آپ ابھی تک چھوٹے ہوئے ہیں۔ اب تلات بھی ختم ہو گئی دیکھو اب نودھ پ بھی آگئی ہے۔ ماموں جی۔۔۔ اے ماموں جی۔۔۔ داد میں اٹھ کر اُسے بستر پر کھینچ لیتا۔

”وہ بیٹھنے والے کپڑے پہنے ہیں۔ ہیں ماموں جی۔۔۔ میلا تو بیاہ ہو گیا ہے۔۔۔ جنس کر کہتی۔۔۔ ہیں۔ اب میلی بالات آئے گی۔ اور وہ مجھے اپنے دھڑے ہوئے کپڑے بڑے شوق سے دکھانے لگتی۔

ساتھ سے تین سالہ گلی۔۔۔ بھونے سے باؤں والی گڑیا سی بھی ایک ہمارا کلرک کی بیٹی تھی۔ کلرک کی بیٹی سے میری ماں کو اتنی محبت تھی کہ میری ماں اُسے اپنی بیٹی کہتی تھی۔ یہ لوگ منہ پر شیا پدے رہنے والے تھے۔ تقسیم کے بعد گلی کے باپ نے یہاں آکر ایک دفتر میں کلرک کی کرنی تھی اُسے اسی چاقی روپے ماہوار ملنے تھے بلکہ اس سے ان کا گوارہ بڑی شکل سے ہوتا تھا۔ کیونکہ اُن کے گھر کے چار افراد تھے۔ یعنی میاں بیوی کے علاوہ وہ بیٹیاں تھیں۔ ایک سات سالہ لڑکی اور دوسری گلی۔ اس کے علاوہ گلی کے باپ کو اپنی دو بیویاں تھیں، ایک بھائی اور دو بھائیوں کے باپ کو جو پنجاب کے کسی گلاں میں کاشتکار تھے کچھ روپے ہر ماہ بھیجنا پڑتے تھے۔ ہمارے دو گھرانوں کا آس میں بڑا میل جول تھا۔ اس لئے گلی ہم سب سے مانوس تھی۔ ہم اُس کی دلچسپ اور پیاری باتیں سن کر ہنستے رہتے۔ ہمارے گھر میں گزشتہ دس بارہ سال سے کوئی چھوٹا بچہ نہ تھا۔ اور اس لئے گلی جی ہلکے گھر میں بڑی اہمیت رکھتی تھی اور ہم بڑے چھوٹے سب اُس سے انتہائی پیار کرتے تھے۔ گلی پیاری، مزے دار باتیں کرنے کے علاوہ ہالی وڈ میں بھی تھی۔ وہ کوئی واقعہ راہ چلتی بھی دیکھ لیتی تو ایک حرم سے تک اُسے پوری طرح سے یاد رکھتی۔ ماں باپ اور بڑی بہن سے سنی ہوئی باتیں سننے سے ذہن میں محفوظ کر لیتی۔ اور تمام اپنی گلی میں رپڑتی ہوئی حور توں کی رنگارنگ گایاں اور اشارے تک اُسے ذرا یاد ہو جاتے

چھ سات ماہ پہلے گلی کا ایک سالہ بھائی کچھ دن بیمار رہ کر مر گیا تھا۔ اُس کی پیدائش سے کمرت تک کا ہر واقعہ گلی کو یاد تھا۔ گلی کئی بار اپنے ننھے سے ہنرٹوں کو چھلکا کر اور نہ بنا کر نہیں بتاتی۔

”کالا اس طرح سے دودھ پیتا۔۔۔ عوں خوں کر کے باتیں کرتا۔“ وہ کئی بار چپ چاپ چار پائی پر چڑھ کر بیٹ جاتی۔ اپنی آنکھیں بند کر کے کہتی۔۔۔

”دیکھو نانی ماں! دیکھو ماموں جی! کالیں آنکھیں بند کر کے مل گیا تھا۔ میں بھی اُچھی طرح مل جاؤں گی۔ ہیں۔ پھل میں اللہ سبائ کے پاجھے چل جاؤں گی۔۔۔ بچے نامہ لکھی کی مرمت کا حادثہ شائد گلی کے ذہن پر بڑی طرح نقش تھا۔ اور اس کا اس کے ننھے دل پر بڑا اثر تھا۔ رفتہ رفتہ وقت نے اس اثر کو ناکمل

سدا۔ ادبھی سے پہلے ہاں دے دیا گیا۔ وہ کبھی اپنی ماں ادبھی بہن کو ساتھ لے کر ہاں آجاتی۔ اور دن کا اکثر حصہ یہاں گزار دیتا۔ پھر بگی کا آنا نہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ اُس کی ماں سخت بیمار ہے۔ اُس کی ماں کو تپ دق ہو گئی تھی۔ جو آہستہ آہستہ آخری منزل کو پہنچ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے نئی بار بگی کے باپ سے کہا تھا کہ وہ بڑی کو کسی صحت افزا مقام پر لے جائے۔ لیکن یہاں تو ان لوگوں کے پاس پیٹ بھرے کو بھی نہ تھا۔ اتنا خرچ کہاں سے لاتے؟ نتیجہ یہی ہوا جو اس بیماری کا ہر کرتا ہے۔ بگی کی ماں مر گئی۔ بگی کئی عرصہ ہاں نہ آئی۔ ماں کی موت کے وقت بگی بھی اپنی بڑی بہن کی طرح ماں سے پیٹ کر رہی تھی۔ بگی کو بھل ایک سانسے کے گھرے جا کر اُس کی ماں کا جنازہ اٹھایا گیا۔ اب اُس کی ماں کی بڑی بہن جو خود ایک عرصے سے بیمار چلی آتی تھی۔ وہ دھن کی خاطر یہاں آگئی میری ماں بڑی وقت سے بگی اور اُس کی بہن نسیم کو ہاں لے کر لے کر آئی تھی۔ وہ دونوں بہت پریشان اور افسوس ریش۔ اکن کی خالہ بوا آج صبح اپنی بیماری اور گھریلو حالات کے باعث شادی نہیں کر سکی تھی۔ اکثر ہسٹیریا کے دوروں اور خدائی عبادت میں وقت گزرتی تھی۔ بہن کی موت کے غم نے اُس کے دھن کو شدید کر دیا تھا۔ بچوں کی پرورش اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ بگی کا باپ بھی بہت دن پریشان رہا۔ وہ مددگار وقت خود کھانا پکاتا۔ اور گھر کا کام کرتا۔ ادبھی کی دیکھ بھال کا نانا اب بھائی اُس کی بہن نسیم پر آ پڑا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نسیم کو ایک دم یا احساس ہو گیا ہے۔ کد اب وہی بگی کی ماں ادبھی ہے۔ اب اُس نے ماں کی یاد میں بگی کے سونے رونا چھوڑ دیا۔ وہ دیکھ کے اس کو بگی کے ننھے ذہن سے دھن کی دن رات کو کشش آئے گی۔ رات کو بگی کو اپنے ساتھ سلاتی۔ اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ اُس کے میلے کپڑے دھوتی۔ اُسے کھانا کھلاتی، ہنوتی، دھنوتی، اُس کے بال سنس، کرائیوں میں سرسہ ڈال کر سپوں میں اٹھائے پھرتی۔ بگی ذرا سا بھی پریشان ہوتی تو نسیم کی جان پر پڑ جاتی۔ نسیم کی صحت پہلے سے اچھی نہ تھی۔ لیکن ماں کی موت کے بعد بگی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری نے اُسے ادبھی و بھ کر دیا۔

وقت جتنے بڑے گھاؤ لگتا ہے۔ اتنی ہی جلوی اہیں اچھا بھی کر دیتا ہے۔ ادبھیوں کے دھن سے تو زخم جلدی وصل جاتے ہیں۔ ان دھنوں بہنوں کا غم بھی آہستہ آہستہ مٹنے لگا۔ اب وہ دھن زیادہ تر ہمارے گھر رہنے لگیں۔ لیکن شروع میں بگی کا دل نہیں بہتا تھا۔ وہ بہن کو بار بار اپنے گھر جانے کے لئے کہتی۔ ادبھیوں سے پھر اُسے ہمارے گھر سے آتی۔ جب بگی کی طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا تو ہمارے گھر میں بھی پہلی سی چل پل جانے لگی۔ اب ہم اُسے کوئی تکلیف نہ ہونے دیتے تھے۔ وہ بھی پہلے کی طرح کبھی گھر کے ایک ایک فرد سے باتیں کرتی، ہر ایک کو پھیرتی اور پیار سے لپٹ جاتی۔ غرض دن بھر وہ ہمارے گھر میں کھلتی اور اپنی بیماری باتوں سے گھر میں آجالا کئے رکھتی۔

وہ عادت کے مطابق صبح ہی صبح ہاں آجاتی۔ منڈیوں پر اور صحن میں پھرتی ہوئی پوچھنے والوں کو اُس کے پیچھے تالیاں بجا کر بھاگتی۔ اُس کے گھرنے کے پھر سے پھیر چھا ڈال دیا کرتی۔ کبھی گھرنے لگتی۔ کوئی خالی ڈبہ لے کر دھوک بجاتی ساتھ ہی گانا گاتی۔ کبھی برآمدے میں کھڑی ہو کر آنکھیں مٹکاتی اور پنکیاں بجا بجا کر اپنے لگتی۔

اس اٹا میں جب کبھی اُس کی بہن کسی کام سے باہر چلی جاتی تو بگی کی زندہ دلی ختم ہو جاتی۔ وہ اُسے کبھی براہ سے کبھی صحن کبھی ایک کسے کبھی دھن کرے میں ڈھونڈتی اور دھن دھن سے امدادیں دیتی۔ چیم اے چیم۔ جب نسیم نہ تھی تو وہ لگتی بعض اوقات اُس کی بہن جان بوجھ کر ٹیبل کے بڑے آئینے کے پیچھے جا کر چھپ جاتی۔ ادبھی اُسے تلاش کرتے کرتے جب آئینے کے پیچھے جا کر پڑ جاتی تو تالی بجا کر دھن دھناتی اور کہتی۔

”نہیں سمجھی چیم کہیں گم ہو گئی ہے۔ میں اب آپھے کہاں ڈھونڈوں گی۔ تم یہاں چھپی ہوئی تھیں۔“ یہی چیم آواز دھن دھن سے چٹ کر خوب

قیحہ لگاتی۔ نسیم دراصل لگی کی بہن ماں اور خادہ بھی کچھ تھی۔ جب کبھی نسیم اُسے ہٹا دیکر صاف کپڑے پہنا کر ہاتی تو لگی بہت خوش ہوتی۔ وہ ہنسی ہوئی ہر ایک کمرے میں گھومتی پھرتی۔ ہم سب کو اپنے کپڑے دکھاتی اور جب وہ نئے کپڑے پہن لیتی۔ اس کے پاؤں گویا زمین پر نہ لگتے۔ وہ ہاتھ گھر میں داخل ہوتے ہی سب کو بجاتی۔ آئیے اٹھا اٹھا کر خود کو گھورتی پھر ٹھیک میں بڑے آئینے کے سامنے جا کر کھتی ہی۔ یہ اپنے کپڑوں اور اپنے آپ کو دیکھتی رہتی۔ بڑے آئینے سے ڈر کر یا اُسے مشت تھا۔ اُس کی بہن اگر باہر چلی جاتی اور لگی صند کر سکتی تھی۔ تو ہم اُسے اٹھا کر بڑے آئینے کے سامنے سے آتے۔ وہ نور اُچھ پر جاتی۔ اور بہن کا خیال جوں کر تینے میں خود کو دیکھتی رہتی۔

ننھی لگی کے دل میں بہت سے شوق تھے۔ اُسے اچھے کھڑوں تصویروں اور کپڑوں سے بڑا پیار تھا۔ وہ کئی بار میرے پاس آ کر کتابوں اور رسالوں میں تصویریں دھونڈنے لگتی۔ ویسے تو ہم سب سے لگی بہت مونس تھی۔ لیکن میں چونکہ بچوں کی طرح اُس کے ساتھ کھیلتا، نہتا تھا۔ اس لئے وہ بار بار میرے پاس آ جاتی۔ کبھی مجھے سے اگر میری دونوں انگلیں بند کر لیتی میں پوچھتا۔ "تم کون ہو؟" وہ جواب دیتی۔

— میں چیم ہوں۔ — میں کہتا۔ — تم نسیم ہو تو لگی کہہ لیتی ہے؟

"لگی اپنے گاؤں گئی ہے۔ وہ گالی میں بٹیر کل گئی ہے۔ گالی چھک چھک کل کے چلتی تھی؟ میں جب اُس کے ہاتھ ہٹا کر لے دیکھتا تو وہ قہقہہ مار کر مجھ سے ہٹ جاتی۔ میں کہتا۔ —

"لگی تم تو گاؤں گئی تھیں وہاں کس کے پاس گئی تھیں؟"

"میں پھر بھی پھیا کے پا پھر گئی تھی۔ وہاں میں نے کھائے کھا لیں کھائیں۔ — ہیں۔ — ماموں جی پھل سیلی پھوپھی نے مجھے بے اچھے کیلے دیئے۔ نئے نئے کیلے تھے۔ ماموں جی! میں پھل میں کچلے پیوں گی۔ — سیلا بایا جو جائے گا۔ — ہیں ناما ماموں جی! پھل سیلی بات..."

کبھی کبھی میں لگی سے جاں بوجھ کر دھڑکاؤں کرتا۔ اس وقت وہ سیکر مجھ سے بھائی کی گردنیں جا بیٹھتی۔ اور مجھے چڑا سنے کے لئے میری طرف اشارہ کر کے نال چڑھا کر کہتی۔ —

"وہ ماموں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ سیلا ماموں تو مجھ سے ماموں ہے۔ یہ بلا اچھا ماموں ہے۔ یہ۔" کچھ دیر کے بعد وہ مجھے پکارتی ہوئی میرے پاس آتی۔ اور میں اُسے کوئی جواب نہ دیتا۔ تو بچے سے پاس کھڑی ہو جاتی بھراہتہ سے کہتی۔ —

"ماموں جی! آپ نالاج ہو گئے ہیں۔ وہ چھوٹا ماموں تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ سیلے ماموں تو آپ ہیں۔ — ہے ماموں جی۔ — میں اس پر بھی نہ جانتا۔ تو وہ خود ہی چار پائی پر چڑھ کر میرے قریب ہو کر کہتی۔ —

"ماموں جی! اے ماموں جی۔ میرے جن ماموں آپ تو بڑے اچھے ہیں۔" یہ کہتے ہی وہ مجھ سے ہٹ جاتی۔ میں اُسے گود میں لے لیتا۔ اور وہ باقی شروع کر دیتی۔

وقت نے لیک اور رختہ ڈالا۔ لگی کے باپ کی ملازمت جاتی رہی۔ وہ چھاتی میں آ گیا تھا۔ لگی کی ماں کی بیماری پر وہ کافی قرض لے کر خوش کر چلا تھا۔ اور اب کلکی جاتی رہا۔ بے مد پریشان ہو گیا۔ کئی روز تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اس کے گھرانے کو اب کھانے پینے اور کپڑوں تک کے مسئلے پڑ گئے۔ کبھی اڑدس روپے۔ لے جن کے بچے لگی کی خادہ سے پڑھتے تھے۔ کچھ کپڑے دے دیتے یا ہم لوگ کچھ دے دیتے تھے۔ لگی کی زندگی پر اگرچہ کافی اثر پڑا تھا۔ تاہم اُسے ان حالات کا شعور نہ تھا۔ اُسے صرف اتنا معلوم تھا کہ چلے اُس کے ابا دفتر جاتے تھے۔ اب گھر پر رہتے ہیں۔ پھر کئی لوگوں کے مشورے سے اُس کے باپ نے دوسرے شہروں میں پھر ملازمت ڈھونڈنی شروع کی۔ اُس کے ان کا خرچ اور بھی بڑھا۔

مین الہی

بہن

(تمثیل ایک باب میں)

انفرادی تمثیل

نزدہت _____ جمیلہ کی بہیلی
 جمیلہ _____ ایک نرس
 ساجدہ _____ نرس
 امیں _____ نرس
 شمیم _____ نرس
 پردین _____ نرس
 گونگی _____ ملازمہ

منظر (نرسز ہوم)

جمیلہ لاکرہ صحت مستحضر اور سادہ جیسا کہ ایک نرس کا ہونا چاہئے۔ آنے جانے کے لئے عورت ایک دروازہ جو جنرلی دیوار میں ہے۔ اور جس پر نیلے رنگ کا پردہ لٹک رہا ہے۔ دو کھڑکیاں سامنے کی دیوار میں۔ دونوں پٹ کھٹے ہوئے۔ کھڑکیوں میں سے دُور آنے کے نیچے درختوں کی ایک مسلسل قطار چلی گئی ہے۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے جمیلہ سامنے کی دیوار سے سہارا لگاتے پٹنگ پر بیٹھی ہوتی نظر آتی ہے۔ عمر تیس سال کے لگ بھگ چہرے پر جا بجا چمپک کے نشان، رنگ سیاہی مائل۔ پٹنگ کے پاس تپانی کے اُپر چائے کی ٹرے پڑا ہے۔ سامنے کے علاوہ دو کرسیاں بھی ہیں جو پٹنگ کے قریب اس طرح رکھی گئی ہیں کہ ان پر بیٹھنے والوں کے چہرے ایک دوسرے سے سامنے رہتے ہیں۔

وقت - دن کا تیسرا گھنٹہ۔

جمیلہ ددماندے کی طرف اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے کسی کی منتظر ہو۔ کمرے کے باہر نرسوں کی آوازیں اسیٹیاں اور تہقہے گونج رہے ہیں۔

نزدہت آگے ہے۔ اُدنیچے متوسط طبقے کی لڑکی۔ لباس بھڑکیلا، جمیلہ کی ہم عمر، لائق تقدیر میں ہنس، چہرہ پودا اور پٹنگ سے آراستہ۔

نزدہت، درگسے میں داخل ہوتے ہی، چہ خوب، حضرت ابھی تک بستر پر دراز ہیں۔ نیوں خیر تو ہے، ہلک چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتیں تم!

جمیلہ، غلاب ہے طبیعت، دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔
نزدہت، ہسپتال سے بروکر آ رہی ہوں۔ میں نے سمجھا ڈیوٹی پر چلی گئی ہو۔
جمیلہ، ہل جاؤں گی، ڈیوٹی پر بھی۔ بیٹھو۔ اتنے دنوں کے بعد آئی ہو؟
نزدہت، درگسے پر بیٹھتے ہوئے بیزار ہی سے، کیا کروں ناک میں دم آگیا ہے۔ کراچی سے بہن آگئی ہے۔ خیر اسے ترانا ہی چاہیے تھا۔ مگر ساتھ بچوں کی فوج بھی آگئی ہے۔ شہنشاہوں نے وہ اُدھم مچا رکھا ہے کہ تو بہر بھی بھلی۔ سارا سارا دن میرے کمرے میں کھٹے رہتے ہیں۔ شاید ہی کوئی چیز سلامت رہے گی ان کے ہاتھوں۔

جمیلہ، دلچسپی میں اشتیاق، بہن آئی ہے۔ بڑی چل پھل ہو گی۔
نزدہت، چل پھل کیا ہو گی۔ میں تو ریٹائر ہوئی ہوں جمیلہ! جانے یہ طوفان کب جائے گا۔
جمیلہ، طوفان کیسا؟ یہ تو بڑی خوش کی بات ہے۔ اپنی سگی بہن۔ اور وہ بھی ایک عرصے کے بعد ملے۔ تم تو رو رہی چننا کرتی ہو۔ خوب باتیں ہو رہی ہیں بہنوں میں آج کل۔۔۔ ہیں نا؟

نزدہت، باتیں کیا خاک ہوں گی۔ اب میں نہیں کیا باتوں اس دنیا میں کیا کچھ رہتا ہے۔ لوگ دھڑوں کی نیکی سمجھتے ہی نہیں۔
جمیلہ، (آدھ کر) مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا اس بات کو؟ — ثریا کو جانتی ہو — ہٹا دے کہ —
نزدہت، دبے دبانے سے جمیلہ کے الفاظ کاٹ کر، میرے بس میں ہر تہ کہیں دور بھاگ جاؤں۔ جہاں یہ رشتہ داریاں اور ان کا بھٹکتا ہو۔ تم جانتی ہو، ناراضی کی نند کے چھوٹے بھائی کا رشتہ آیا تھا۔ اپنی اسمٹری کے لئے مجھے تو یہ رشتہ ہرگز پسند نہیں مگر راضیہ سمجھتی ہے اس سے بہتر رشتہ کہیں مل ہی نہیں سکے گا۔ بس یہ بھگڑا ہے۔ اور اسی لئے وہ کراچی سے آئی ہے۔ ہمیں سمجھانے کے لئے۔ راضیہ۔ ہمیں سمجھانے کی!

(ساجدہ آتی ہے۔ نرس کی یونیفارم میں ملبوس)

ساجدہ، کہو جمیلہ! کیا حال پال ہے۔ بھئی اٹھ بیٹھو نا۔
نزدہت، یہ یوں نہیں اٹھے گی زبردستی اٹھانا پڑے گا اسے
ساجدہ، جتنی بات یہ ہے اس نے یہ بیماری خود مرل لی ہے۔ یہ حال نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔ نرس کو مہماندہ کی خدمت کرنی چاہئے۔
پھر خود کو قربان تو نہیں کر دینا چاہئے۔

جمیلہ، ثریا کے بارے میں کہہ رہی ہو؟ — معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟
ساجدہ، ہزار بار سن چکی ہوں بس چپ رہو۔ بالکل پرائیویٹ ہو۔

نزدہت، ہٹا کیا ہے؟

ساجدہ، دیکھو، نزدہت! یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایک مہماندہ نہیں بہن کہہ دے اور تم اس کے لئے تین بار

اپنا لکھنا دے دور شک کو دایم۔ ایس کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی ورنہ۔۔۔ تم جانتی ہو تا کتنی سخت طبیعت ہے اس کی !
 نزہت ، تین بار لکھنا دیا ؟ اندھیر ہے (طنزاً) اپنی صحت جو انشا اللہ نہایت اچھی ہے۔
 ساجدہ ، صحت یہی نہیں بلکہ آنت بڑے کو بھی اس کی خدمت کرتی رہی۔
 جمیلہ ، (آواز میں درد) اور ساجدہ ! اثر یا نے گھر بیٹھی کر جو کچھ کیا ہے وہ۔۔۔
 ساجدہ ، بالکل پختہ ہو۔ درست دماغ دیکھ کر اچھا۔۔۔ چیر لیو۔
 (ساجدہ چلی جاتی ہے)

جمیلہ ، (اپنے خیال میں) میں نے اسے اپنی بہن سمجھا تھا۔ اس نے مجھے بہن کہہ کر بلایا جو تھا۔ مگر۔۔۔
 نزہت ، پھر بہن۔۔۔ اُدھ۔۔۔ کبھی دیکھا بھی ہے بہنوں کو۔ رقیعہ بہن ہی تو ہے مگر کیا مجال جو اُسے اپنے گھر والوں سے ذرہ برابر بھی ٹھپسی
 ہو۔ ماما اس کی نند کا بھائی ولایت سے انجینئرنگ کی ڈگری کے آیا ہے لیکن ان لوگوں کے پاس نہ تو اپنا بنگلہ ہے اور نہ کار
 ہے۔ اصغری اس گھر میں کنیز مقرر جاسکتی ہے۔ خود غور کرو کتنی بڑی مصیبت ہے میرے لئے۔ بہر حال میں اصغری کو تو وہاں
 ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ بنگلے اور کار کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے آج کل !۔۔۔
 جمیلہ ، اور اس مصیبت کا بھی اعازہ کدنا۔۔۔ میں نے۔۔۔

نزہت ، (جلدی سے) ایک مصیبت ہو تو کوئی کہے بھی۔ اب سنو ایک اور مصیبت نازل ہو گئی ہے۔ خالو جان بیٹھے بٹھاسے بیمار ہو
 گئے ہیں۔ اور مصیبت یہ ہے کہ ہماری کوٹھی ہی میں رہتے ہیں۔ زربہ کے ساتھ مری جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اللہ جانے
 یہ پروگرام کب پورا ہوگا۔ پورا ہوگا بھی یا نہیں (آہ بھر کر) کتنی خوش قسمت ہو تم سب سے الگ ننگ بیٹھی ہو۔
 جمیلہ ، نزہت ! (آہ بھر کر) تمہیں کیا خبر۔۔۔

نزہت ، مجھے سب کچھ خبر ہے۔ زندگی سے سکون اور اطمینان رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ بہن بہن کی نہیں سنتی۔ بس صبح شام یہی رٹ
 لگا رکھی ہے کہ لڑکا نہایت خریف اور ممتی ہے۔ کوئی پوچھے اس سے جا کر ہم کسی کی شرافت کو چاہیں شہد لگا کر۔۔۔ عائشہ
 کا بھائی کتنا اچھا ہے۔ جانتی ہونا۔۔۔ پر تم نے کہاں دیکھا ہوگا۔۔۔ باپ گورنمنٹ کنٹرکٹرز ہے۔ پرسوں کہنے لگے عائشہ کو
 ولایت بھیجنے کا ارادہ ہے۔ کہو تو تمہارے لئے بھی انتظام کر دیں۔ (آہ بھر کر) ولایت۔ مہذب سوسائٹی۔ نئی دنیا
 میں تو ضرور جاؤں گی۔ یہاں کی زندگی سے میری طبیعت سخت بیزار ہو گئی ہے۔
 گونگی آتی ہے۔

گونگی ، جمیلہ سے ٹرے کی طرف اشارہ کر کے، آں۔ آں۔ آں۔
 جمیلہ ، (ہاتھ کے اشارے سے) سے جاؤ۔ میں نہیں پریں گی۔
 گونگی ، (دفنی میں سر ہلاتے ہوئے) جیسے کہہ رہی ہو پر یہی نہیں۔ آں۔ آں،
 جمیلہ ، نہیں بابا (ہاتھ کے اشارے سے) جاؤ۔ نہیں چاہیے چائے (گونگی ٹرے اٹھا کر چلی جاتی ہے)
 نزہت ، یہ بازو کہاں سے پکڑا۔۔۔

جمیلہ ! یہ گونگی — پیاری محتاج ہے۔ چند روز سے ملازم برتی ہے۔ تو میں کہہ رہی تھی اس ثریا —
 نزہت! ارستہ یاد آگیا — جمیلہ! تمہیں یاد ہو گا کچھ پہنے سوٹ، لاکپڑ کس دکان سے خریدا تھا۔ ساری مارا کی کھوم چکی ہوں، غرورہ کپڑا
 نہیں ملا۔ خدا وغیرہ نے یہ بہت پسند کیا ہے۔ سوچتی ہوں ایک سوٹ کا اندازے ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا، دکان — غرورہ
 یاد ہو گی!

جمیلہ! (بچے کی کسی قدر بیزاری، نہیں! مجھے کیا معلوم!)
 نزہت! دے میرے اللہ! تمہیں بھی یاد نہیں رہی۔ اب کیا ہو گا۔ عجیب مصیبت ہے۔
 (دکھ کے باہر سے رارارا — رارارا کی آواز آتی ہے۔ ایس پر ہٹا کر جھانکتی ہے)

ایس! *hello Darling, how do you do*

جمیلہ! خواب ہے مالت!

ایس! کھراب ہے۔ *That's nonsense*۔

جمیلہ! *come in*

ایس! پھرت نہیں۔ *no*

جمیلہ! اچھا

ایس! *o.k.* — رارارا — رارارا — رارارا۔

(ایس چلی جاتی ہے۔ شمیم وہ دوازے پر آتی ہے)

شمیم! — جمیلہ! یہی نے کہا چلو گی باہر خدا!

جمیلہ! نہیں۔ سعادت اچھی نہیں!

شمیم! طبیعت اچھی نہیں۔ *what a wonderful thing* — تو نہیں چلو گی۔ — ہاں کیا حال ہے تمہاری منہ ہڈی
 بہن ثریا کا۔

جمیلہ! بڑی ہوں۔ اس نے جو کچھ کیا ہے۔ اندر آؤ۔ ایک منٹ کے لئے۔ وہ دوازے کیوں کھڑی ہو؟

شمیم! ضرور شہتی اندر آکر گر کیا کروں۔ زبیدہ کنجش نے کچھ پر گرم بنا رکھا ہے۔ میں تو کہتی ہوں تم جی چلو۔ خوب *delicious*
 کریں گے۔

جمیلہ! آج تمہاری ڈیوٹی تو نہیں۔ آؤ گی — باتیں کرنا ہی۔

شمیم! کنجش زبیدہ نے اپنے فریڈ کو بھی بلا رکھا ہے۔ کچھ کے بعد ہوٹل میں جانا ہو گا۔ آؤں گی — پھر۔ فرصت کے وقت!
 اچھا — چیرو۔

(شمیم چلی جاتی ہے۔ گونگی ایک مرتبہ پھر آتی ہے)

گونگی! (جمیلہ کو ایک رقعہ دیتے ہوئے اوپر کی طرف اشارہ کر کے، آں۔ آں۔ آں!)

جمیلہ ، بدھ نے دیا ہے (رقم کھول کر پڑھتی ہے) اچھا۔

نزدہت ، کیا ہے ؟

جمیلہ ، میں نے ہر سے کہا تھا۔ خدا نیچے آکر میرے پاس بیٹھو۔

نزدہت ، تو۔۔۔ !

جمیلہ ، شاپنگ کے لئے جا رہی ہے۔

نزدہت ، میں کہتی ہوں جمیلہ ! یہ زکسیں بڑی خود غرض جوتی ہیں۔ اچھا بھئی۔۔۔ میری اچھی بہن ! خدا حافظہ پر زور دونا۔۔۔ کہاں ہے وہ دکان۔۔۔

جمیلہ ، میں کیا کہوں ؟ خراب عشاء پریشن کر رہی ہوں۔

ضمیمہ ، ہائے تم نہیں جانتیں ، مجھے کتنی پریشانی ہوئی۔ غدا بھی ڈسٹرڈ نے نئی ہرگی۔ تمہیں یاد ہے نا دکاندار کے پاس صرف دو سوئوں کا کپڑا تھا۔ کتنی غلطی کی۔ اسی وقت سارا کپڑا خرید لیتی۔ یہ بات تمہیں بھی نہ سوجھی۔ میرا خیال ہے نیلے گنبد کے اس طرف۔۔۔

جمیلہ ، میں کہتی ہوں کچھ بھی یاد نہیں۔

نزدہت ، کتنا کمزور ہے تمہارا حافظہ۔

(ساتھ کے کمرے میں دیکار ڈبکتا ہے)

امہ شند ، معیبت اکیلی نہیں آتی۔ رضیہ کے سب سے چھوٹے شیطان نے میلا ریڈیوسٹ خراب کر دیا ہے۔ آج رات کہاں

میں ایک بڑا شاندار مشاعرہ ہر مل رہا ہے۔ کیسے سن سکوں گی۔ کیا معیبت ہے۔ یہ رضیہ کی کچی نہ آتی تو کیا اچھا ہوتا۔

(دیکار ڈکے ساتھ تہقہوں کی آواز بھی بلند ہوتی ہے)

جمیلہ ، تو ! (ہیزاری امہ مایوسی کے عالم میں اپنا سر دیوار سے مکا دیتی ہے)

نزدہت ، کیا ہوا ؟

جمیلہ ، کچھ نہیں۔

(پردہ پر وہ ہٹا کر آتی ہے)

پردہ پر ، جمیلہ ! طبیعت کیسی ہے یسٹنا ہے ابھی تک نصیب دشمنان۔۔۔ ہے کچھ ایسی بات۔ میلا مطلب ریکارڈ۔۔۔

جمیلہ ، (ہیزاری سے) نہیں کوئی حرج نہیں۔ یہاں تک تو آواز آتی بھی نہیں۔ (دیوار سے سر ہٹا لیتی ہے)

پردہ پر ، آواز تو آتی ہے۔ میں تو لگانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ ہر ایک فریڈنگٹو ہے۔

جمیلہ ، کوئی بات نہیں۔

نزدہت ، نئے ریکارڈ ہیں۔

پردہ پر ، شوق ہے تو آئیے۔

نزدہت ، اچھا وہ ایک منٹ بیٹھ جاتی ہوں۔ پھر کپڑے کی دکان، ڈسٹرڈ سن ہوگی۔۔۔ اچھا جمیلہ !

جیلہ ، اچھا۔

دن بہت اپنا پرس اٹھا کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ اب کمرے میں جیلہ کے
سوا احد کوئی نہیں۔ ساتھ کے کمرے سے ریکارڈ کی آواز آرہی ہے باہر کے سیڑیوں
اور قہقروں کی جھنکار بھی وقفوں کے بعد آ جاتی ہے۔
جیلہ میٹائی پر لحاظ پھیرتی ہے احد مایوسی کی شدت میں آنکھیں بند کر رہی ہے۔
گڑگی آتی ہے جیلہ کو اس حالت میں دیکھ کر غصہ تک جاتی ہے۔ مڑنے لگتی ہے مگر
پھر رگ جاتی ہے۔ اب شام ہو چکی ہے۔ کمرے کا درجہ نسبتاً روشن ہے۔
جہاں پٹنگ بچا ہے کیونکہ کنٹرولیوں کے باہر میونسپلٹی کا جب روشن ہے۔
گوئی آہستہ آہستہ جیلہ کی طرف آرہی ہے۔ دروازے کے باہر کوئی نرس لگتے
ہوئے گزرتی ہے۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں ، مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
آخری لفظ بندہ مانگ " راراما "۔ راراما میں تدبیر جاتا ہے۔ ساتھ کے کمرے
سے قہقروں کی جھنکار آتی ہے۔ جیلہ پریشان ہو کر اپنی انگلیاں کانوں میں تھوس
لیتی ہے۔ گڑگی دروازہ بند کر دیتی ہے۔ احد جیلہ کی طرف بڑھتی ہے۔ آواز مدغم
ہو جاتی ہے۔ جیلہ آنکھیں کھول دیتی ہے۔ گڑگی کی طرف دیکھتی ہے۔ گڑگی
آنکھیں جھپکاتے خاموش کھڑی رہتی ہے۔

جیلہ ، کیا بات ہے۔ ہر گڑگی نگاہیں جھپکاتے خاموش کھڑی رہتی ہے۔

دروازہ تمہیں نے بند کیا ہے۔ بہت اچھا کیا ہے (مجھے میں مایوسی) یہاں کون آئے گا اب۔ کس کریاں آنے کی فرصت ہے
کوئی نہیں، کوئی نہیں۔ اس وسیع کائنات میں ہر شخص معروف ہے، کسی کو بھی دروازے کا فکھ در دیکھنے کی فرصت نہیں، کوئی محرم
— (واہ بھکر خاموش ہو جاتی ہے) — وقفہ — کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں!
(جیلہ شدت تاثر سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ گڑگی لحاظ بڑھا کر اس کا سر دبانے لگتی ہے)
نہیں! — میرا سر نہ دباؤ — مگر تم —

(جیلہ آنکھیں کھول لیتی ہے احد اس کی طرف دیکھتی ہے)

— تم کیا کر رہے آئی ہو میرے پاس۔ کیا تمہارا کوئی پروگرام نہیں ہے؟ تمہیں اتنی فرصت کیسے مل گئی ہے؟

(دونوں چند لمحے چپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتی رہتی ہیں۔ گڑگی کی نگاہوں میں مدد دی

ہے احد جیلہ کی آنکھوں میں ایک ٹھنڈی سی کیفیت)

میں نے چاہا تھا۔ کتنا چاہا تھا کہ کرنی آئے میرے پائل کبھیٹھے۔ میرے دل میں جھانکے۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بہن کی سی جھدنا

نظروں سے مجھے دیکھئے۔ مگر

شدتِ احساس سے دوبارہ آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ گونگی اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیتی ہے۔ جمید اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ اب آخر تک جمید جو کچھ کہے گی کبھی آہستہ آہستہ کہے گی۔ اور کبھی تیزی سے۔ باہر سے موسیقی کی دھم آواز آتی رہے گی اور وقفوں کے بعد قہقہے بھی)

یہ دنیا کتنی عجیب ہے! — کتنی عجیب ہے!

گونگی اس کے اہل قریب ہو جاتی ہے اور بڑی ہمدردی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

کوئی بھی کسی دکھ درد کو نہیں سمجھتا۔ کوئی بھی دوسرے کی آنکھوں میں نہیں سمجھتا۔ اس وسیع آبادی میں کتنی اجنبیت ہے۔ کتنی بے دردی، کتنی بے رحمی ہے۔ اگر آج کوئی میرے دل کو ٹوٹاتا تو دیکھتا اس کی گڑبڑوں میں کتنا بڑا طوفان مچا ہے۔ کتنی ہلچل مچ رہی ہے۔ (دو تین لمبے خاموشی)

میں اُسے کیسی مدد انگیز کہانی سناتی۔ یہ کہانی کوئی بھی نہ سن سکا۔ کوئی بھی نہیں سن سکا۔ میرا دل پلندہ دہکنے کے لئے کتنا بیقرار تھا۔ کس قدر بے قرار ہے۔ اگر کوئی میرے پاس آتا تو میں کہتی دیکھو! آج انسانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کے دل کس قدر کٹھن ہو گئے ہیں۔ میں نے۔ ثریا کو اپنی بہن سمجھا تھا! میں اس کیلئے اپنی جان بھی خرچ کر دیتی۔ کیونکہ ایک دن اس نے کہا تھا۔ ”بہن! میں تمام عمر تمہاری مہنون ہوں گی۔“ تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ ایک سنی بہن بھی اپنی بہن کے لئے نہیں کر سکتی! (وقفہ)

میں جان گئی۔ یہ ایک بہن کی آواز تھی۔ یہ آواز میری رگ رگ ہنس ہنس میں ٹوٹنے لگی تھی۔ مگر (آواز میں درد) — جیسے آواز بھرا گئی ہے، جاتے جاتے اسے اتنی فرصت بھی دینی کہ مجھ سے مل کر بات کرے۔ اور پھر — پھر (آواز تیز ہو جاتی ہے) اس نے یہ کتنا بڑا غم کیا کہ اپنے نوکر کے ہاتھوں نوٹوں کا ایک بٹل بیک دیا۔ میں آنے سے قاصر ہوں۔ میری طرف سے یہ ناچیز جہیز یہ قبول کر لو۔ (آواز میں درد کی شدت) ہاتھ یہ کہتی ہے درد ہے۔ کیسی دکھ دینے والی بات ہے۔ ایک بہن کے پیارے ایک بہن کے آنسوؤں کی قمیٹ نوٹوں میں ادا کی جاتی ہے۔ ثریا کو کیا ہو گیا تھا۔ طریقے کیا سمجھا تھا۔ ایک برس — صرف ایک برس! جمید کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ گونگی دوپٹے کے دامن سے اس کے آنسو پونپتی ہے)

سگی بہن — سگی بہن ہی ہوتی ہے۔ پڑ گئی بہن — اوہ میرے اللہ ایسا کیوں ہوا۔ ہم دونوں بہنیں تھیں۔ دونوں نے ایک ہی ماں کے آغوش میں پرورش پائی تھی۔ ایک ہی باپ کے بازوؤں میں بھولا بھولا تھا۔ پھر کیا ہوا — شکیلا خوبصورت تھی۔ اور میرے چہرے کی جھلک نے تباہ کر دیا تھا۔ میں بد صورت ہو گئی تھی۔ پر اس میں میرا قصہ تھا۔ اس معصوم زمانے میں میں نے کونسا جرم کیا تھا — پھر اس کی سزا مجھے اتنی شدید کیوں ملی؟ — آخر مجھے کس جرم کی پاماش میں اتنا دکھ اٹھانا پڑا۔

بہن شکیلا کو گود میں اٹھا کر بڑے غم سے اپنے دستوں کے پاس لے جاتے تھے۔ اور میں — کمرے کے اندر ہی پڑی رہتی

تھی۔ اماں مجھے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگتی تھیں۔ میں جانتی تھی یہ محبت نہیں رسم ہے۔ صرت رحم ہے۔ اور میرے سینے میں ایک کانٹا سا چھبنے لگتا تھا۔ اور پھر سکول میں — وہاں بھی شکید کو ڈراموں میں پارٹ دیا جاتا تھا اور مجھے بالکل نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ — !

مجھ پر ہر بات کا — ہر چیز کا اثر چپکے چپکے ہوتا رہتا تھا شکید مغرور ہو گئی تھی اند میں — میرے دل میں حسد کا جذبہ چپ چاپ پوش پڑا تھا !

اند پھر یہ واقعہ ہوا — شکید کے سنے ایک پھوڑیسیوں رشتے والے میرے سنے صرت مل کی ہیں اند باپ کے اندیشے انجام یہ ہوا کہ ہم دونوں بہنیں ذرا فدا سی بات پر ایک دوسرے سے بھڑک پڑیں — اور کئی کئی دن تک گفتگو نہ کرتیں — ہاتے ہمیں کیا ہوتا جا رہا تھا — ہمارے دل میں عداوت کا زہر کیوں بھڑکیا تھا —

(وقف)

میری بد صورتی نے مجھے اندم دتم پر شکست دی اند ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے سے دور ہوتی چلی گئیں — کبھی کبھی تنہائی میں میرا دل بے اختیار چاہتا تھا — کاش ! شکید چپ چاپ جاں آجائے اور میں — اور اند میرے ساری گندگی افسروں کے سیلاب میں بہا کر کہوں — شکید ! ہم بہنیں ہیں — ہماری رگوں میں ایک ہی خون گردش کر رہا ہے — ہم کیوں بیکار کو مصیبت رہتی ہیں — ہم کیوں پائل ہو گئی ہیں — لیکن شکید کے غور سے کچھ تنہائی میں میرے پاس آنے کی اجازت ہی نہ دی — وہ کبھی میرے دل کے دروازے پر دستک نہ دے سکی — ! میں یہ سوچ کر رو پڑتی — اور دیر تک روتی رہتی — شکید کی شادی ہو گئی اند وہ اپنے دولت مند شوہر کے ہمراہ ایران جانے لگی — میں نے چاند آخری بار ہی اپنے دل کی حسرت نکال کر اُسے گلے سے لگا لوں — پر یہ حسرت بھی پوری نہ ہو سکی — !

— شکید چلی گئی اند میں ایک دائم المرض شخص سے بیاہ دی گئی — بھراتا اور اماں — ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ رقت گذرنا گیا — گذرنا چلا گیا۔ میرا شوہر بھی مر گیا — اند مجھے زندہ رہنے کے لئے ہسپتال میں نوکری کرنی پڑی۔ پھر ایک سال اور گذر گیا اند —

(جمید کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں۔ اس کی آواز بھڑا جاتی ہے)

گوئی در پٹے سے اُس کے آنسو پر ٹپکتی ہے۔ اس کی اپنی آنکھیں نم آلود

ہو گئی ہیں)

پھر شکید کا طویل خط آیا۔ اُس نے لکھا تھا — میں مرنے والی ہوں۔ آخری وقت میں میری حسرت یہ ہے کہ تم کو گلے سے لگا کر اپنی بدسلوکیوں کی معافی مانگ لوں۔ میں نے ہمیشہ تم سے بدسلوکی کی ہے — مگر تنہائی میں مجھے ہمیشہ افسوس ہوتا رہا ہے۔ اگر تم کسی دن تنہائی میں میرے پاس آجائیں تو میں ضرور تمہیں گلے لگا لیتی — پر تم مجھ سے دور دور رہیں۔ ہاتے میں سمجھتی رہی تم حاسد ہو اند چاہتی ہو کہ میں بھی تمہاری طرح بد صورت ہو جاؤں — کاش اس وقت تم میرے پاس ہوتیں اور میں تم سے معافی مانگ کر دنیا سے رخصت ہوتی — کاش —

(وقفہ)

یہ مشکبہ کے الفاظ تھے اور ایک دم مجھ پر محسوس ہوا۔ جیسے میری رگ رگ میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا ہے
میرا گہا چاہتا تھا کہ میرے پر ٹپک جائیں اور میں اڑ کر بہن کے پاس پہنچی جاؤں۔ پر —

(وقفہ)

بہن! متغیر نہ کر سکیں — وہ چلی گئی۔ اور میرے دل میں طوفان برپا رہا۔ برپا رہا

(وقفہ)

میرے دل میں کتنی حسرت تھی کہ کوئی بہن بن کر میری زندگی میں داخل ہو — کوئی بہن کہہ کر مجھے پکارے — کوئی
بہن مجھ کو میرا دکھ دے دیکھنے۔ کوئی —

دگر تھی اپنا چہرہ اس کے اور قریب سے آتی ہے۔ دونوں آنسو بھری نگہوں
سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگتی ہیں۔ وہ دگر تھی کا چہرہ بالکل قریب چلا آ جاتا
ہے — آنسوؤں سے اس کے رخسار گیلے ہو گئے ہیں — جمید
جیتاب ہو کر اپنے بازو اس کی گردن میں محائل کر دیتی ہے (

بہن! — میری بہن!

گوئی، آں — آں — م — م — م — ماں!

دستاغ کے کبے سے سازوں کا ریکارڈ بجاتا ہے — دونوں کی
سرسکیوں کی آماد ساز میں ڈوب جاتی ہے (

لہو اور خالین

ڈراموں کا نیا مجموعہ

(ذریعہ ترتیب)

تین روپے آٹھ آنے

چلار روپے — — — صحرائے نور کے رومان

صحرائے نور کے خطوط

دو روپے آٹھ آنے

جنگل

مکمل بارگور۔ لاہور

ڈاکٹر مسعود حسین

دکھ درد کو حیا سے کہو کیا حاصل
 غم اپنا بیاباں سے کہو کیا حاصل
 جس نے کسی انسان کی پرستش ہی نہ کی
 اس بطور کے انسان سے کہو کیا حاصل
 جس سے نہ پڑے گل پاک ہلکی سی پھوار
 اس خندہ خویاں سے کہو کیا حاصل
 شبنم کا مقدر نہ بدل جائے جب
 ان انجم نگراں سے کہو کیا حاصل
 جو چہرہ مفلس کو نہ کر دے گل رنگ
 اس گنبد ایواں سے کہو کیا حاصل
 دل رکھ بھی دیں ہم لوگ پہ سوزن کی مگر
 اس مشکل آساں سے کہو کیا حاصل
 یہ زخم نہ بھرا پائے گا کوئی عبا کہ
 اس نزد ویشیاں سے کہو کیا حاصل

آنکھیں توف سوزاں ہی نہیں گی مسعود
 پھر درد کے درماں سے کہو کیا حاصل

دھڑنگا

ساتی بھی نہیں، اور مجھے بھی نہیں کچھ شوق کے ساماں بدے ہیں
 صد شکر زمانے کی گردش اور شوخ نگاراں بدے ہیں
 رنگوں کی دمک پھلکی پھلکی، پھولوں کی مہک — ہلکی، ہلکی
 کتنے ہی جگر جب خون ہوئے، تب رنگ گلستاں بدے ہیں
 بیل کی کہانی ختم ہوئی، گلیں کافی سا نہ جاری ہے
 نالوں میں نہیں اب شکوہ گل، انداز بہاراں بدے ہیں
 ہم ہوش و خرد کے سوداگر، کیا کھاتے زمانے کی چوڑیاں
 انداز تھا جن کا ناز جنوں، وہ چپاں گریباں بدے ہیں
 راتوں کا مسلسل اندھیا راسا یہ ہے ڈوبے سورج کا
 ہیں جن کے اندھیرے مرگ نظر، ہم نے وہ شبستاں بدے ہیں

مسعودِ دقْرِ لُشی

حالِ دلِ حرفِ حکایت سے بیاں کیا ہوگا
 رازِ دلِ دل سے بھی نہاں ہے عیاں کیا ہوگا
 اب نہ فُتربت ہے کرم اور نہ فُترت ہے ستم
 اور تکمیلِ محبت کا نشان کیا ہوگا
 دل نے بے فیض بہاروں کے ستم جھیلے ہیں
 دل پہ اب اور گراں جو خیزناں کیا ہوگا
 ہر نظرِ نورِ فشاں ہر نفسِ الہامِ ریاں
 یہ ہیں زندانِ معُناں! پیرِ مُغاں کیا ہوگا!

ہر قدمِ سجدۂ مستانہ، نظرِ موجِ شراب
 اور سحرِ صہوگیِ زوگاں کیا ہوگا؟ ۶۶

حافظ لدھیانوی

کہاں سے کے آگئی ہے مجھے گردشِ زمانہ

نہ لوئے دردِ منداں، نہ ادائے دلبرانہ

تھے عجیبِ حشرِ سماں دل پر سکوں کے لئے

مجھے اور یاد آیا تیرے ہجر کا زمانہ

جو دم کے پاساں تھے وہ گدائے میکدہ میں

تھی کمالِ فتنہ پرور وہ نگاہِ کافرانہ

ہری داستانِ غم میں کئی رنگ بھر گیا ہے

تو اندر کیف پرور، تو اندیشیں بہشتا

کہیں بوئے گل نہ ٹھہری کہیں رنگِ گل نہ بکھرا

مجھے چھوڑ کر اکیلے ہوا کارواں روانہ

اسی موجِ بے خودی میں ہمیں کل ملا تھا حافظ

وہی ہر قدمِ پنشنِ ہی رنگِ شاعرانہ

جنید الدین علی

نہ میں بیاضِ سحر ہوں میں سوادِ ششی !
 بس ایک آہ مگر وہ بھی آہِ زیرِ لبی
 چھلک سکا ہے نہ باتکب اشکِ نیم شبی
 اسی میں ہیں ترے سبب دے زیرِ لبی
 سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ رازِ مسلکِ شوق
 کبھی دُعا طلبی ہے کبھی جفا طلبی
 رہے سب ان کی شرابِ نگاہ کے قائل
 کوئی سمجھ نہ سکا میرا رازِ تشنہ لبی
 سخن میں تمکنت و ضبطِ شوق کے احکام
 مگر نظمِ سب میں وہی شوخی و خطا طلبی
 سنا نہیں کبھی غالب کا مانا اے عالی
 یہی ہوا ہے ہمیشہ ہاں خوشِ اقبی

اخلاقیات

پرویز وہی، نسیم کا معیار وہی ہے فرہاد وہی جذبہ ایشاد وہی ہے
 پنخیر ہوں آج بھی ہے حسن کا جادو یوسف کیلئے مصر کا بازار وہی ہے
 سُنتے تھے کہ حالات بدل جائیں گے لیکن بدلتے ہوئے حالات کی رفتار وہی ہے
 تابِ تب احساس کہ موجِ جراتِ اظہار ہر رنگ میں یاں سلسلہ دار وہی ہے
 بے رونقی انجمن ناز کہوں کیا بے رنگی چشمِ لب و رخسار وہی ہے
 ہر گام پر آسودگی شوق کے بدلے کم مانگی حسرتِ دیدار وہی ہے
 کہنے کو بہار آئی مگر اپنے جہنم میں صیاد وہی گوشتِ شمشیر اناہی ہے

اک جنس تجارت ہے ابھی آبروئے زن

غارت گری درہم و دینار وہی ہے

امین راحت چٹائی

مجھے تر و نہیں دفا کے نقوش کیسے نکھر سکیں گے
 فقط بتا دو کہ پرسش غم سے خیم ہستی کے بھر سکیں گے؟
 بزم خود زندگی کی خاطر جو دور رہنے لگے ہیں ہم سے
 اک ایسا بھی آئے گا زمانہ، وہ جی سکیں گے نہ مر سکیں گے
 پک سہے ہیں وہ گل کی جانب، سنگ طے دماغ اپنا
 کہ غارزاروں سے آج کیسے بچا کے امن گذر سکیں گے
 لبوں پہ مہر نہیں لگانے والا سہے قابل غور یہ بھی پہلو
 نگاہیں اپنی کریں گی باتیں، اگر لبوں سے نہ کر سکیں گے
 کہاں کے گوہر یہ سنگ ینے ہی چوم لو، آج تو نشاؤ
 کچھ ایسی گہرائی میں گئے ہیں کہ اب نہ شاید ابھر سکیں گے
 حضور احباب ذکرِ ظلم و تم لو نہی چھڑ گیا بحث، ورنہ
 کیسے خبر تھی نظر ملا کر وہ بات تک بھی نہ کر سکیں گے

کشاکش و حادثات طوفان سے اعمتا و نظر نہ کھونا
 جو ڈوبنا جانتے ہیں راحت وہی سفینے ابھر سکیں گے

انتیاز حبیب ایم اے

انگریزی تعلیم رائج ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد نوجوان لڑکوں کی بینہم یہی حالت تھی۔ جو اسکل امتیاز جبین ایم اے کی ہے — ہر سال کا اسکول لگا کر
یہ توقع لے کر جاتا کہ بی اے کر لینے کے بعد اس کے وارے نیاسے ہو جائیں گے۔ سٹروں کی گفت و دل جانے گی۔ اور صدیوں کی معیتوں کا دوا ہو
جائے گا۔ — والدین محنت مزدوری کر کے — ترسے کر — مکان بیچ بیچ کر لڑکوں کو پڑھاتے۔ مائیں مصیبت کے دن یہ کہہ کہہ کر ماتیں تھیں
اب چند دن کی سختی اور ہے — میرا بیٹا بی اے کر لے — سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور چودہ سال کی محنت کے بعد — لڑو مٹھایاں بٹنے
کے بعد — جب لڑکے دفتر بہ دفتر بوتیاں چماتے پھرتے اور ہر طرف سے جگہ نہیں جگہ نہیں کی گردن سننے — تو دکھ ادا ایسی کے
بیٹا ان پر ٹوٹ پڑتے — چانسز آگے س بارہ برس پہلے کے مقبول رسائل اٹھا کر دیکھے جانیں — تو ان میں اکثریت ان کہانیوں کی ہوگی — جن
کا موضوع اس قسم کی مادی سی اد دکھ ہے — حالات ابھی تبدیل نہیں ہوئے — نچلے متوسط اور متوسط طبقے کے لڑکوں کو تعلیم کے لئے بڑی قوت
کا سامنا کرنا پڑتا ہے — لیکن نامی کے تلخ تجربات نے اس نسل کی توقات کو بڑی طرح متاثر کر رکھا ہے — اور انہوں نے کوہو کے بل کاہ کچھ نہر
مدش بر جان درویش قبول کر لیا ہے۔ کہ پیٹ کاٹ کر پڑھو — پھر سو لیک سو جس کی کلر کی کرو — اور دنیا کو چند اور کلر کندلوں پر کل
کی بجلیاں سو ف کر باغ و تنگ کر اور چور چور کو دنیا سے رخصت ہو جاؤ —

تاریخ اپنے آپ کو دہاتی ہے شاید اسی لئے جو پاپر مقدسین بی اے کو بیٹے پڑے تھے۔ وہ اب اتنا زچیں ایم اے کیل رہی ہے۔ — تعلیم نسلی سے رائج ہونے سے پہلے رٹکیوں کا شور اچھی جیدار بھی نہیں ہونے پاتا تھا۔ کہ انہیں ازدواجی زندگی میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ — شروع شروع میں وہ زیادہ کپڑے پہن کر خوش طہین بیدیں گھر اور بچوں کی صحبت آٹے دال سے حساب میں اس طرح الجھتیں۔ کہ مرتے دم تک انہیں فرصت ہی نہ ملتی۔ کہ وہ ایک نظر خانہ زندگی پر ڈال کر کیا، ادا کیل؟ سے متعلق غور کر سکیں۔ — پھر زمانے کے تقاضے اور مغربی تہذیب کے اثر سے تعلیم خواتین میں بھی مابونے لگی۔ — رٹکیاں کمرے کی چار دیواری سے نکل کر سڑک پہنچیں سکول سے کالج۔

اور کچھ عرصے کے بعد کالج سے ریٹائر ہو گئے۔ اور کوہلو کے اندر سے بیروں کی جگہ آہستہ آہستہ دیکھنے سننے والے با شعور انسان بننے لگے۔
 ————— ہاں تک تو سب کچھ ٹھیک تھا۔۔۔۔۔ عین مشکل یہ اُن پر ہی۔۔۔۔۔ کہ پیل تبدیل ہو گئے۔۔۔۔۔ کہ ہڈیوں کے تان رہے۔۔۔۔۔

عظیم مرثیہ

منظر اول منظر

فلم میں وقت اور فاصلے کا تصور

ابتدائی ادب میں جب ابھی اسے ایک باضابطہ فن کا درجہ میسر نہیں ہوا تھا۔ فلم کی حیثیت محض متحرک عکاسی کی تھی، دودھ آغا کی محقر فلموں سے قطع نظر جو صرف چند ایک مناظر کی عکاسی سے عبارت تھیں۔ اور جنہیں صرف حرکت کا عنصر معیاری سے متاثر کرتا تھا۔ بعد کی فلمیں بھی متحرک عکاسی کی حدود سے نکلنے نہ پڑ سکیں اس لئے کہ ابھی فلم کے وہ مخصوص تکنیکی نصابیے دریافت نہیں ہوئے تھے۔ جن کی بنا پر فلم کو بعد میں ایک منفرد اور باضابطہ فن کی حیثیت ملی اور جو فلم اور تصویریں و جہان قرار ثابت ہوئے اس وقت تک فلم سازی کی نوعیت تعمیر علی پیش کش سے کچھ ایسی مختلف نہ تھی، ڈراموں کو بعینہ اس انداز اور ترتیب سے فلموں میں منتقل کر دیا جاتا تھا جس انداز اور ترتیب سے وہ سیٹیج پر کھیلے جاتے تھے، تعمیر اور فلم کا ذوق اس سے آگے نہ بڑھ پایا تھا۔ کہ تعمیر میں ادکار بذات خود موجود ہوتے تھے اور فلم میں صرف اُن کی تصویریں برقی تھیں بعد ازاں جب ابتدائی مراحل طے ہو جانے پر فلم کے امکانات وسیع تر ہوتے گئے تو اس بات کا احساس بھی کیا جانے لگا کہ فلم نہ صرف حالات و واقعات کی محض عکاسی ہی کر سکتی ہے بلکہ حالات و واقعات کو ایک ایسے مخصوص انداز سے بھی پیش کر سکتی ہے جو سیٹیج پر ممکن نہیں۔

سیٹیج پر ڈرامے کا تسلسل، وقت اور فاصلے سے تعین سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک ادکار کو سیٹیج کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک پہنچنے کے لئے ایک مخصوص وقت میں ایک مخصوص نامہ طے کرنا پڑتا ہے اور یہ وقت اور یہ فاصلہ اصل وقت اور اصل فاصلہ ہوتا ہے۔ جس میں سے کسی درمیانی وقفے کو خواہ وہ ڈرامائی نقطہ نظر سے کتنا ہی غیر ضروری کیوں نہ ہو حذف نہیں کیا جاسکتا، اس میں شک نہیں کہ ڈرامے میں ایسے طویل وقفوں کو حذف کرنے کے لئے ایک اور منظر کی تبدیلی سے کام لیا جاتا ہے جس کی مدد سے ایک منظر سے دوسرے منظر اور بالآخر اس ایک ایکٹ سے دوسرے ایکٹ تک پہنچنے میں تماشائی کو ایک خاص مدت گزر جانے کا احساس دلایا جاتا ہے۔ ڈرامے کے پلاٹ کی تشکیل اور اس کی مختلف ایکٹ اور مناظر پر تقسیم واصل وقت اور فاصلے کے انہی تقاضوں کی بنیاد پر کی جاتی ہے (لیکن ایک ہی منظر کے دوران میں ایسا نہیں کیا جاسکتا، اس کے برعکس فلم میں تدوین کی بدولت واقعات کا وقت اور فاصلے کے فطری تقاضوں کا پابند ہونا ضروری نہیں اور یہ آلودگی فلم میں نہ صرف تکنیکی سہولت ہم پہنچاتی ہے بلکہ اس کی تکنیک کا ایک بنیادی جزو بھی ہے، فلم میں واقعات کے تسلسل کا اختصار اُس ترتیب پر نہیں ہوتا جس ترتیب سے وہ واصل وقوع پذیر ہوں بلکہ اس کا اور مدار فلم کے متعلقہ ٹکڑوں کے انداز ترتیب یا تدوین پر ہوتا ہے۔ اصل واقعہ اور اس کی فلمی صورت میں ایک خاص فرق ہوتا ہے۔ اور یہی فرق فلم کو محض متحرک عکاسی کی بجائے ایک منفرد فنی حیثیت دیتا ہے مثال کے طور پر اگر ایک کردار کو کسی بلند عمارت سے گرتے ہوئے دکھانا مقصود ہو تو اس کی صورت کچھ اس طرح ہوگی۔ پہلے اُس کردار کے عمارت کی چوٹی سے کسی

حال وغیرہ میں گزرنے کا منظر دکھایا جائے گا۔ لیکن اس انداز سے کہ حال نظر نہ آئے اس کے بعد اُسے زمین کی سطح سے کچھ ادا سے گرتے ہوئے دکھایا جائے گا۔ جب یہ دو ٹکڑے یکے کے بعد دیگرے سکریں پر پیش کئے جائیں گے تو تماشائی کو اس بات کا احساس نہیں ہو سکتا پائے گا کہ منظر اصل مادہ کے صرف آغاز اسیا نثری حصے سے عبارت ہے۔ سب ادا یہ کہ یہ مادہ دراصل وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ محض سکریں پر اسیا ہوتے دکھایا گیا ہے عادت ہی پونی ادا زمین کی سطح سے کچھ اوپر کے درمیانی فاصلے کو حدت کر دینے کی تکنیک۔ بہت حد تک وہی ہے جس سے ڈراموں میں ایکٹ سے دوسرے ایکٹ تک پہنچنے میں کئی ایک راز لگو کر جاننا فرما کر دیا جاتا ہے۔

فلم کی اس مخصوص تکنیک سے جسے فنی اصطلاح میں تدوین کہتے ہیں واقعات اصل وقت اور فاصلے کے اصول کے پابند نہیں رہتے۔ بلکہ اس سے دور تار اور فاصلے کا ایک علیحدہ تصور وجود میں آتا ہے جسے فنی وقت اور فنی فاصلہ کہنا چاہئے، عبارت سے گزرنے کی جوتالی دی گئی ہے۔ اُس سے ظاہر ہے کہ سکریں پر اس واقعے کے وقوع پذیر ہونے کا حرمہ یقیناً وہ نہیں ہو سکتا جو اسے حقیقت میں آنے سے دور کر دے۔ اسی طرح سکریں پر حادثے میں جو فاصلے ہوتے ہوئے دکھایا جائے گا وہ یقیناً اتنا نہیں ہوگا۔ راز کی پونی سے زمین کی سطح تک شامل ہے۔

ایک اور مثال سے شاید یہ فرق واضح تر ہو سکے، فرض کریں ایک منظر میں ایک شخص کو باہر کھڑکی سے کہیں سے کسی کو گولی مارنے اور دوسرے منظر میں ذمہ کو فرش پر گرتے اور قہر سے بے قابو رہنا نظر آئے۔ یہاں تو فنی سے نظریے ہوئے دکھایا جاتا ہے، اب یہ تینوں منظر مختلف مقامات پر جی لئے ہو سکتے ہیں لیکن سکریں پر ان کے یکے بعد دیگرے نمودار ہونے سے مقامات کا اختلاف ظاہر نہیں ہونے پائے گا۔ باوجود اس کے کہ تماشائی کے نزدیک اس مقام پر یہ واقعہ پیش آئے گا۔ اُس خاص مقام کا مجموعی موت میں سکریں سے قطع نظر کوئی وجود نہیں ہوگا، اسی طرح یہ فنی واقعہ اصل واقعہ کی بجائے صرف اس کے اہم ترین اصول کی فلم بندی سے عبارت ہے جس میں سے کچھ حصے اور ان کی درمیانی مدت کو اس انداز سے حدت کر دیا گیا ہو گا کہ تماشائی کو اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔

فنی وقت اور فنی فاصلے کا اصل وقت اور اصل فاصلے سے یہ اختلاف فلم کی ایک بنیادی خصوصیت ہے جو فلم ساز کو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تاثر پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے، صرف مکالمات کی ادائیگی کا دوران ہی ایسا مرحلہ ہے جہاں اس تکنیکی سہولت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اس لئے کہ گفتگو کا عرصہ فلم میں بھی وہی رہے گا جو حقیقت ہوتا ہے، دوران مکالمہ میں فہم "قیدیں" سے آزاد نہیں ہو سکتی۔

برما میں ادب لطیف

مندرجہ ذیل بکسٹال سے حاصل کریں

اعلیٰ بک ڈپو۔ نمبر ۲۴۲ - بازار نمبر ۳۹ - پوسٹ بکس ۱۲۲۲

رنگون (برما)

جائزے

خج کا کل ۔ مصنف سیف الدین سیف ۔ کتابت و طباعت ، ہایت خوبصورت ، قیمت چار روپے ۔ ناشر و مکتبہ کاروان لاہور
 زندگی برکت و برکت ہر گھنٹہ میں ہوتی ہے ، اسے دیکھنے کے مختلف زاویے ہیں ، ہر شخص اپنے مقام سے دیکھتا ہے ، انکس سب کی اپنی
 اپنی ہیں ، ہر شخص زندگی کے ہر سلسلے پر نہیں سوچتا ، ہر بات ہر شخص پر عیاں بھی نہیں ، قطعاً میں سب کو سب لہجہ جو میں ہر کسی کو کل بوجھ دیکھائی نہیں دیتا
 اگر سنگ میں نقص پتھر آدھی ہم نہیں دیکھ سکتے ، غائب دیکھتا ہے اور ہمیں دکھاتا ہے ، ہم اُس کے دیکھے ہوئے یا دکھائے ہوئے کو دیکھتے ہیں ،
 غائب نے جو کہا تھا کہ "کھیل چوں کا ہوا دیدہ بینا ہو" تو یہ بھی اسی بات کے ایک پہلو کی طرف اشارہ ہے (احباب کہنے کا یہ انداز بھی غائب کا اپنا
 انداز ہے ، ابا ورنہ یوں نہ ہوتا کہ غائب کسی سے متنازع ہوا نہ کوئی اس سے الگ اور مختلف ہو ،

[illegible]

یہ کہنے کو کوئی میر یا حافظ کے ایک شعر کے تحت آئینِ شان کا نظریہ انسانیت اور کامل مائوس کا تمام داس کپٹلی بھی نکیر کے رکھ دے کوئی اُسے کیا کہہ سکتا ہے، لیکن زیادتی بہ حودت زیادتی ہے میر حافظ بچا سوں نے آئینِ شان اور کارل مارکس کا نام کب سنا ہو گا۔ فرایڈ اور مغاب ورنل عظیم انسان ہیں، مغاب بھی خواب اور خیال کا ذکر کرتا ہے اور فرایڈ بھی *illusions* اور جنت اور دوزخ کے تصور پر خیال آرائی کرتا ہے لیکن مغاب اور فرایڈ وراٹک الگ شخصیتیں ہیں۔

سیت ایک غزل گو شاعر ہے اور بڑے خلوص سے بڑی محبت سے غزل کہتا ہے، اگر کوئی اس میں اندیشہ داسے وہ دماغ و صورت پر
 شروع کر دے گا۔ تو غزل ختم ہو جائیگی، شعر مر جائیگا، اور۔۔۔ اندیشہ بھی باقی نہ رہے گا، بھول سائیں کی تجربہ گاہوں اور شہر کی پر شور گھوڑیوں میں جا کر نہ رہیں
 وہ سکتا اس لئے کہ وہ ان کی چیز نہیں! وہ جو کچھ ہے، جیسا ہے اپنی شاخ پر ہے!! اپنی نقائیں ہے۔

الغالبہ وہ شکر بھی یہی کہتا ہے

و مہجیاں دیکھ کے ہنستے ہیں گریبان زندگی

میں ان اچھے بھلے غزل کے اشعار کو کسی ملک کے معاشی، اقتصادی اور عمومی مسائل کا آئینہ نہیں کہہ سکتا، اور نہ کبھی یہ سوچتا ہوں کہ سیف نے کسی پبلک ہسپتال میں ریمیوں کی پیمائش اور ڈاکٹر کی پیرغی اور بیہوشی دیکھ کر یہ شعر کہے ہوں گے، کیونکہ اس طرح "غزل" منافع ہو جائے گی۔

’علم کامل‘ سیف کی غزل کا محسوس ہے۔ اس کی ہر غزل کو غزل کی طرت دیکھنا چاہیے۔ اس میں اچھی، اچھی غزلیں ہیں، اور تقریباً ہر غزل میں اکثر اشارے رکھے ہیں۔ اس میں چند قطعے نظمیں اور گیت بھی شامل ہیں، لیکن ان میں بھی غزل زیادہ ہے۔ اس نے کہ سیف بنادی عہد پاک غزل گو ہے۔۔۔ میں، حکمت، سائنس یا فلسفہ کا طالب علم ہرگز نہیں اور نہ ہی وہ صحتِ حاضرہ پر اُغلا۔۔۔ اس کے کلام یا محاسنات پر کتابیں لکھتا ہے۔ (سیف یعنی ترمذی)

پانی کا درخت ————— مصنف : کرشن چندر - کتابت و طباعت : عمرہ - قیمت : تین روپے - ناشر : پائین پبلیکیشن ہاؤس لاہور

برصغیر کی تقسیم کے بعد کرشن چندر کے افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو پاکستان میں شائع ہوا ہے یعنی نقادوں کا خیال ہے کہ کرشن چندر آج کل جو کچھ لکھ رہے ہیں ان میں انسانی فکر کی خصوصیات برقرار نہیں رہ سکیں اور یہ افسانوں کی بجائے سبائے معذین جو گھر رہ گئے ہیں۔ یہ بات بالکل غلط نہیں ہے تاہم اس موے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان دوستی کا وہ شدید جذبہ جو کرشن چندر کی ہر تخلیق میں دواں دواں ہے اور انداز بیان کی وہ روانی اور سادگی جس سے کرشن چندر کی کوئی ذہنی کاوش محروم نہیں رہتی۔ یہ دونوں چیزیں میاں میں موجود ہیں اور پڑھنے والے کو یہ یلگہ اس کا احساس دیتا ہے کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے اسی کے پس منظر میں ایک بہت وسیع ’انٹون‘ سے بھی محبت کرنے والا اور رنگ و نسل سے بے نیاز مگر ہر انسان کے لئے ترپنے والا دل پر ہی قدرت کے ساتھ دھڑک رہا ہے۔ کرشن چندر کی یہ خصوصیت انکی تخلیقات کی سب سے بڑی اور سب سے نمایاں خصوصیت ہے اور اس خصوصیت کی بنا پر وہ دوسروں سے بالکل الگ نظر آتے ہیں اور مجھے میں ایک مضمون میں ہے مرحوم ایکٹر شام کے متعلق۔ اسی ایکٹر کے متعلق معاذت ہم جنٹو کا بھی ایک مضمون شائع ہو چکا ہے۔ دونوں مضمونوں کا مطالعہ دونوں فنکاروں کے دو مختلف راویہ نگار واضح کرتا ہے۔ کرشن چندر کا شام۔۔۔ خلیق اور انسان دوست ایکٹر ہے۔ کرشن چندر کا مجرب کردار۔ مڈمنٹو کا شام خلیق ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے اور یہی بہت کچھ مڈمنٹو کی ’فنی تنگ دو‘ کا محور ہے۔ کرشن چندر کے ہاں جو شخص شام کا روپ دھارتا ہے وہ محض ہنسنے والا دوستوں سے محبت کرنے والا کتابیں پڑھنے والا شادی کے معاملے میں بغاوت کرنے والا اور ترقی پسند قتل میں دلچسپی لینے والا نوجوان ہے۔ اس کے برعکس مڈمنٹو جس شام کے کردار کا ایک ایسا نوجوان ہے جس کی محبت کو کہیں بھی قرار نہیں سوجھ سکے بعد میں گھر سے محبت کئے جاتا ہے۔ لڑکیاں ایک ایک کر کے اس کی زندگی میں داخل ہوتی ہیں اور پھر ایک دن سب کی سب غائب ہو جاتی ہیں۔ ابر حال دونوں مضمونوں کا مطالعہ دلچسپی کا کافی سامان اپنے پیلوں لئے ہوئے ہے ! (۳-۱)

بڑھا گوریو ————— مصنف : اندرے مالزاک - مترجم : ستیہ نسیہ ہدانی - کتابت و طباعت : عمرہ - صفحات : ۲۲۲ - قیمت : ناشر : مکتبہ جدید لاہور

مکتبہ جدید دنیا کے عظیم ناول کا اردو ترجمہ شائع کر کے ایک بڑا قابلِ قدر کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ یہ ناول ’بڑھا گوریو‘ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مالزاک کے بارے میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسکی تحفہ ذاتیں انیسویں صدی کا دوال آٹھ فرانسیسی معاشرہ اس طرح سانس لے رہا ہے کہ اس سانس کی پوری تصویر ہلکا آنکھوں کیلئے آجاتی ہے چنانچہ اس ناول کے تمام کردار جو فرانسیسی اور زندگی کی ان قدروں کی نمائندگی کر رہے ہیں جو مالزاک کے فرانس کی روح و سماں بن گئی تھیں۔ یہ ناول پڑھ کر میں بے اختیار شکسپیر کے الیزہ بارشاہ کیڑا کا خیال آجاتا ہے۔ ڈیڑھ مہینوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور پے درپے صدمات اٹھا کر انتہائی حسرت یا اس کے عالم میں نیلے سے رخصت ہو جاتا ہے۔ حالانکہ بڑھا گوریو کا بھی ہے۔ شخص تمام عمر اپنی دونوں بیٹیوں کیلئے اپنا سر کھڑا کرتا رہا ہے اور جب مرنے لگتا ہے تو اس پر سی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اسکی دونوں بیٹیاں دم واپس ہیں جس کے پاس نہیں نہیں تھیں اور بندھن بڑھا سخت حسرت کی حالت میں مر جاتا ہے۔ انیسویں صدی کا فرانسیسی معاشرہ زندگی کی سچی صورت سے کتنے محروم، کس طرح کھوکھلا اور انسانیت کی بنیادی قدروں سے کتنا دور ہو چکا تھا۔ یہ ناول اسکی واضح مثال ہے۔ ترجمہ بہت کایا ہے۔ یہ نسیہ ہدانی نے کتاب کی اصل فضا کو بڑی خوبی سے برقرار رکھا ہے تمام اوصاف و مقامات بھی اس جو اصل ناول میں موجود ہیں کاشی ہلے دوسرے مترجم بھی اس چیز کو مد نظر رکھا کریں کہ ناموں اور مقاموں کے بدل دینے سے کتاب کی صحیح فضا جو رہ جاتی ہے اور یہ مترجم کی عمر سی ہے۔ (۳-۱)

بچوں کے لئے

(سکولوں کے لئے منظور شدہ کتابیں)

پنجاب ایڈوائزری بورڈ نے پنجاب بک ڈپو کی مندرجہ ذیل مضامعات کو بہ مطابقت سرکرنمبر ۱۷۷۰/۵ مورخہ ۱۹ جولائی ۱۹۵۱ء منظور کر دیا ہے۔ ذیل کی کتابیں کے متعلق پنجاب ایڈوائزری بورڈ نے ان الفاظ میں پُر زور سفارش کی ہے :

"یہ کتابیں آسان اور با محاورہ زبان میں لکھی گئی ہیں۔ طلبہ کے لئے ان میں مفید اور دلچسپ مواد فراہم کر دیا گیا ہے۔"

پائی آنے	پائی آنے
سیاح احمد کے حالات	سید شریف حسین
خالد بن ولید	شاہد حمید
صلاح الدین ایبکی	شاہد حمید
اتاق	سعید چودھری
سلطان شیبو	عشرت رحمانی
طارق بن زیاد	عبدالرحمن خورشید
سعد زامل پاشا	عبدالسلام خورشید
معلومات دنیا	لطیف فاروقی
جادو کی لطیف	عبدالحمید بھٹی
جادو کی چکی	راجہ مہدی علی خاں
سنہری پرنس	عبدالحمید بھٹی
یونان کا بادشاہ	سید شریف حسین
تین بنیں	عبدالحمید بھٹی
بصرے کا سوداگر	سید شریف حسین
چچا چنگو	عشرت رحمانی
چالاک بات	راجہ مہدی علی خاں
ایک مسافر	میرزا ادیب
منظور شدہ ڈائریکٹر تعلیم پنجاب بموجب سرکرنمبر ۱۷۷۰/۵ مورخہ ۱۹ جولائی ۱۹۵۱ء	
اخلاقی نظمیں	
سبق آموز کہانیاں	
اخلاقی کہانیاں	شیر محمد اختر
بلا دیچے	شیر محمد اختر
منظور شدہ ڈائریکٹر تعلیم پنجاب بموجب سرکرنمبر ۱۷۷۰/۵ مورخہ ۱۹ جولائی ۱۹۵۱ء	
نیکی کا پھل	منشی فضل الدین خاں
آج کل	منشی فضل الدین خاں
طوطوں کی پکار	منشی فضل الدین خاں
مٹی کے کھلونے	عبدالحمید بھٹی
تب تم اچھی بچی ہو	عبدالحمید بھٹی
غریب طالب علم	منشی فضل الدین خاں

پنجاب بک ڈپو لاہور

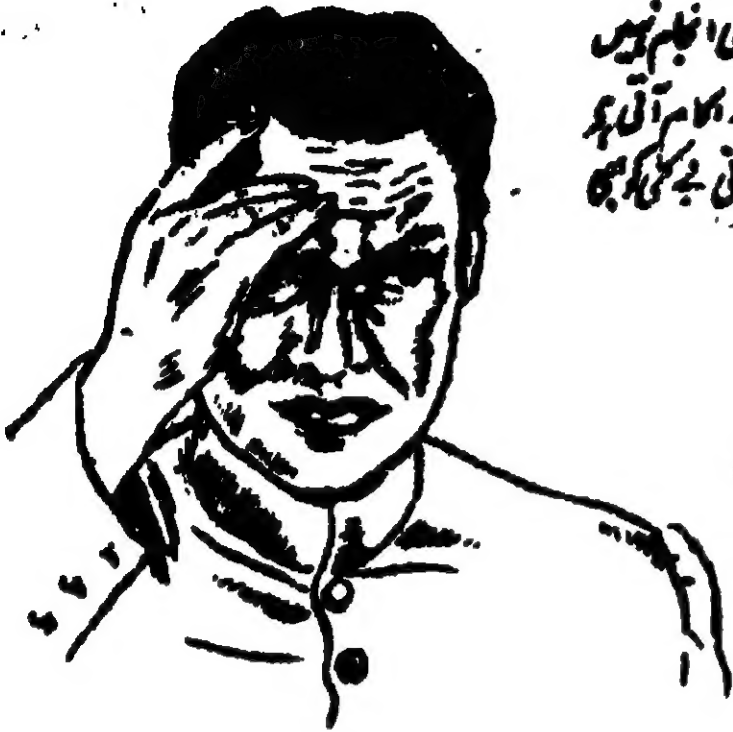
ہفت روزہ سات رنگ کا نیا دور

زیرِ ادارت ————— منیر نیازی، منظور ممتاز

- * — جو ۱۹۵۰ء سے نشگمری سے نکلتا رہا ہے۔
- جواب نشگمری کی بجائے لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔
- * — جسے ہرنے اور پُرانے لکھنے والے کا تعاون حاصل ہے۔
- * — جو ادب اور سیاست میں سنگِ میل ہوگا۔
- * — جو آپ کو دوسرے ہفتہ وار رسالوں سے بے نیاز کر دیگا۔
- * — جس کے مستقل کالم "اس پاس" "پاک لینڈ یارڈ" اور "تراشے"
- اردو ادب میں خاص حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔
- ملنے کا پتہ۔ دفتر سات رنگ، ۴۴۷ جی مال لاہور

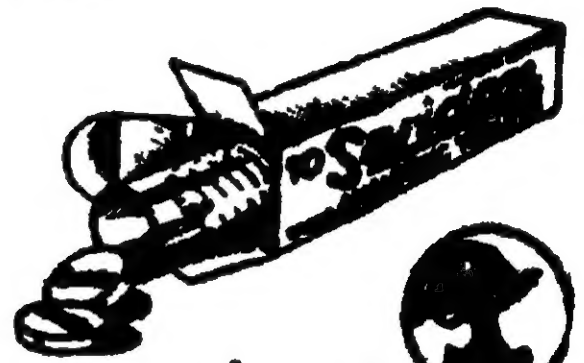
سرکادرد

درد سر کی شدت آدمی کو اٹالیے مل کر دیتی ہے کہ دوسرے فرد ہی کا سر کو بھی انجان نہیں رہے سکتا۔ اچھے موقع پر سوزیز دینے کی شہو آفاق دوا سیرڈیون بڑا کام آتی ہے اس کے استعمال سے نہ صرف سر کا درد اور دانتوں کی کھیف جگہ ہر قسم کی جسمانی بے کراہی فوراً نکالیں جاتی ہے۔



سیرڈیون

سیرڈیون بڑا فرسہ، اس ٹیبلٹ کی خوبصورت شیشی میں آتی ہے کسی بھی اچھے اسٹور یا دوا فروش سے آج ہی خرید لیجئے اور ایک شیشی ہر وقت اپنے پاس رکھیے۔



تیار کردہ: روش

میں گئے تھے

ابھی تک یہ کتابیں نہ پڑھی ہوں

ڈربے ، اے حمید ، ۴ روپے

نئی پود ، تورگنیف ، تین روپے ۸ آنے

★

افسانہ :

بادشاہت کا خاتمہ ، سعادت حسن منٹو ۳ روپے

تیسرا آدمی ، شرکت صدیقی ۳ روپے

خزاں کا گیت ، اے حمید ۳ روپے ۸ آنے

تنقید :

بوش ونظر ، ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالات ۵ روپے

تنقیدی زاویے ، ڈاکٹر عبادت بریلوں کے مقالات ۴ روپے

★

ناول :

ٹیرھی لکیر ، عصمت چغتائی ، ۵ روپے ۸ آنے

جھیل اور کنول ، اے حمید ، ۴ روپے

مکتبہ اردو لاہور

(چودھری افتخار علی پٹر پبلشر نے اردو پریس ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر مکتبہ اردو کے شائع کیا)

